آزادی کے متوالے

اقبال کاظمی

دیباچہ

دہلی کی تہاڑ جیل سے فرار ہونے والے اُن سربکف مجاہدوں کی لہو رنگ داستان، جنہوں نے دشمن کی سرزمین، خصوصاً دہلی میں بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کو قدم قدم پر شکست فاش دیتے ہوئے دشمن پر کاری ضربیں لگائیں۔

ملک دشمن عناصر نے اُن کا جذبہ جہاد سرد کرنے کی سرتوڑ کوششیں کیں مگر آزادی کے ان متوالوں نے جذبہ ایمانی، وطن پرستی، قومی غیرت وحمیت کے بل پر آگ اور دُھوئیں کے سمندروں کو پار کر کے جس طرح دادِ شجاعت دی، وہ ہماری قومی وملی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

افرادی قوت اور اسلحے کی کمی کے باوجود ان سربکف مجاہدین نے دشمن کے ناپاک منصوبوں کو اپنی خداداد صلاحیت سے ہمیشہ ناکام بنایا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی گزارنا ان کے دل دھلا دینے والے معرکوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنف اقبال کاظمی نے جس طرح موضوع سے انصاف کیا ہے، یہ اُنہی کا حصہ ہوسکتا ہے یہ اُن کے زرخیز قلم کا کمال ہے کہ قاری کسی ایک جگہ پر آنکھ جھپکنا بھی پسند نہیں کرے گا، اور تحریر کی دلچسپ روانی کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جائے گا۔

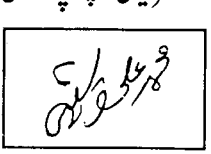

دہلی شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تہاڑ نامی وہ چھوٹا سا قصبہ اُس جیل کے دم سے آباد ہے، جس کی سنگین اُونچی دیواروں کے پیچھے قیدیوں کی طرح ہزاروں ایسی داستانیں بھی محبوس ہیں جن کا ایک ایک لفظ انسانیت کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ وقت کے بے زبان ہیولے نے ان اُونچی دیواروں کے اندر انسانیت کو سسکتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہزاروں بے گناہوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑتے ہوئے دیکھ کر بے زبان وقت بھی اپنی آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں انسان نے انسان پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے، بے گناہ قیدیوں پر تشدد کے ایسے ایسے حربے استعمال کئے کہ اُن متشدد قیدیوں کی طرح وقت کے پر بھی پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

اُونچی دیواروں والی اس جیل کی تاریخ کے بارے میں تو معلوم ہے کہ یہ کب اور کیسے وجود میں آئی۔ لیکن تہاڑ نامی اس قصبے کے بارے میں کچھ کہنا ذرا مشکل ہے۔ صدیوں پہلے یہ ایک چھوٹی سی بستی ہوا کرتی تھی۔ چند کچے مکانات اور گھاس پھونس کے جھونپڑے جن کے چاروں طرف دُور دُور تک ویرانہ تھا۔ پھر یوں ہوا کہ دہلی کے حکام نے خطرناک قیدیوں کے لئے ایک الگ اور مضبوط جیل کی ضرورت محسوس کی۔ ایک ایسی جیل جہاں سے قیدی فرار نہ ہو سکیں۔ اس کے لئے دہلی شہر سے چند میل دُور ویرانے میں جھونپڑیوں اور کچے مکانوں پر مشتمل تہاڑ نامی اس چھوٹی سی بستی کا انتخاب کیا گیا۔

پہلے یہ جیل بہت چھوٹی سی تھی۔ یہاں صرف چند انتہائی خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خطرناک قیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندوستان میں فرنگی سرکار کی پالیسیاں جنتا کو سرکار کے خلاف اُبھارنے پر مجبور کرنے لگیں۔ ہند میں فرنگیوں کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ سیاسی شورشوں کے ساتھ سنگین نوعیت کے جرائم میں بھی بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ بعض علاقوں پر تو عملاً قاتلوں اور ڈاکوؤں کا راج تھا۔ انگریز سرکار اُن سے نبرد آزما تھی۔ جرائم کے حوالے سے دہلی کی صورتِ حال سب سے ابتر تھی۔ پکڑے جانے والے خطرناک مجرموں کو لمبی سزا بھگتنے کے لئے تہاڑ جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ تہاڑ جیل کو تنگی داماں کی شکایت رہنے لگی اور اسی

شکایت کے ازالے کے لئے جیل کی دیواریں بھی وقتاً فوقتاً وسعت اختیار کرتی گئیں۔

دہلی کی تہاڑ جیل نے بہت جلد عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ دہلی شہر میں لال قلعہ اور اس کے نواح میں ابراہیم لودھی اور ہمایوں کے مقابر کے بعد اگر کسی مشہور عمارت کا نام آتا ہے تو وہ تہاڑ جیل ہے۔ لال قلعہ، لودھی کا مقبرہ اور شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کے پس منظر میں تو مغلیہ دور کے جاہ و جلال اور عظمت کی داستانیں موجود ہیں۔ لیکن تہاڑ جیل کی تاریخ ظلم و جبر، تشدد و بربریت انسانیت سوز اور رُوح فرسا داستانوں سے رقم ہے۔ وقت نے اس جیل میں بڑے بڑے سورماؤں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے دیکھا ہے۔ ان میں وہ سیاستدان بھی ہیں جنہوں نے حکومت وقت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ قاتل اور ڈاکو بھی ہیں جنہوں نے انسانی خون سے ہولی کھیلی، لاشوں پر قہقہے لگائے۔ وہ لوگ بھی اس جیل میں دم توڑتے دیکھے گئے جو بے گناہ تھے اور کسی ناکردہ جرم میں پکڑے گئے۔ عالمگیر شہرت رکھنے والا اس صدی کا سفاک ترین قاتل چارلس سوبھراج آج بھی اس جیل کی دیواروں کے پیچھے بند زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہے جس نے اپنی شناخت منوانے کے لئے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہزاروں بے گناہ انسانوں کو بے دردی سے موت کی نیند سلا دیا۔ یہاں وہ جیالے سکھ اور کشمیری بھی تھے جنہوں نے بھارت کی غلامی کا طوق اُتار پھینکا اور آزادی کا پرچم بلند کئے سر سے کفن باندھے ''آتش نمرود'' میں کود گئے۔

تہاڑ جیل کی آہنی سلاخوں اور سنگین دیواروں کے پیچھے موت کو گلے لگانے والوں میں بہت سے ایسے جیالے بھی شامل ہیں جنہوں نے بھارتی سرکار سے اپنا حق مانگا تھا۔ آزادی سے زندہ رہنے کا حق۔ تہاڑ جیل کی دیواریں آج بھی کشمیری حریت پسند لیڈر مقبول بٹ کے خون کے چھینٹوں سے داغدار ہیں جسے آزادی مانگنے کے جرم میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا تھا۔

کشمیری حریت پسند لیڈر مقبول بٹ کو پھانسی دینے جانے کے وقت تہاڑ جیل میں بہت کڑے حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے۔ سکیورٹی فورس میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ جیل کے ہر بلاک میں لاتعداد باوردی محافظوں کے علاوہ سکیورٹی کے افراد بڑی تعداد میں قیدیوں کے بھیس میں بھی جیل کے ہر حصے میں موجود تھے۔ اُن قیدیوں پر خاص طور سے نگاہ رکھی جا رہی تھی جن کا تعلق کشمیر سے تھا یا مسلمان تھے۔ حکام کو اندیشہ تھا کہ مقبول بٹ کو پھانسی دیئے جانے پر جیل میں ہنگامہ نہ ہو جائے۔

مقبول بٹ کی پھانسی پر وادی کشمیر میں ہندو راج کے خلاف حریت پسندوں کی جدوجہد تیز ہو گئی۔ دہلی میں بھی کشمیری باشندوں نے ہندو راج کے خلاف مظاہرے کئے۔ لیکن تہاڑ جیل میں

بھی کچھ نہ ہوا۔ نہ کوئی مظاہرہ، نہ کوئی ہنگامہ۔ اس جیل میں اگرچہ چند ایسے کشمیری مسلمان قیدی بھی موجود تھے جنہیں اس الزام میں سلاخوں کے پیچھے بند کیا گیا تھا کہ اُن کا تعلق کشمیریوں کی ایک حریت پسند تحریک سے تھا۔ لبریشن فرنٹ سے وابستہ ہونا ہی اُن کا سنگین جرم تھا۔ اور وہ اپنے اس جرم کی سزا اس بدنام زمانہ تہاڑ جیل میں بھگت رہے تھے۔

سلیم کشمیری اور طارق سعید اس وقت بھی تہاڑ جیل میں موجود تھے جب مقبول بٹ کو یہاں لایا گیا تھا۔ اور وہ اُس وقت بھی جیل ہی میں تھے جب مقبول بٹ کو پھانسی دی گئی تھی۔ اس دوران اُن دونوں میں سے کسی نے بھی مقبول بٹ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر کوئی کوشش کی بھی جاتی تو کامیابی نہ ہوتی۔ کیونکہ مقبول بٹ کو جیل کے ایک ایسے حصے میں رکھا گیا تھا جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ بڑے سخت حفاظتی انتظامات تھے جیل کے اس حصے میں۔ اور جب مقبول بٹ کو تختہ دار پر لٹکایا گیا تو بھی اُنہوں نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ اُن کے خلاف مزید الزامات عائد کر کے اُن کی سزا میں اضافہ کر دیا جاتا۔

سلیم کشمیری اور طارق سعید کو تہاڑ جیل میں آئے ہوئے چار سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اُن دونوں کی پہلی ملاقات جموں میں ہوئی تھی۔ سلیم کا تعلق بھارت کے زیر تسلط وادی کشمیر کے ایک قصبے پہل گام سے تھا۔ جبکہ طارق سعید آزاد کشمیر کے قصبے باغ کا رہنے والا تھا۔ وہ دونوں نوجوان تھے اور ہر کشمیری نوجوان کی طرح وہ بھی وادی کشمیر کو غاصب ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ وہ آزاد وطن کی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے اور یہ مشترکہ مقصد ہی اُنہیں ایک جگہ لے آیا تھا۔ لبریشن فرنٹ میں شامل ہونے کے بعد اُونچے پہاڑوں میں واقع ایک چھوٹے سے تربیتی کیمپ میں اُن دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا، لیکن باقاعدہ تعارف حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ تربیتی کیمپ ختم ہونے کے تقریباً دو ماہ بعد طارق سعید کو اطلاع ملی کہ اُسے لبریشن کی طرف سے ایک نہایت اہم مشن کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے۔ اُسے مشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ لیکن مقررہ تاریخ تک جموں کے قریب ایک خفیہ مقام پر پہنچنے کا حکم دے دیا گیا۔

اُن دنوں کشمیری حریت پرستوں کی مختلف تحریکیں ہندو سامراج کے خلاف بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہی تھیں جس کی وجہ سے آزاد کشمیر سے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونا خاصا مشکل کام تھا۔ لیکن طارق سعید کسی نہ کسی طرح جموں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر جموں شہر سے چند میل دُور پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی بستی تک پہنچنے میں بھی اُسے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی

تھی۔ اُس کا میزبان ایک بوڑھا چرواہا تھا جس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ طارق سعید کے اندازے کے مطابق اُس کی عمر پچھتر کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔ لیکن مصافحہ کرتے ہوئے طارق نے اُس میں جوانوں جیسی طاقت کا احساس کیا تھا۔ اُس کا لباس بوسیدہ اور چہرے پر حسرت تھی۔ لیکن آنکھوں سے ایک عزم جھلکتا تھا۔

طارق سعید کی حالت بھی خستہ حال تھی۔ پھٹا ہوا لباس، ٹوٹے ہوئے جوتے اور افلاس زدہ چہرہ دیکھ کر اُس کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُس کی حالت اُن کشمیری مسلمانوں سے مختلف نہیں تھی جو غربت و افلاس کی چکی میں پس رہے تھے۔ وادی میں تمام وسائل پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور دولت و طاقت کے بل بوتے پر ہی وہ اُن افلاس زدہ مسلمانوں پر مسلط تھے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے خبر تھے کہ ان فاقہ زدہ چہروں پر چمکتی ہوئی آنکھوں کے پیچھے جو طوفان مچل رہے ہیں، وہ اُنہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گے۔

وہ بوڑھا چرواہا، شیراز تھا۔ اُس نے بڑی گرمجوشی سے طارق سعید کو خوش آمدید کہا۔ یہ بستی صرف سات گھروں پر مشتمل تھی۔ سب کے سب مسلمان تھے اور اُن کی گزر اوقات مویشیوں کی پرورش پر تھی۔ طارق سعید کی آمد پر بستی کے کسی آدمی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی بوڑھے شیراز سے کسی نے اُس کے بارے میں پوچھا۔

طارق سعید میلوں پیدل چلا تھا۔ جب وہ بستی میں پہنچا تو شام ہونے کو تھی۔ کچھ ہی دیر بعد چراغ روشن ہو گئے۔ طارق سعید کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد گہری نیند سو گیا۔ اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ رات بھر بے خبر سویا رہا تھا۔

''شکر ہے تم جاگ گئے۔ میں تو سمجھی تھی کہ شاید اب تم کبھی نہ اُٹھ سکو گے۔'' طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے کانوں کے قریب جلترنگ بج اُٹھے ہوں۔ بڑی سریلی آواز تھی۔ اُس نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر دیکھا اور پھر پلک جھپکنا بھول گیا تھا۔ اُس لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔ سیب کی طرح سرخ رُخسار، ہرنی جیسی چمک دار بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گلاب کی پتیوں جیسے نازک اور پتلے پتلے ہونٹ اور انگڑائیاں لیتا ہوا شباب.....!

''کون ہو تم.....اور شیراز بابا کہاں ہیں؟'' طارق نے پوچھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی کے مسحور کن حسن نے اُسے بے حد متاثر کیا تھا۔

''میں روشا ہوں.....شیراز بابا کی پوتی۔ سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے۔ اُٹھو! میں تمہارے لئے ناشتہ لے کر آئی ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''میں نے پوچھا تھا، شیراز بابا کہاں ہیں؟'' طارق نے کہا۔

''بابا مویشی لے کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ میں تمہارا خیال رکھوں۔ اب اُٹھ جاؤ! ناشتہ تیار ہے۔''

''تم شیراز بابا کی پوتی ہو۔ مگر کل شام جب میں یہاں آیا تھا تو اُس وقت تم نظر نہیں آئی تھیں۔ اب کہاں سے ٹپک پڑی ہو؟'' طارق نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''رات کو میں ساتھ والی بستی میں تھی۔ میری سہیلی کی شادی ہو رہی تھی۔ ساری سکھیاں اُس کے گھر جمع تھیں۔ میں صبح ہی آئی ہوں۔ وہ بستی یہاں سے صرف ایک ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ بس! اب تم اُٹھ جاؤ۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔'' روشا کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

طارق، جماہیاں لیتا ہوا باہر آ گیا۔ شیراز کا یہ مکان تین چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے رہائش کے لئے اور تیسرا سامان اور مویشیوں کے چارے وغیرہ کے لئے مخصوص تھا۔

بستی کے چاروں طرف تا حد نگاہ سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ مکانوں کی پشت پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اور سامنے کے رُخ پر چند گز دُور شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ طارق نے ندی کے ٹھنڈے اور شفاف پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور دیر تک کھڑا چاروں طرف پھیلے ہوئے مرغزار کو دیکھتا رہا۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا واپس آ گیا۔

روشا اپنے مکان کے سامنے چولہے کے قریب بیٹھی تھی۔ چولہے پر ایلومینیم کی کیتلی چڑھی ہوئی تھی جو دُھویں سے بالکل سیاہ ہو چکی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر بانس کی ایک چارپائی بھی بچھی ہوئی تھی۔ طارق، چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد روشا، ناشتہ لے آئی۔ ناشتہ سبز قہوے اور سوکھی روٹی پر مشتمل تھا۔ طارق، سوکھی روٹی قہوے میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔

''تم شیراز بابا کی پوتی ہو، لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا باپ کہاں ہے، کیا نام ہے اُس کا؟ میرے خیال میں اس گھر میں شیراز بابا اور تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔'' طارق نے قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے روشا کی طرف دیکھا۔

''کسی مجاہد کی بیٹی سے یہ سوال پوچھنا بہت ہی غیر ضروری ہے کہ اُس کا باپ کہاں ہے؟'' روشا نے جواب دیا۔

''اوہ.....'' طارق نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ناشتہ ختم کر کے اُس نے چراگاہ کا راستہ پوچھا تو روشا نے اُسے روک لیا۔

''تم بستی سے باہر نہیں نکلو گے.....یہ بابا کا حکم ہے۔''

''کیوں.....؟'' طارق نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''سکیورٹی والے ان پہاڑوں میں خونی بھیڑیوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ ہم مسلمان اس مقبوضہ خطے میں کیسی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم پر جو ستم ڈھائے جا رہے ہیں، ان سے ساری دُنیا واقف ہے۔ بھارتی درندے جس کو چاہیں، پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ ہر پکڑے جانے والے مسلمان پر صرف ایک ہی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ کسی حریت پرست تنظیم کا جاسوس ہے یا پاکستان کا ایجنٹ ہے۔ وہ چند روز پہلے بھی یہاں سے ایک بے گناہ کو پکڑ کر لے گئے تھے جس کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی ان درندوں کے ہاتھ لگ جاؤ جو اس خطے میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں، تمہارا خیال رکھوں۔''

''تم میرا خیال رکھو گی؟'' طارق نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....ایک مجاہد کی بیٹی ہوں۔ اور.....''

''بس، بس.....'' طارق نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ وہ روشا کی بے باکی اور عزم کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ بہرحال! اُس نے روشا کے کہنے پر عمل کیا اور بستی سے باہر جانے کا اِرادہ ترک کر دیا۔

روشا کچھ دیر تک گھر کے کام کاج میں لگی رہی۔ اور پھر بستی ہی میں اپنی ایک سہیلی کے گھر چلی گئی۔

طارق، بان کی کھری چارپائی پر لیٹا کبھی روشا کے بارے میں اور کبھی اپنے مشن کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ مشن کے بارے میں تفصیلات شیراز بابا بتائے گا۔ لیکن گزشتہ رات کھانے کے بعد وہ کچھ دیر تک وادی کی صورت حال کے بارے میں تو باتیں کرتے رہے تھے لیکن شیراز بابا نے اُس مشن کے بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا تھا۔ طارق کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس مشن میں صرف دو آدمی شامل ہوں گے۔ ایک وہ خود اور دوسرا ایک اور۔ اُس دوسرے آدمی کو بھی اسی بستی میں پہنچنا تھا جو ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اور طارق یہ سوچ کر رہ گیا تھا کہ ممکن ہے، دوسرے آدمی کی آمد کے بعد ہی شیراز بابا اُنہیں اس مشن کے بارے میں بتائے۔

روشا اُسے دوپہر کا کھانا کھلانے کے بعد پھر اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی۔ طارق ٹہلتا ہوا ندی پر چلا گیا اور دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر اچانک ہی وادی، فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی اور وہ اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے بستی کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ فائرنگ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ پہاڑوں میں بازگشت سی پیدا کرتی ہوئی آواز سے یہ اندازہ لگانا

دُشوار تھا کہ فائرنگ کہاں پر ہو رہی تھی؟ لیکن آواز زیادہ دُور کی نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بستی کی طرف چل پڑا۔ روشا، مکان کے سامنے چولہے میں لکڑیاں جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟'' طارق نے اُس کے قریب رُک کر پوچھا۔

''یہ پہاڑ تو گولیوں کی آوازوں سے گونجتے رہتے ہیں۔ تم بیٹھو! میں تمہارے لئے قہوہ بنا رہی ہوں۔ کچھ دیر میں بابا بھی مویشی لے کر آتے ہی ہوں گے۔'' روشا نے جواب دیا اور ایک بار پھر چولہے میں پھونکیں مارنے لگی۔

سائے لمبے ہو گئے تھے۔ سورج آہستہ آہستہ پہاڑوں کی طرف جھک رہا تھا۔ طارق، چارپائی پر بیٹھ کر روشا کی طرف دیکھنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد روشا نے قہوہ بنا کر کیتلی اور پیالی اُس کے سامنے رکھ دی اور خود دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

طارق نے قہوہ پی کر پیالی رکھی ہی تھی کہ ایک نسوانی چیخ سن کر اُچھل پڑا۔ دبی دبی سی یہ چیخ بستی کی دائیں طرف سے آئی تھی۔ روشا بھی کام چھوڑ کر اُس طرف دیکھنے لگی۔ بستی کے اور لوگ بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔ اُن میں تین چار بوڑھے مرد، چھ سات بوڑھی عورتیں، بچے اور تین ایسی عورتیں تھیں جو جوانی کا سفر پورا کرنے کے بعد بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھیں۔ وہ سب اسی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب کے چہروں کے رنگ بدلے ہوئے تھے۔ چیخوں کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر عورت، درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اُس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور وہ بار بار لڑکھڑا کر گر رہی تھی۔

''ارے..... یہ تو ماسی زینب ہے۔ ریشماں کی ماں۔'' روشا اُس عورت کو دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی۔

''ریشماں کون.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''میری سہیلی، جس کی شادی ہونے والی ہے۔ کل رات میں اُسی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اللہ خیر کرے.....'' روشا، درختوں کی طرف دوڑنے لگی۔ بستی کے دوسرے لوگ بھی اُسی طرف دوڑ رہے تھے۔ طارق بھی دوڑنے لگا۔

ماسی زینب ٹھوکر کھا کر گر گئی تھی۔ ساتھ ہی اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس دوران بستی کے لوگوں کے ساتھ ساتھ طارق بھی وہاں پہنچ گیا۔ ایک عورت نے جھک کر ماسی کو اُٹھانا چاہا مگر وہ پھر گر گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ اور چہرہ خوف و دہشت سے اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

''کیا ہوا ماسی زینب.....؟'' روشا اُس پر جھک گئی۔ ''خیر تو ہے نا! یہ تمہاری حالت.....''

''وہ بھیڑیے.....'' ماسی زینب ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میری ریشماں کو اُٹھا کر لے گئے۔ اُنہوں نے بستی جلا کر راکھ کر ڈالی.....سب کو زندہ جلا دیا.....بھون دیا سب کو گولیوں سے اُن درندوں نے۔''

''کون سے وہ.....؟'' روشا نے پوچھا۔ اُس کا لہجہ بھی ایک انجانے خوف سے تھرا رہا تھا۔

''فوجی.....ہندو بھیڑیے.....'' ماسی زینب کو اپنی آواز پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ''وہ کہہ رہے تھے، اُنہیں ایک پاکستانی جاسوس کی تلاش ہے، جسے ہم نے چھپا رکھا ہے۔ وہ گھروں میں گھس کر تلاشی کے بہانے لوٹ مار کرنے لگے۔ ریشماں کے باپ نے مزاحمت کی تو اُسے گولی مار دی بلکہ سب کو گولیاں مار دیں.....آگ لگا دی بستی کو.....میرے سامنے سب کو زندہ جلا دیا۔ اور ریشماں اور زبیدہ کو اُٹھا کر لے گئے وہ بھارتی درندے.....'' ماسی زینب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ اس وقت بستی سے باہر گئی ہوئی تھی۔ اگر وہ اس وقت بستی میں ہوتی تو اُسے بھی چھلنی کر دیا جاتا۔ جب وہ بستی میں پہنچی تو بستی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ ہر طرف جلی ہوئی اور گولیوں سے چھلنی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

روشا اور بستی والے، ماسی زینب کو روشا کے مکان میں لے آئے۔ اس واقعے نے ہر چہرے کو دُھندلا دیا تھا۔ زندگی تو پہلے ہی خوف کے سائے میں بسر ہو رہی تھی۔ اب یہ سائے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ ماسی زینب کو چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ بستی کے لوگ اُس کے چاروں طرف جمع تھے۔

طارق ایک طرف کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا ماسی زینب کی بستی پر یہ قہر اُس کی وجہ سے ٹوٹا تھا؟ وہ ایک خفیہ مشن پر یہاں آیا تھا۔ ممکن ہے، بھارتی انٹیلی جنس کو بھی اس کے بارے میں اطلاع مل چکی ہو اور بھارتی فوجی اُسی کی تلاش میں ماسی زینب کی بستی میں پہنچے ہوں۔ لیکن وہ پاکستانی جاسوس تو نہیں تھا۔ اُس کا تعلق تو کشمیر کی تنظیم لبریشن فرنٹ سے ہے۔ لیکن بھارتیوں کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اُن کو تو ہر کشمیری مسلمان کے چہرے پر پاکستانی جاسوسوں کا عکس نظر آتا ہے۔

شام دُھندلا رہی تھی۔ یہ لوگ ابھی ماسی زینب کے غم سے سنبھلے بھی نہیں تھے کہ ایک اور زوردار فرسا اطلاع ملی۔ بستی کا ایک نوجوان لڑکا، جو مویشی چرانے کے لئے گیا ہوا تھا، دوڑتا، ہانپتا بستی میں داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ خوف کی شدت سے پیلا ہو رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایک فوجی جیپ اس طرف آ رہی ہے۔ وہ اپنے مویشیوں کو ہانکتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا کہ بکری کا ایک بچہ ٹیلے پر چڑھ گیا۔ وہ بھی بکری کے بچے کو پکڑنے کے لئے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اُس نے بستی کی طرف آنے

والے راستے پر ایک فوجی جیپ کو دیکھا تو مویشیوں کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا یہاں آ گیا۔ اُس کے کہنے کے مطابق جیپ زیادہ دُور نہیں تھی۔

طارق نے اُس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ ایک بڑے ٹیلے کے دوسری طرف دُھول کا بادل سا اُڑتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جیپ زیادہ دُور نہیں تھی اور ٹیلے کے اُوپر سے گھوم کر کسی بھی لمحے سامنے آ سکتی تھی۔ روشا بھی دُھول کے اُٹھتے ہوئے اُس بادل کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دم جیسے وہ ہوش میں آ گئی اور طارق کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔

''وہ لوگ یقیناً تمہاری تلاش میں ہیں۔ تم چھپ جاؤ!'' روشا نے کہا اور بدحواس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اُسے چھپانے کے لئے جگہ تلاش کر رہی ہو۔

''کیا تم مجھے بزدل سمجھتی ہو؟ میں.....''

''یہ بزدلی کی بات نہیں۔'' روشا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تم اس علاقے میں اجنبی ہو۔ تم پر بڑی آسانی سے جاسوس ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ اگر تم پکڑے گئے تو تمہیں پناہ دینے کے الزام میں پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔''

بات، طارق کی سمجھ میں آ گئی۔ بھارتی درندوں سے اگرچہ کسی رحم کی توقع نہیں تھی۔ لیکن روشا کی بات میں بڑا وزن تھا۔ وہ بھی کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔

''میرے ساتھ آؤ! اس وقت وہی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں تم چھپ سکتے ہو۔'' روشا اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کمرے کی طرف دوڑی جس میں فالتو چیزیں اور مویشیوں کا چارہ وغیرہ بھرا ہوا تھا۔

''بھوسے کے اِس ڈھیر میں گھس جاؤ۔ جیپ بستی کے سامنے پہنچ چکی ہے۔'' روشا نے اُسے کمرے میں بھوسے کے ڈھیر کی طرف دھکیل دیا۔

طارق کو بھوسے کے ڈھیر میں چھپنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ لیکن اُس نے اتنا سا خلا رہنے دیا تھا کہ ہوا کی آمد و رفت برقرار رہے۔

جیپ، مکانوں کے سامنے آ کر رُک گئی۔ اُس پر تین فوجی سوار تھے۔ وہ تینوں سب مشین گنوں سے لیس تھے۔ جیپ رُکتے ہی دو فوجی کود کر نیچے اُتر آئے جبکہ تیسرا اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا رہا۔

''اس بستی کے مرد کہاں ہیں.....کہاں چھپ گئے سب لوگ؟'' ایک فوجی نے گرجدار آواز

میں پوچھا۔

''کیا ہم تمہیں مرد نظر نہیں آتے؟'' ایک بوڑھے نے جواب دیا۔

''خاموش رہ بڈھے.....'' فوجی دھاڑا۔ ''میں جوان آدمیوں کے بارے میں پوچھ ر ہوں۔''

''ہم جوانوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ان بازوؤں میں بڑی قوت ہے ابھی۔'' بوڑھے سینہ ٹھونک کر جواب دیا۔

''بند کرو اپنی زبان۔'' فوجی نے کہتے ہوئے سب مشین گن کا بٹ پوری قوت سے بوڑھے کے سینے پر مارا۔ بوڑھا چیختا ہوا گر پڑا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن فوجی نے اُسے تین چار ٹھوکریں اور رسید کر دیں۔ بوڑھا بری طرح بلبلانے لگا۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ یہاں کوئی پاکستانی جاسوس چھپا ہوا ہے۔'' اُس فوجی نے سب کے چہروں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ اُس جاسوس کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ ہم اس بستی کو جلا کر راکھ کر ڈالیں گے اور تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''یہاں کوئی جاسوس نہیں ہے۔ اگر ہوتا بھی تو ہم اُس کے بارے میں کچھ نہ بتاتے۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت نے دلیری سے جواب دیا۔

''اوہ.....'' دوسرا فوجی اُس کی طرف گھوم گیا۔ اُس نے سب مشین گن کی نال پوری قوت سے عورت کے منہ پر ماری۔ عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُس کا جبڑا ٹوٹ گیا اور خون اُبلنے لگا۔ ''رادھن.....! بلبیر.....!'' فوجی نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمام گھروں کی تلاشی لو۔ اگر کوئی مزاحمت کرنے کی کوشش کرے تو بھون ڈالو اُسے۔'' جیپ کے سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا فوجی بھی اُتر آیا۔ وہ بلبیر تھا جو، رادھن کے ساتھ مل کر گھروں کی تلاشی لینے لگا۔ تیسرا فوجی، بستی کے مکینوں پر سب مشین گن تانے کھڑا رہا۔

روشا اپنی جگہ سے سرکتی ہوئی چولہے کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ مویشیوں والے کمرے کا دروازہ سامنے ہی تھا۔ بھوسے کا وہ ڈھیر بھی نظر آ رہا تھا جس میں طارق چھپا ہوا تھا۔ ایک فوجی جیسے ہی اُس دروازے کی طرف بڑھا، روشا زمین پر پڑی ہوئی تین چار لکڑیاں اُٹھا کر اس طرح سامنے آ گئی جیسے لکڑیاں اُس کمرے میں ڈالنے جا رہی ہو۔ فوجی نے اُسے دیکھا تو یکدم ٹھٹھک گیا، جیسے پہلی بار اُسے دیکھا ہو۔

''اوہو.....!'' فوجی کے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ ''رمیش جی! ادھر تو دیکھو ذرا! کیا چیز ہے اسی کو لے چلو۔ رات آرام سے گزر جائے گی۔''

''واقعی.....'' اُس فوجی نے جواب دیا، جسے رمیش کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ ''اسے تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُٹھا کر جیپ میں ڈال لو! اور لے چلو یہاں سے۔ لعنت بھیجو پاکستانی جاسوس پر۔''

جس فوجی نے اپنے ساتھیوں کو روشا کی طرف متوجہ کیا تھا، وہ رادھن تھا، وہ نپے تلے قدم اُٹھاتا ہوا روشا کی طرف بڑھا۔

''خبردار! اپنے ناپاک ہاتھ مجھے مت لگانا۔'' روشا، لکڑیاں پھینک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ارے تم بچ کر کہاں جاؤ گی؟ کئی روز بعد تم جیسی کومل ناری دکھائی دی ہے۔ آج تو ہم اپنے من کی پیاس بجھائیں گے۔'' رادھن آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

روشا پیچھے ہٹتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ رادھن نے اچانک ہی لپک کر اُسے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ رادھن کے دوسرے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ روشا چیختے ہوئے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کھینچا تانی میں روشا کی اوڑھنی اُس کے جسم سے گر گئی۔ قمیص میں اُس کے سینے کی اُٹھان دیکھ کر رادھن کی آنکھوں میں شیطانی چمک اُبھر آئی۔ اُس نے روشا کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ روشا کے منہ سے ایک اور چیخ نکل گئی۔

طارق سعید بھوسے کے ڈھیر میں چھپا یہ آوازیں سن رہا تھا۔ روشا کی چیخوں میں اب رادھن کے قہقہے بھی شامل ہو گئے تھے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیلا جا رہا ہو۔ اب دوسرے فوجی بھی قہقہوں میں شامل ہو گئے تھے۔

طارق کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ بھوسے کے ڈھیر سے نکل آیا۔ اور پھر جو منظر دکھائی دیا وہ اُس کا دماغ گھما دینے کے لئے کافی تھا..... روشا کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ رادھن بچا کھچا لباس بھی اُس کے جسم سے نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی سب مشین گن دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر چولہے کے قریب پڑی تھی۔ دوسرے فوجی بستی والوں پر گنیں تانے کھڑے تھے۔ بستی والوں کے چہرے دُھند میں لپٹے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے اُن کے جسم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ لیکن وہ روشا کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ موت اُن پر پہرہ دے رہی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک بوڑھے نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اُس کی بوڑھی رگوں میں جیسے غیرت کا لاوا سا کھول اُٹھا تھا۔

''چھوڑ دو اسے کتو.....!'' بوڑھا چیختا ہوا روشا کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن ایک فوجی کی سب مشین گن دھاڑ اُٹھی..... بوڑھے کے جسم سے خون کی کئی دھاریں بہہ نکلیں۔ اُس کا جسم چھلنی ہو گیا اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

طارق ایک ہی جست میں کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ ٹھیک اس جگہ گرا تھا، جہاں رادھن کی سب مشین گن پڑی تھی۔ اُس نے گرتے ہی سب مشین گن پر ہاتھ ڈال دیا۔ بلبیر نے اُسے کمرے سے چھلانگ لگا کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا اور ساتھ ہی گھوم کر فائر کھول دیا۔ طارق بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ گولیاں اُس کے آس پاس گریں۔ اور پھر اُس نے لیٹے ہی لیٹے سب مشین گن کا فائر کھول دیا..... سب سے پہلے بلبیر اور اُس کے بعد رمیش کی چیخیں فضا میں گونجیں۔ اُن کے جسم چھلنی ہو کر خاک میں لوٹنے لگے۔

''چھوڑ دو لڑکی کو..... اور دُور ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔'' طارق دھاڑا۔ اُس کی گن کا رُخ اب رادھن کی طرف تھا جو روشا کو دبوچے مبہوت سا کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ خوف سے ایک دم زرد ہو گیا تھا۔

روشا نے خود ہی اپنے آپ کو ایک جھٹکے سے رادھن کی گرفت سے چھڑایا اور دوڑتی ہوئی اُن عورتوں کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی جو اَب بھی خوف سے کانپ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت نے اپنی بوسیدہ سی شال، روشا کے جسم پر ڈال دی۔

''اپنے ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا کر جیپ میں ڈالو۔'' طارق نے رادھن کو حکم دیا۔ رادھن نے بے چون و چرا اُس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دونوں لاشیں اُٹھا کر جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیں۔ خوف کی شدت سے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ بستی کے لوگوں نے اُن بھارتی درندوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے بوڑھے کی لاش اُٹھا کر ایک چارپائی پر ڈال دی تھی۔

اس دوران چراگاہ کی طرف سے مویشیوں کا ریوڑ آتا ہوا دکھائی دیا۔ شیراز بابا تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا مویشیوں کے آگے آگے چل رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو یہ صورتِ حال دیکھ کر اُس کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو گیا۔ روشا دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی اور رو رو کر اُسے پوری داستان سنانے لگی۔

''تم نے میری عزت بچائی طارق بیٹا! تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن.....'' شیراز بابا ایک لمحے کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''فائرنگ کی آواز، ان پہاڑوں میں دُور دُور تک سنی جاتی ہے۔ صورتِ حال معلوم کرنے یا اپنے ساتھیوں کی تلاش میں بھارتی فوجی جلد یا بدیر اس طرف ضرور آئیں گے۔ ان کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟'' اُس نے رادھن اور جیپ میں پڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھا۔

''ان کی فکر مت کرو بابا! انہیں میں ٹھکانے لگا دُوں گا۔ تم اس کی تدفین کا بندوبست کرو۔'' طارق نے کہا اور رائفل کے اِشارے سے رادھن کو جیپ میں بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔

رادھن سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا تھا اور طارق پچھلی سیٹ پر۔ سب مشین گن کی نال اُس نے رادھن کی پشت پر لگا رکھی تھی۔ رادھن، پہاڑوں میں اُس کے بتائے ہوئے راستے پر ہلکی رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد طارق نے جیپ رُکوالی۔ جس جگہ جیپ روکی گئی تھی، اُس سے چند گز آگے سینکڑوں فٹ گہرا کھڈ تھا۔ کل بستی کی طرف آتے ہوئے طارق نے یہ جگہ دیکھی تھی۔ اُس کے خیال میں ان بھارتی سورماؤں اور جیپ کو ٹھکانے لگانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

''تت..... تم کیا کرنا چاہتے ہو..... مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' رادھن نے پوچھا۔ اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''تم نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا نا کہ آج کی رات آرام سے گزرے گی۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے ساتھ جو کچھ کرنے والا ہوں، اس سے تم تو کیا تمہاری آتما بھی سکھی رہے گی۔ انجن بند کر دو۔''

رادھن نے انجن بند کر دیا..... وہ گھوم کر پیچھے دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ طارق نے سب مشین گن کا بٹ پوری قوت سے اُس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ رادھن چیختا ہوا سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ طارق نے اُسے کھینچ کر ایک طرف ہٹا دیا اور خود سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کر دیا اور اُسے گیئر میں ڈال کر جیپ کو حرکت میں لے آیا۔ جیپ آہستہ آہستہ کھڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ جیسے ہی کنارے پر پہنچی، طارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ سے چھلانگ لگا دی۔ جیپ دوسرے ہی لمحے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی..... چند سیکنڈ بعد ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ طارق نے ہاتھ جھٹکے، جیسے گرد جھاڑی ہو۔ پھر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بستی کی طرف چلنے لگا۔

اندھیرا پھیل گیا تھا۔ راستہ خاصا دُشوار گزار تھا۔ مگر طارق کو بستی تک پہنچنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔

سب لوگ شیراز بابا کے گھر میں جمع تھے۔ شہید ہونے والے بوڑھے کو دفن کیا جا چکا تھا۔ لیکن اس دوران یہاں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ چہرہ طارق کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ سلیم کشمیری تھا جس کے ساتھ اُس نے تربیتی کیمپ میں ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اُن دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔

''میں ابھی چند منٹ پہلے ہی پہنچا ہوں۔ یہاں آتے ہی پتہ چلا کہ صورتِ حال خاصی سنگین ہے۔'' سلیم کشمیری نے بتایا۔ ''میں تو کل شام ہی کو پہنچ جاتا۔ مگر ایک رات اکھنور میں رُکنا پڑا۔ وہاں دریا کے قریب بھارتی فوجیوں اور مجاہدین میں ایک بڑی جھڑپ ہوئی ہے۔ میں بھی بھارتی فوجیوں کے خلاف اُس کارروائی میں مجاہدین کے ساتھ شریک تھا۔ اس جھڑپ میں ہمارے پندرہ مجاہدین شہید ہوئے ہیں۔ جبکہ مجاہدین نے بھارتی فوجیوں کے ایک قافلے پر حملہ کر کے تقریباً چالیس فوجیوں کو جہنم واصل کر دیا ہے۔ میں وہاں سے نکل پڑا، مگر میرا میزبان زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے اس وجہ سے بھی رُکنا پڑا۔''

''یہاں کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ آج دن میں یہاں سے تقریباً دو کوس دُور ایک بستی کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہے۔ بستی کے تمام افراد کو یا تو زندہ جلا دیا گیا یا اُنہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ صرف ایک عورت زندہ بچی ہے، جو اَب شیراز بابا کی مہمان ہے۔'' طارق نے بتایا۔

''بھارتی شاید سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ ہمیں دبا لیں گے یا وادی سے نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔ اُنہیں ہمارے شہیدوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑے گا۔'' سلیم کشمیری نے کہا۔

''اور ہم یہ حساب ضرور لیں گے۔'' ایک بوڑھے نے کہا۔

''انشاءاللہ.....'' سب نے بیک وقت کہا۔

کچھ دیر بعد بستی کے لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو رُخصت ہو گئے۔ ماسی زینب کو روشا اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ اُس کی بستی کے سب لوگ مار دیئے گئے تھے۔ گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا اور خونی بھیڑیئے اُس کی بیٹی کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔ یہ کوئی ایسا غم نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کر لیا جاتا۔ اور پھر اُس کے چند ہی گھنٹوں بعد اس بستی پر بھی آفت نازل ہوتے ہوتے رہ گئی تھی جہاں اُس نے پناہ لی تھی طارق اگر بروقت کارروائی نہ کرتا تو یہ چھوٹی سی بستی بھی ویرانے میں تبدیل ہو چکی ہوتی۔

اس کمرے میں اب شیراز بابا، طارق اور سلیم کشمیری رہ گئے تھے۔ اُن کے سامنے قہوے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں اور وہ ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے دبے دبے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ شیراز بابا کہہ رہا تھا۔

''بھارتی ملٹری انٹیلی جنس کو اطلاع مل چکی ہے کہ ہماری طرف سے کوئی خفیہ مشن بھیجا جا رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں پاکستانی جاسوس گھس آئے ہیں۔ ان جاسوسوں کی تلاش میں وہ وادی

میں ہم مسلمانوں کی بستیوں کو جلا کر راکھ کر رہے ہیں۔ ہماری جان و مال اور عزت و آبرو یہاں نہ تو پہلے محفوظ تھی اور نہ اب ہے۔ یہ بھارتی درندے مختلف حیلوں بہانوں سے ہمیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عہد ہے کہ ہم ان خون آشام بھیڑیوں کو وادی سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ جب تک اس سرزمین کو اُن کے ناپاک وجود سے خالی نہیں کروا لیا جاتا، ہم اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔'' شیراز بابا چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لبریشن فرنٹ نے تم دونوں کو ایک اہم مشن کے لئے منتخب کیا ہے۔ سلیم نے یہاں پہنچنے میں ایک دن کی تاخیر کر دی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس اب بھی وقت ہے۔ بھارتی بھیڑیئے چوکس ہو گئے ہیں۔ وہ تم لوگوں کی تلاش میں مسلمانوں کی بستیاں اُجاڑ رہے ہیں۔ آج یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے، اس پر وہ لوگ خاموش نہیں رہیں گے۔ اُنہیں کل ہی پتہ چل جائے گا کہ اُن کے تین آدمیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے آدمیوں کا انتقام لینے کے لئے وادی میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کوئی اُن کے ہتھے چڑھ جائے۔ اس لئے میرے خیال میں تم لوگوں کو صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے یہاں سے رُخصت ہو جانا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے..... ہم صبح چار بجے کے قریب یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن ہمیں اس مشن کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا گیا۔'' طارق نے کہا۔

''مشن کے بارے میں تفصیلات تمہیں دہلی پہنچ کر بتائی جائیں گی۔'' شیراز نے کہا۔ ''دہلی پہنچتے ہی تم سبزی منڈی میں بابو محفوظ سے رابطہ قائم کرو۔ وہ پھلوں کا آڑھتی ہے۔ اس مشن کے بارے میں تمام تفصیلات تمہیں وہی بتائے گا۔''

''ٹھیک ہے..... ہم آج صبح روشنی طلوع ہونے سے پہلے یہاں سے رُخصت ہو جائیں گے۔ اب میں آپ سے ایک اور بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ روشا کا باپ، میرا مطلب ہے آپ کا بیٹا کہاں ہے؟ کیا وہ بھی لبریشن فرنٹ میں ہے؟'' طارق نے کہا۔

''روشا چھ سال کی تھی جب اُس کا باپ راجوڑی میں بھارتی فوجیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ آج تک اُس حقیقت سے بے خبر ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ اُس کا باپ کسی محاذ پر دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ میرے تین بیٹے اس تحریک آزادی میں شہید ہوئے ہیں۔ کاش! میرا کوئی اور بیٹا بھی ہوتا جسے میں وطن کی آبرو پر قربان کر دیتا۔'' شیراز بابا آبدیدہ ہو گیا۔

کمرے کی فضا ایک بار پھر اُداس ہو گئی۔ اُس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شیراز بابا

باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتا ہوا اُٹھ گیا۔ ''ٹھیک ہے..... اب تم لوگ کچھ آرام کرلو۔ میں صبح چار بجے تم لوگوں کو جگاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے بابا.....!'' سلیم نے جواب دیا۔

شیراز بابا، کمرے سے نکل گیا۔ سلیم اور طارق سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ اور پھر اچانک ہی تاریک اور خاموش فضا زبردست فائرنگ سے گونج اُٹھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ فائرنگ کی آوازیں خاصی دُور جنوب کی طرف سے آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دو متحارب پارٹیاں آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔ اُنہیں سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بھارتی فوج اور مجاہدین کے کسی گروپ میں تصادم ہو گیا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بھارتی فوج اور مجاہدین میں جھڑپیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ بارود نے فضا کو مسموم کر رکھا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں تقریباً آدھے گھنٹے تک سنائی دیتی رہیں۔ اور پھر پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں کمرے میں آ گئے۔ اس قسم کی صورت حال میں نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی۔

ٹھیک چار بجے شیراز بابا کمرے میں داخل ہوا۔ طارق نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔

''روشانا شتہ بنا رہی ہے۔ تم لوگ تیار ہو جاؤ۔'' شیراز بابا نے کہا۔

''ہم تیار ہی ہیں بابا!'' سلیم نے جواب دیا۔

''یہ تم دونوں اپنے گلے میں پہن لو۔'' شیراز بابا نے کہا۔ یہ گندے کی طرح بٹے ہوئے دھاگے تھے۔ پیلے رنگ کے دھاگے میں چند جگہوں پر سبز دھاگے سے گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔

''یہ دھاگے گم نہ ہونے پائیں۔ یہ بابو محفوظ کے لئے تمہاری شناخت کا ذریعہ ہوں گے۔ دھاگے نہ ہونے کی صورت میں وہ تمہیں شناخت نہیں کرے گا۔'' شیراز بابا نے کہا۔

''ٹھیک ہے..... ہم انہیں اپنے گلے میں پہنے رہیں گے۔'' طارق نے جواب دیا۔ اور اُن دونوں نے دھاگے اپنے اپنے گلے میں پہن لئے۔ چند منٹ بعد روشا اُن کے لئے ناشتہ لے کر آ گئی جو قہوے اور سوکھی روٹی پر مشتمل تھا۔ اُنہوں نے ناشتہ کیا اور روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔

وہ، روشا اور شیراز بابا کے ساتھ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے، خاموش فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ اس مرتبہ یہ آوازیں مشرق کی طرف سے آئی تھیں۔ اُن دونوں نے روشا اور شیراز بابا کو خدا حافظ کہا اور درختوں کے جھنڈ کی طرف چلنے لگے۔

وہ دونوں صبح سات بجے جموں کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ پٹھان کوٹ اور لدھیانہ سے ہو

کر دہلی کے لئے جانے والی ٹرین آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ ٹرین کی روانگی میں اگرچہ ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، لیکن سٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا۔ مسافروں میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ سکھ اور مسلمان بھی تھے۔ سٹیشن پر سکیورٹی کے انتظامات بھی بہت سخت تھے۔ لا تعداد فوجی، رائفلیں سنبھالے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ سکھ اور مسلمان مسافروں پر خاص طور سے نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

طارق اور سلیم پھٹے پرانے لباس میں تھے۔ طارق کے خیال میں براہِ راست دہلی جانا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ ان دنوں دہلی جانے والے کشمیریوں کو شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے پٹھان کوٹ کے ٹکٹ خریدے تھے۔

پٹھان کوٹ میں چند گھنٹے رُکنے کے بعد وہ لدھیانہ کی بجائے امرتسر جانے والی بس پر بیٹھ گئے۔ یہی اُن کی غلطی تھی..... پورے مشرقی پنجاب میں اُن دنوں آزاد ریاست خالصتان کے قیام کے سلسلے میں سکھوں کی تحریک عروج پر تھی۔ امرتسر اُس تحریک کا مرکز تھا۔ یہاں سکھوں اور بھارتی فوج میں باقاعدہ محاذ کھلا ہوا تھا۔ یہ دونوں جب امرتسر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ شہر کے ایک علاقے میں زبردست لڑائی جاری تھی۔ دوسرے علاقے بھی بتدریج اس لڑائی کی لپیٹ میں آتے جا رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بازار بند ہو چکے تھے۔ اِکا دُکا ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے۔ لیکن وہاں بھی اُلّو بول رہے تھے۔ سلیم اور طارق شدید اُلجھن کا شکار تھے۔ اُن کے لئے پناہ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس طرح سڑکوں پر پھرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

وہ ایک گلی میں مُڑے ہی تھے کہ سامنے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا نظر آیا۔ اُس کے دوڑنے کی رفتار یکساں نہیں تھی۔ کبھی وہ لڑکھڑا کر لہرانے لگتا اور کبھی جھک کر دُوہرا ہو جاتا۔ سلیم اور طارق ایک مکان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ گلی میں اُن دونوں اور سامنے سے آتے ہوئے اُس آدمی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ آدمی اُن کے قریب پہنچا تو لڑکھڑا کر گر گیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ سلیم اور طارق نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے زمین پر گرے ہوئے اُس آدمی کے قریب پہنچ گئے۔

وہ ایک نوجوان سکھ تھا۔ اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ زخمی تھا..... پنڈلی اور کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اُن دونوں نے جھک کر سکھ کو اُٹھا لیا۔ سکھ نوجوان کی آنکھوں میں خوف نمایاں ہو گیا۔

''ڈرو نہیں..... ہمیں اپنا دوست سمجھو! کیسے زخمی ہوئے؟ ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟'' طارق نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''تم لوگ کون ہو.....؟'' سکھ نوجوان نے عجیب سی نگاہوں سے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ ''مسلمان ہو، لیکن یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔''

''ہم یہاں اجنبی ہیں۔ بتاؤ! ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟'' طارق بولا۔

''میں اب چل نہیں سکتا۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو۔''

''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''میں ترن تارن کا رہنے والا ہوں۔ آج صبح ہی یہاں آیا تھا۔ دربار صاحب گیا تھا کہ ہندو فوجیوں نے دربار صاحب پر ہلہ بول دیا۔ ہمارے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ہندوؤں نے دربار صاحب کے ایک حصے کو آگ لگا دی۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بڑی مشکل سے دربار صاحب سے نکلا تھا۔ بھاگتے ہوئے مجھے دو گولیاں لگی ہیں۔ گورونانک سٹریٹ پر میرے ایک دوست کا گھر ہے۔ مجھے وہاں پہنچا دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔''

''گورونانک سٹریٹ کہاں ہے؟ اگر تم راستہ بتاؤ تو ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔'' طارق نے کہا۔

''میں تمہیں راستہ بتاتا رہوں گا۔'' سکھ نوجوان نے کہا۔

طارق نے سکھ نوجوان کو کندھے پر اُٹھا لیا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اُٹھا کر چلنے لگے۔ زخمی سکھ نوجوان اُنہیں راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ شہر میں چاروں طرف سے گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ مختلف تنگ اور پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے گورونانک سٹریٹ پہنچ گئے۔ یہاں بھی سناٹا تھا۔ تمام مکانوں کے دروازے بند تھے۔ یہاں سٹریٹ لائٹ بھی نہیں تھی۔ اور گھروں کے سامنے بھی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ محتاط انداز میں قدم اُٹھاتے ہوئے تاریکی میں چل رہے تھے۔ اور آخر کار سکھ نوجوان کے کہنے پر ایک مکان کے دروازے پر رُک گئے۔ سلیم نے دروازے پر دستک دی۔ کئی مرتبہ دستک کے بعد اندر سے ایک خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ کسی بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں دریافت کیا تھا کہ باہر کون ہے؟

''چاچا! دروازہ کھولو..... میں ہوں، گوربخش سنگھ۔ کرتار سنگھ کا دوست، ترن تارن والا۔ میں زخمی ہوں چاچا! دروازہ کھولو۔'' سکھ نوجوان نے کہا۔

اُسی لمحے دروازہ کھل گیا۔ ایک بدحواس سا بوڑھا باہر نکلا۔ اُس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ طارق اور سلیم کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' وہ بدحواس سا ہو کر بولا۔

''یہ میرے محسن ہیں چاچا! یہی مجھے بچا کر لائے ہیں۔ ہمیں اندر آنے دو چاچا!'' زخمی گوربخش سنگھ نے کہا۔ اسی لمحے کہیں قریب ہی شور اور فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

''اندر آ جاؤ! جلدی کرو.....'' بوڑھا، راستے سے ہٹ گیا۔

طارق اور سلیم اندر آ گئے۔ بوڑھے نے جلدی سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ یہ ایک تنگ سی ڈیوڑھی تھی۔ بوڑھا اُنہیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ طارق نے زخمی گوربخش سنگھ کو ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ خون سے اُس کا لباس تر ہو رہا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اُس کے چہرے پر زردی پھیل گئی تھی اور نقاہت غالب آ رہی تھی۔

''اسے دو گولیاں لگی ہیں۔'' طارق نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ہسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کا انتظام ہو سکتا ہے؟ خون کافی بہہ چکا ہے۔ اگر اس کے جسم سے گولیاں نہ نکالی گئیں تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

''ڈاکٹر.....'' بوڑھا جیسے سوچ میں پڑ گیا۔ ''ہمارے ساتھ والے مکان میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی ہے۔ ممکن ہے، وہ ترس کھا کر اس کا علاج کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن تم لوگ کون ہو؟''

''ہم اِس شہر میں اجنبی ہیں سردار جی! آج شام پٹھان کوٹ سے یہاں پہنچے ہیں۔ یہاں تمام ہوٹل بھی بند ہیں۔ ہمارا تو کوئی جاننے والا بھی نہیں جس کے ہاں رات گزار سکیں۔'' طارق نے اپنے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا جو گوربخش سنگھ کے خون سے داغدار ہو چکا تھا۔

''اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم دونوں کشمیری مسلمان ہو۔'' بوڑھے سکھ نے باری باری اُن کے چہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے سردار جی!'' طارق نے جواب دیا۔

''دونوں قومیں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔'' سردار جی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم نے 1947ء میں ایک غلطی کی تھی، جس کا خمیازہ اب بھگت رہے ہیں۔ 47ء میں تقسیم ہند کے وقت اگر ہم نے مسلمانوں کا ساتھ دیا ہوتا تو آج صورتِ حال مختلف ہوتی۔ ہندو، انسان نہیں، ایک ایسا بھیڑیا ہے جس کے منہ کو خون لگ چکا ہے۔ اُس نے انسانیت کو جس طرح کچلا ہے، دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ اسی ظالم قوم نے مذہبی روایات کو بھی پامال کر رکھا ہے۔ آج انہوں نے دربار صاحب کو آگ لگا دی، بیسیوں بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کشمیر میں ہنستی بستی آبادیوں کو راکھ کیا جا رہا ہے۔ انسانوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے۔ ہمارا اور کشمیری مسلمانوں کا جرم صرف یہ ہے کہ ہم ان بنیوں کے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں۔ ان سے اپنا آزاد فضا میں سانس لینے کا حق مانگ رہے ہیں۔ لیکن غاصب برہمن، طاقت:

کے بل بوتے پر ہمیں دبانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اِس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ یہ سیاہ رات ہے جو ہمارے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تاریکی ضرور چھٹے گی اور روشن صبح طلوع ہوگی۔''

''انشاءاللہ.....!'' سلیم بولا۔

''یہ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی سردار جی!'' طارق نے کہا۔ ''پہلے ڈاکٹر کو بلائیے! گوربخش سنگھ کی حالت بگڑ رہی ہے۔''

''اوہ.....!'' بوڑھا سردار جی جیسے چونک گیا۔ اُسی لمحے گلی میں شور اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اِکا دُکا فائر بھی ہو رہے تھے۔ ''آج ہندوؤں نے جو آگ لگائی ہے، وہ پورے شہر میں پھیل رہی ہے۔ صرف امرتسر ہی نہیں، پورا ہندوستان اس آگ میں جلے گا۔ میں لیڈی ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔ گلی سے باہر جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ میں کوٹھے پر سے ہو کر جاتا ہوں۔ تم لوگ اس کا خیال رکھنا۔'' بوڑھا سردار، کمرے سے نکل گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد سردار جی ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ عورت کا چہرہ، خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ اُس کا بیگ، سردار جی نے اُٹھا رکھا تھا جسے اُس نے کرسی پر رکھ دیا۔ لیڈی ڈاکٹر جھک کر گوربخش سنگھ کے زخموں کا جائزہ لینے لگی۔

''گرم پانی کی ضرورت ہوگی۔'' لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

سردار جی نے دروازے کے قریب پہنچ کر ہانک لگائی۔ ''کاکے دی ماں! پانی گرم کر کے لا۔ ذرا جلدی!''

''سردار جی! آپ جانتے ہیں کہ میں گائنا کالوجسٹ ہوں۔ اس قسم کا آپریشن میں نے کبھی نہیں کیا۔ لیکن بہرحال.....''

''آپ تو بڑی اچھی سرجن ہیں جی۔ ہمارے کاکے کی پیدائش پر آپ نے کاکے کی ماں کا پیٹ چیرا تھا تو اُسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔'' سردار جی نے کہا۔

''سردار جی! آپ گرم پانی لے آیئے۔'' طارق نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ سردار جی، کاکے کی ماں کو پکارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

گوربخش سنگھ کو ایک گولی دائیں کندھے اور دوسری پنڈلی میں لگی تھی۔

''اس کی قمیص اُتار دیں۔ اور پتلون کا پائنچہ اُوپر چڑھا دیں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق نے گوربخش سنگھ کی قمیص اُتار دی۔ پتلون کا پائنچہ اُوپر چڑھانے کے لئے اُسے سلائی

اُدھیڑنی پڑی۔ اس دوران سردار جی گرم پانی لے آئے۔ لیڈی ڈاکٹر جھک کر پہلے پنڈلی کا زخم صاف کرنے لگی گوربخش، ہوش میں تھا۔ **انستھیسیا** دستیاب نہیں تھا۔ اور ظاہر ہے یہ آپریشن اُس کے ہوش میں ہوتے ہوئے ہی کیا جانا تھا۔

پنڈلی کا آپریشن کرتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھ نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔ گوربخش سنگھ بڑا باہمت نوجوان تھا جو دو گولیاں لگنے کے باوجود نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ بڑی ہمت سے آپریشن کا سامنا کر رہا تھا۔

پنڈلی کے زخم کی گولی آسانی سے نکل گئی۔ لیکن کندھے کی گولی نکالتے ہوئے گوربخش سنگھ بے ہوش ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد آپریشن مکمل ہوا۔

''میں نے ڈریسنگ کر دی ہے۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں۔ میرا خیال ہے، ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوش میں آجائے گا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے یہ گولیاں کھلا دیں۔ میں صبح آکر اسے دیکھ لوں گی۔ ویسے اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر نے اپنی چیزیں سنبھالتے ہوئے کہا۔

''چلیں جی! میں آپ کو چھوڑ آؤں۔ رات کی تاریکی میں کوٹھے پھلانگنا آسان نہیں ہے۔''

سردار جی نے اُس کا بیگ اُٹھا لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک بے ہوش گوربخش سنگھ کو دیکھتا رہا، پھر طارق اور سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ بھی رات یہیں گزار لو۔ میں تمہارے اَن پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ کاکے کی ماں ابھی جاگ رہی ہے۔ وہ روٹیاں پکا دے گی۔ سالن تو رکھا ہوا ہی ہوگا۔''

''سردار جی! آپ کا بیٹا کہاں ہے، گوربخش سنگھ کا دوست کرتار سنگھ؟'' طارق نے پوچھا۔

''وہ ہوشیار پور گیا ہوا ہے، اپنے ماموں کے پاس۔ ان دونوں میں بڑی پکی یاری ہے۔'' سردار جی کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

طارق اور سلیم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن دونوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ رات بسر کرنے کا ایک ٹھکانہ مل گیا تھا۔ اگر گوربخش سنگھ اُنہیں زخمی حالت میں نہ ملتا تو شہر میں کہیں بھی پناہ نہ ملتی۔ ممکن ہے، وہ بلوائیوں یا کسی فوجی کی گولی کا نشانہ بن جاتے۔

رات دس بجے کے قریب شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ لیکن رات بھر شہر کے مختلف علاقوں سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

اُن دونوں کو تین دن تک امرتسر میں رہنا پڑا۔ اس دوران اُنہوں نے سردار جی کے گھر سے باہر قدم تک نہیں نکالا تھا۔ گوربخش سنگھ کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ بوڑھا سردار جی اُن کا بے حد

شکر گزار تھا کہ اُن کی وجہ سے گوربخش سنگھ کی زندگی بچ گئی تھی۔

چوتھے روز وہ صبح کی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گئے.....

دہلی میں پہلی رات اُنہوں نے ریلوے سٹیشن کے قریب ہی ایک چھوٹے سے ایسے ہوٹل میں گزاری جہاں پانچ دس روپے میں چارپائی اور بستر مل جاتا تھا۔ ریلوے سٹیشن کے قریب ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں تھی۔ اور یہاں عام طور پر وہ لوگ رہا کرتے تھے، جو دن بھر شہر کے مختلف حصوں میں محنت مزدوری کرتے یا جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

صبح سویرے وہ لوگ اُٹھ کر سبزی منڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دونوں پہلی مرتبہ دہلی آئے تھے۔ لوگوں سے راستہ پوچھ کر چلتے رہے۔ سبزی منڈی اگرچہ ریلوے سٹیشن سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ لیکن اُنہیں وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ سبزی منڈی کا کاروبار اس وقت عروج پر تھا۔ ہا، ہو کے شور میں کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھلوں کا سیکشن الگ تھلگ تھا۔ وہ لوگوں سے پوچھتے ہوئے اُس طرف نکل گئے۔ یہاں لاتعداد ٹرک بے ترتیبی سے کھڑے تھے۔ ٹرکوں پر بھی مال لدا ہوا تھا اور ان کے قریب جا بجا پھلوں کی پیٹیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لاٹ کی لاٹ نیلام ہو رہی تھی۔ بولیاں لگ رہی تھیں۔ اور لاکھوں کے نوٹ، ہاتھ تبدیل کر رہے تھے۔

ایک طرف بہت بڑا شیڈ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں مال بھی بھرا ہوا تھا اور آڑھتیوں کے دفتر بھی تھے۔ دفتر کیا تھا، اس شیڈ کے نیچے انتظامیہ نے آڑھتیوں کو تھوڑی تھوڑی جگہ الاٹ کر رکھی تھی۔ کسی نے میز کرسی لگا رکھی تھی اور کوئی چاندنی، دری یا چٹائی بچھائے بیٹھا تھا۔ شیڈ کے سامنے آڑھتیوں کے ناموں کے بورڈ بھی آویزاں تھے۔ آڑھتیوں کی زیادہ تعداد ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ طارق اور سلیم بورڈ پڑھتے رہے۔ لیکن بابو محفوظ کے نام کا بورڈ اُنہیں کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اس طرح پھرنے کی بجائے کسی سے پوچھ لیا جائے؟'' سلیم نے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ آؤ! اُس بنئے سے پوچھتے ہیں۔ وہ اکیلا بیٹھا ہے۔'' طارق نے ایک طرف اِشارہ کیا۔

دیوار کے ساتھ مختصر سی جگہ پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر ہندو بیوپاری، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سرخ جلد والا لمبا سا بہی کھاتا گھٹنے پر رکھے کچھ حساب کتاب کر رہا تھا۔ موٹے شیشوں والی عینک اُس کی ناک کی نوک پر ٹکی ہوئی تھی۔

''مہاشے جی!'' طارق نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بابو محفوظ

آڑھتی کی دُکان کہاں ہے؟''

مہاشے جی نے گردن اُٹھا کر باری باری اُن دونوں کا جائزہ لیا۔ پھر بولا۔ ''چھی چھی..... پرے ہٹو.....'' وہ ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولا۔ ''ارے بھائی میاں! یہاں اتنا کماتے ہو، کپڑے تو ڈھنگ کے پہن لیا کرو۔''

''میں نے تم سے بابو محفوظ کا پتہ پوچھا تھا۔'' طارق نے کہا۔

''آگے جاؤ! پانچ چھ تھڑے چھوڑ کر وہاں مل جائے گا تمہیں۔'' بنئے نے ایک طرف اِشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھ گئے۔ آخر ایک جگہ اُنہیں بابو محفوظ کشمیری آڑھتی کے نام کا چھوٹا سا بورڈ نظر آ گیا۔ بابو محفوظ کو وہ پہچانتے تو نہیں تھے۔ لیکن اُن کا اندازہ تھا کہ جو شخص ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، وہی بابو محفوظ تھا۔ اس وقت تین چار آڑھتی اور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ طارق اور سلیم کچھ دیر تو اُن آدمیوں کے وہاں سے ہٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب اُن میں سے کوئی بھی نہیں ہلا تو وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

''کیا ہے..... یہاں کیوں کھڑے ہو؟'' بابو محفوظ نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

''ہمیں سیٹھ دولت رام نے بھیجا ہے سیٹھ!'' طارق نے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے گریبان کا اُوپر والا بٹن کھول دیا اور گلے میں پڑے ہوئے گنڈے کو اُنگلیوں سے مسلنے لگا۔

''کون سیٹھ دولت.....'' بابو محفوظ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُس کی نظریں طارق کے گلے میں سبز گرہوں والے پیلے دھاگے پر جم گئی تھیں۔ اُس نے سلیم کی طرف دیکھا، وہ بھی گریبان کھولے اُس کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے گلے میں بھی ایسا ہی گنڈا نظر آ رہا تھا۔ ''اوہ..... سمجھ گیا۔'' بابو محفوظ، گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''سیٹھ دولت رام پانی پت والا..... میں سمجھ گیا، سمجھ گیا..... میں نے بہت دنوں سے اُس کی رقم نہیں بھیجی۔ ایسا کرو! شام کو آنا تم لوگ۔ رقم تو تمہارے ہاتھ نہیں بھیج سکتا، چٹھی لکھ کر دے دُوں گا۔ منڈی میں دیہاڑی لگا لو۔ میں بھی تم لوگوں کو دن بھر کی پگھار دے دُوں گا۔ جاؤ شاباش!''

''لیکن سیٹھ دولت رام نے کہا تھا کہ رقم لے کر آنا اور.....''

''دے دُوں گا..... رقم بھی دے دُوں گا۔ ابھی تو جاؤ!'' بابو محفوظ نے کہا۔ پھر بولا۔ ''ٹھہرو! میں منیم سے کہتا ہوں۔ وہ تم دونوں کو دیہاڑی پر لگا دے گا۔ منڈی میں کہاں ٹھوکریں کھاتے

پھرو گے؟''

بابو محفوظ نے اپنے منشی کو کو بلا کر ہدایت کی کہ ان دونوں کو کام پر لگا دیا جائے۔ وہ لوگ منیم کے ساتھ چلے گئے۔ اور پھر دن بھر پھلوں کی پیٹیاں ڈھوتے رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے بابو محفوظ نے اُنہیں اپنے پاس بلوالیا۔

''میں تمہیں ایک پتہ دے رہا ہوں۔ نو بجے وہاں پہنچ جانا۔ یہاں کوئی بات نہیں ہوسکتی۔''

''لیکن ہمارے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔'' سلیم بولا۔

''اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔'' بابو محفوظ نے کہا اور پھر اپنے منیم کو آتے دیکھ کر اُونچی آواز میں بولا۔ ''یہ لو اپنی پگھار اور سیٹھ دولت رام سے کہہ دینا کہ ابھی میرے پاس رقم نہیں ہے۔'' اُس نے چند تہہ شدہ نوٹ، طارق کی مٹھی میں تھما دیئے۔ طارق نے مٹھی نہیں کھولی۔ اُس نے کاغذ کی ایک سلپ نوٹوں میں لپٹی ہوئی دیکھ لی تھی۔ اُس نے نوٹ، جیب میں رکھ لئے اور سلیم کو اِشارہ کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

اُس وقت شام کے سات بج رہے تھے اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ دن بھر کی مزدوری نے اُنہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ بھوک بھی بڑی شدت سے لگ رہی تھی۔ اُنہوں نے سبزی منڈی کے سامنے ایک مسلمان کے چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا، پھر چائے پیتے ہوئے طارق نے جیب سے وہ سلپ نکال کر دیکھی جو بابو محفوظ کے دیئے ہوئے نوٹوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جامع مسجد کے قریب ایک مکان کا پتہ تھا۔ مکان کی نشاندہی کے لئے دو تین نشانیاں بھی لکھی ہوئی تھیں۔ طارق نے پتہ ذہن نشین کرلیا اور سلپ پرزے پرزے کر کے پھینک دی۔

سبزی منڈی سے وہ ایک بس کے ذریعے چاندنی چوک پہنچ گئے۔ شہر کا یہ گنجان ترین علاقہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ابھی شام ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں احمقوں کی طرح بازاروں میں گھومتے رہے۔ ایک سینما ہاؤس میں امتابھ بچن کی فلم چل رہی تھی۔ فلم شاید نئی ریلیز ہوئی تھی۔ ابھی سوا آٹھ بجے تھے لیکن سینما کے سامنے بے پناہ ہجوم تھا۔ لوگ لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے تھے۔

وہ دونوں دیر تک سینما ہاؤس کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر جامع مسجد کی طرف چل پڑے۔ جامع مسجد سے تقریباً آٹھ سو گز آگے طارق کو پہلی نشانی نظر آ گئی۔ ہالی ووڈ بیکری۔ وہ بیکری کے ساتھ سڑک پر مُڑ گئے۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوسری نشانی بھی نظر آ گئی۔ اس طرح وہ بڑی آسانی سے اُس گلی میں پہنچ گئے جہاں وہ مکان واقع تھا۔ اُنہیں وہ مکان تلاش کرنے میں بھی زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ گلی میں اِکا دُکا لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ طارق

نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دوسری مرتبہ دستک کے جواب میں اُوپر کی منزل کی ایک کھڑکی کھلی۔ کسی نے جھانک کر دیکھا اور کھڑکی بند ہوگئی۔ اس کے تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص سامنے آ گیا۔

''کس سے ملنا ہے..... کون ہو تم لوگ؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''ہم مسافر ہیں۔ سر چھپانے کو جگہ چاہئے۔'' طارق نے جواب دیا اور گلے میں پڑا ہوا گنڈا اُنگلیوں میں مسلنے لگا۔ ڈیوڑھی سے آنے والی روشنی میں اُن دونوں کے گلے میں پڑے ہوئے دھاگے کے گنڈے صاف نظر آ رہے تھے۔

''آؤ..... اندر آ جاؤ!'' بوڑھا راستے سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اُن کے اندر داخل ہوتے ہی بوڑھے نے دروازہ بند کر دیا اور اُن کی رہنمائی کرتا ہوا ایک کمرے میں آ گیا۔

''اُس الماری میں کپڑے رکھے ہیں۔ یہ غسل خانہ ہے۔ تم لوگ اپنے حلیے درست کرلو۔ میں کھانا تیار کرتا ہوں۔ بابو محفوظ بھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہوں گے۔'' بوڑھے نے کہا۔

''کھانا ہم کھا چکے ہیں۔ صرف چائے پئیں گے۔'' طارق نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر الماری کھول دی۔

بوڑھا گردن ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ طارق، الماری کی طرف متوجہ ہوگیا جس میں ہینگروں پر مختلف قسم کے مردانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ زیادہ تر پینٹ شرٹس تھیں۔ طارق نے اپنے لئے گرے رنگ کی پینٹ اور چیک کی شرٹ منتخب کی اور باتھ رُوم میں گھس گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے چائے لا کر اُن کے سامنے رکھ دی۔ چائے پیتے ہوئے طارق کی نظریں دیوار گیر کلاک کی طرف اُٹھ گئیں۔ نو بج کر پینتیس منٹ ہو چکے تھے لیکن بابو محفوظ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جبکہ اُس نے نو بجے پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ پندرہ منٹ مزید گزر گئے، پھر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ دو منٹ بعد بابو محفوظ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دونوں اُسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

''معاف کرنا دوستو! مجھے دیر ہوگئی۔'' بابو محفوظ اُن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''گھر سے تو میں ٹھیک وقت پر نکلا تھا۔ لیکن راستے میں ایک کار کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر مجھے محتاط ہو جانا پڑا۔ یہاں پر ہم لوگوں کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ کشمیر میں جب سے تحریک آزادی نے زور پکڑا ہے، اُس وقت سے یہاں رہنے والے کشمیریوں کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ کئی بے گناہوں کو تو پکڑ کر جیلوں میں بند کیا جا چکا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ چند روز سے میری بھی نگرانی ہو رہی ہے۔ آج اُس کار کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر مجھے اپنا راستہ بدلنا پڑا۔ اور اس طرح یہاں

آنے میں دیر ہوگئی۔ بہرحال! تم لوگوں کو یہاں پہنچنے میں کوئی دُشواری تو پیش نہیں آئی؟''

''اگر آپ کی مراد کشمیر سے یہاں تک آنے سے ہے تو آپ جانتے ہیں، کس قسم کی دُشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ ہم غلطی سے امرتسر پہنچ گئے تھے۔ تین دن وہاں پھنسے رہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''اگر ایک زخمی سکھ نوجوان ہمیں نہ مل جاتا تو ہم یا تو فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے یا کسی جیل میں بند ہوتے۔'' وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر امرتسر میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

''آزادی کی ان طوفانی لہروں کو اب نہیں روکا جاسکتا۔ ہندوؤں کو ہمارے حق سے دستبردار ہونا ہی پڑے گا۔'' بابو محفوظ نے کہا۔ اس وقت بوڑھے نے بابو محفوظ کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔ بابو محفوظ نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ عارضی طور پر چند روز اسی مکان میں رہو گے۔ علی شیر کے ہوتے ہوئے تم لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہیں ضرورت کے مطابق رقم بھی ملتی رہے گی۔ فی الحال یہ رکھ لو!'' اُس نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر طارق کے سامنے رکھ دیا۔

''پروگرام کیا ہے؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے بابو محفوظ کی طرف دیکھا۔

''اس کے لئے ابھی چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔ اس دوران تم لوگ آزادی سے کہیں بھی آ جاسکتے ہو۔ لیکن محتاط رہنا پڑے گا۔''

''کیا آپ مشن کے سلسلے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟'' سلیم نے پوچھا۔

''ابھی نہیں.....!'' بابو نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ابھی کچھ تفصیلات طے کرنا باقی ہیں۔ ویسے بھی منصوبے پر عمل کرنے کے لئے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک کی وجہ سے معاملات کچھ اُلجھ گئے ہیں۔ سکھوں کی طرف سے دہلی میں آئے دن مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ سکیورٹی بہت چوکس ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کسی معمولی سی غلطی یا عجلت کے باعث ہمارا منصوبہ ناکام ہو جائے۔''

''لیکن کیا تاخیر سے ہمارا منصوبہ متاثر نہیں ہوگا؟'' طارق نے پوچھا۔

''بالکل نہیں.....'' بابو محفوظ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ہمارا یہ منصوبہ مستقبل کی پلاننگ کے سلسلے میں ہے۔ دو چار روز میں حالات کچھ پُرسکون ہو جائیں تو میں تمہیں بتا دُوں گا۔''

''ٹھیک ہے.....'' طارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

وہ لوگ کچھ دیر تک کشمیر کی صورتحال پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر بابو محفوظ رُخصت ہوگیا۔ بابو محفوظ کے جانے کے بعد وہ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر اپنے اپنے کمروں میں

چلے گئے۔ شیر علی نے پہلے ہی اُنہیں بتا دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ایک ہی کمرے میں سو جائیں اور چاہیں تو الگ الگ کمروں میں۔

تین دن گزر گئے۔ اس دوران وہ بہت کم گھر سے نکلے تھے۔ اُس رات آٹھ بجے کے قریب شیر علی نے بتایا کہ بابو محفوظ فون پر اُن سے بات کرنا چاہتا ہے۔ طارق، ٹیلی فون والے کمرے میں آگیا۔ فون کا ریسیور الگ رکھا ہوا تھا۔ طارق نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''یس.....طارق بول رہا ہوں۔'' وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

''تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے.....؟'' ریسیور پر آواز اُبھری۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....تم دونوں رات دس بجے ہوٹل اوبیرائے پہنچ جاؤ۔ میں کرسٹل بال رُوم میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' ریسیور پر کہا گیا۔

''ہوٹل اوبیرائے.....؟''

''کسی بھی ٹیکسی والے کو نام بتاؤ گے تو وہ تمہیں اوبیرائے پہنچا دے گا۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور لائن بے جان ہوگئی۔

طارق نے ریسیور رکھ دیا اور سلیم والے کمرے میں آ گیا۔ شیر علی بھی وہیں موجود تھا۔ اُس نے سلیم کو بتایا کہ بابو محفوظ نے دس بجے اُنہیں ہوٹل اوبیرائے میں بلایا ہے۔ اور پھر وہ شیر علی سے اوبیرائے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

وہ ٹھیک دس بجے اوبیرائے پہنچ گئے۔ ہوٹل کی رونق اس وقت عروج پر تھی۔ بال رُوم کی تمام ہی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ سامنے سٹیج پر نیم عریاں لباس میں ایک رقاصہ ہیجان خیز موسیقی کی دُھن پر رقص کر رہی تھی۔

طارق اور سلیم، کرسٹل بال رُوم میں داخل ہو کر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن بابو محفوظ کا چہرہ اُنہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ اُسے تلاش ہی کر رہے تھے کہ بائیں طرف کی میز پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی اُٹھ کر اُن کی طرف آنے لگی۔ پہلے اُن کا خیال تھا کہ وہ لڑکی باہر جا رہی ہے۔ لیکن وہ دروازے کی طرف بڑھنے کی بجائے سیدھی اُن کی طرف آنے لگی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ طارق کے اندازے کے مطابق اُس کی عمر اکیس بائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ماتھے پر چمکتی ہوئی بندیا اُسے ہندو گھرانے کا فرد ظاہر کر رہی تھی۔

''نمسکار.....!'' اُس نے قریب پہنچ کر باری باری اُن دونوں کو پرنام کیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''اگر میں نے غلط نہیں پہچانا تو آپ مسٹر طارق اور

مسٹر سلیم ہیں۔ میں یہاں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔''

''ہمارا انتظار.....؟'' طارق نے کہا۔ اُس نے حیرت سے سلیم کی طرف دیکھا۔ پھر اُس لڑ
کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ہمارے نام تو وہی ہیں، جو آپ نے بتائے ہیں دیوی جی۔ لیکن آپ
یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو آپ کو بالکل نہیں جانتے بلکہ کسی کو بھی نہیں جانتے۔ دہلی میں بالکل
اجنبی ہیں۔ بھلا آپ کو ہمارا انتظار کیوں ہونے لگا؟''

''آپ دوسروں کے لئے اجنبی ضرور ہیں۔ لیکن میرے لئے نہیں۔'' لڑکی نے کہا۔ بابو محفوظ
نے مجھے آپ کے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اسی لئے تو میں نے آپ کو پہچاننے میں
ذرا بھی غلطی نہیں کی۔''

''بابو محفوظ.....!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''جی ہاں..... وہ کسی وجہ سے کرسٹل بال رُوم میں نہیں آ سکے۔ مجھے اسی لئے یہاں بٹھایا گیا
تھا تاکہ آپ کو اُن تک پہنچا دُوں۔ ویسے میرا نام بملا ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔''

''لیکن آپ کے ساتھ.....'' طارق نے اُس میز کی طرف دیکھا، جہاں سے بملا اُٹھ کر آئی
تھی۔ میز پر ایک لڑکی اور دو آدمی نظر آ رہے تھے۔ چہرہ صرف ایک آدمی کا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ
سیاہ سوٹ میں تھا اور دائیں کان کی لو سے رُخسار کی طرف تقریباً دو اِنچ لمبا گہرے زخم کا پرانا
نشان نظر آ رہا تھا۔

''وہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔'' بملا نے جواب دیا۔ ''میں اُس میز پر اکیلی بیٹھی تھی۔ باقی
سیٹیں خالی دیکھ کر یہ لوگ بیٹھ گئے۔''

''کیا خیال ہے.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔

''مجبوری ہے۔ اسی کے ساتھ چلو۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''آیئے!'' بملا نے دروازے کی طرف اِشارہ کیا۔ ''باہر میری گاڑی موجود ہے۔ ہمیں
وہاں پہنچنے میں بھی آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔''

وہ دونوں بملا کے ساتھ پارکنگ میں آ گئے۔ بملا سیاہ رنگ کی ایک سیڈان کے قریب رُک
گئی۔ اُس نے ہینڈ بیگ میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی سے سٹیئرنگ سائیڈ کا دروازہ
کھولا اور اندر بیٹھ کر پچھلی نشست کا دروازہ ان لاک کر دیا۔ بملا نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ اُن
کے بیٹھتے ہی گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔

☆

وہ دونوں کھڑکیوں سے باہر دیکھتے رہے۔ اور گاڑی شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ بملا
ڈرائیونگ کرتے ہوئے بار بار عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد
اُس نے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ اُن سے دریافت کر رہی تھی کہ کشمیر سے کب آئے اور
یہاں اُن کا مشن کیا ہے؟ طارق اُسے صحیح بات بتانا چاہتا تھا۔ لیکن دفعتہً اُس کے ذہن میں خیال
آیا کہ بملا ہندو ہے۔ وہ بابو محفوظ کی کوئی جاننے والی تو ہو سکتی ہے، لیکن راز داں نہیں۔ کسی مجبوری
کے تحت بابو محفوظ نے اُسے یہاں بھیج دیا ہو گا کہ اُن دونوں کو ساتھ لے آئے۔ لیکن اس کا یہ
مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ کچھ اور بھی جانتی ہو۔

''کشمیر سے آئے ہوئے تو تین چار دن ہو چکے ہیں۔ لیکن تمہاری مشن والی بات ہماری سمجھ
میں نہیں آ سکی۔'' طارق نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی سلیم کو کہنی مار کر زبان بند رکھنے کا
اشارہ کر دیا تھا۔

''ارے..... اُنہوں نے تمہیں مشن کے بارے میں نہیں بتایا؟'' بملا نے حیرت کا اظہار کیا۔

''نہیں..... ہم کسی مشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''حیرت ہے.....'' بملا بولی۔ ''اوہ! تم لوگ شاید مجھے اس لئے کچھ بتانا نہیں چاہتے کہ میں
ہندو ہوں۔ لیکن تم لوگ یہ بھی جانتے ہو گے کہ ہر ملک میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں،
جنہیں اپنی حکومت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف ہوتا ہے۔ یہاں میں اپنی مثال دے سکتی
ہوں۔ مجھے بھارتی حکومت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ حقدار کو اُس
کا حق ملنا چاہئے۔ کشمیر کے مسلمان برصغیر کی تقسیم کے وقت سے ہی کشمیر میں حق خود ارادیت کا
مطالبہ کر رہے ہیں۔ تاکہ وہ اپنا یہ فیصلہ سنا سکیں کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا
پاکستان کے ساتھ یا خود مختار ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں؟ ویسے میں سمجھتی ہوں کہ کشمیری مسلمان
بارہا مرتبہ اپنا یہ فیصلہ سنا چکے ہیں۔ اسی طرح سکھ آزاد خالصتان ریاست کے قیام کا مطالبہ کر
رہے ہیں۔ یہ اُن کا حق ہے۔ ہر قوم اپنے مذہب، تہذیب و تمدن اور اپنے کلچر کا تحفظ چاہتی
ہے۔ یہ اُس کا حق ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اُنہیں یہ حق ملنا چاہئے۔ میرا یہ نظریہ ہی مجھے بابو

محفوظ کے قریب لے آیا تھا۔ میں بہت عرصہ سے بابو محفوظ کے ساتھ ہوں۔ وہ اپنی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتے۔'

''تو پھر آپ کو اُس مشن کے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہئے تھا، جس کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے۔'' سلیم نے کہا۔

''چند روز پہلے اُنہوں نے تذکرہ کیا تھا۔ مگر اس سلسلے میں تفصیل سے گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ اس مشن کی تکمیل کے لئے چند آدمی آنے والے ہیں۔''

''ہمیں اس مشن کے سلسلے میں کچھ علم نہیں۔ اور نہ ہی ہم اس سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ ہم تو روزگار کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔'' طارق نے جواب دیا اور باہر دیکھنے لگا۔

سیڈان، انڈیا گیٹ کے قریب سے گھوم کر متھرا روڈ پر آ گئی۔ یہ سڑک شہر کے نواح سے گزر کر متھرا اور آگرہ کی طرف چلی گئی تھی۔ لیکن کچھ ہی آگے جانے کے بعد گاڑی دریائے جمنا کی طرف جانے والی ایک ذیلی سڑک پر مُڑ گئی۔ اُس سڑک پر آگے جا کر شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ تھا۔ ایک سڑک، مقبرے کے اُوپر سے گھوم کر جمنا کی طرف چلی گئی تھی۔ اور سیڈان اُسی سڑک پر جا رہی تھی۔

''یہ تم ہمیں کہاں لے جا رہی ہو.....؟'' سلیم نے چونک کر پوچھا۔

''بابو محفوظ کے پاس۔'' بملا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بابو محفوظ کے اوبیرائے نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ سکیورٹی والوں کی نظروں میں آ چکا ہے۔ وہ اس وقت ایک نہایت محفوظ مقام پر ہے۔''

سلیم خاموش ہو گیا۔ دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ باہر تاریکی تھی۔ کہیں کہیں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ سیڈان کی رفتار کم ہونے لگی۔ اور آخر کار وہ ریا کے قریب ایک کھنڈر نما عمارت میں داخل ہو کر رُک گئی۔ بملا نے کار کا انجن بند کر دیا۔ وہ دونوں بھی بملا کے ساتھ کار سے اُتر آئے۔ عمارت کے سامنے ایک وسیع برآمدہ تھا۔ سرخ اینٹوں کی سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ یہ عمارت بھی غالباً شہنشاہ ہمایوں کے دور کی تھی۔ جو اندھیرا ہونے کے باوجود خاصی شکستہ دکھائی دے رہی تھی۔

برآمدہ عبور کرنے کے بعد وہ ایک غلام گردش میں داخل ہو گئے۔ غلام گردش کا فرش ٹوٹا ہوا تھا۔ اُن دونوں کو بار بار ٹھوکر لگ رہی تھی۔ لیکن بملا اُن کے آگے آگے تاریکی میں اس طرح چل رہی تھی جیسے یہ راستہ اُس کا دیکھا بھالا ہو۔

طارق اور سلیم کے دلوں میں وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ طارق سوچ رہا تھا کہ اُن کے ساتھ

دھوکہ تو نہیں کیا جا رہا تھا؟ اُس نے سلیم کو کہنی مار کر محتاط رہنے کا اشارہ کیا اور تاریکی میں بملا کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ آخر کار بملا ایک دروازے کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے مُڑ کر اُن دونوں کی طرف دیکھا اور چوبی دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال دیا۔ بھاری چوبی دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ چرچراہٹ کی اُس آواز نے تاریکی اور سناٹے میں بڑا پراسرار تاثر پیدا کیا تھا۔

کمرے میں بھی گہری تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی میں کسی کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ طارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ واقعی کسی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اُس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''ہوشیار رہنا سلیم! مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے آہستگی سے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔

''یہ تو کوئی کھنڈر لگتا ہے۔ تم ہمیں کہاں لے آئی ہو بملا؟'' طارق نے کہا۔

''یہ عمارت واقعی کھنڈر ہے۔ بابو محفوظ یہیں ہے۔ ابھی تمہارے سامنے آ جائے گا۔'' بملا نے جواب دیا اور پھر قدرے بلند آواز میں پکارا۔ ''بابو محفوظ..... میں ہوں، بملا۔ تمہارے دوستوں کو لے آئی ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ایک دم روشنی ہو جانے سے اُن کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن چند سیکنڈ بعد اُن کی آنکھیں، روشنی سے مانوس ہوئیں تو اس کے ساتھ ہی اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے.....

کمرہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ روشنی کا انتظام عارضی طور پر کیا گیا تھا۔ دائیں طرف والی دیواروں کے ساتھ کم از کم ایک درجن ایسے آدمی کھڑے تھے، جن کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ اور رائفلوں کا رُخ اُنہی کی طرف تھا..... اور سب سے زیادہ خوف ناک حقیقت یہ تھی کہ کمرے کے وسط میں کرسی پر بابو محفوظ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیر کرسی سے بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا.....

طارق نے بملا کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ اور وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے اُن سے ڈور ہٹ رہی تھی۔

''یہ رہا تمہارا بابو محفوظ۔ اس سے مل کر تمہیں یقیناً خوشی ہوئی ہو گی۔'' بملا نے دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک گن مین کے قریب رُکتے ہوئے کہا۔

''حرامزادی..... کتیا.....'' سلیم چیخا۔ ''تم دھوکے سے ہمیں یہاں لے کر آئی ہو۔ آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو.....؟''

''ثابت تو ہو چکا۔'' بملا معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''بابو محفوظ کا نام تمہیں یہاں کھینچ لایا۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ تم دونوں بھی بابو محفوظ کے ساتھی ہو؟ اور بابو محفوظ اس ملک کا غدار ہے۔ اس کا تعلق کشمیریوں کے ایک ایسے گروہ سے ہے، جو ریاست میں بھارتی حکومت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہیں اور تحریک آزادی کے نام پر حکومت کے خلاف تخریبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس گروہ نے بھارتی حکومت کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا ہے۔ دہلی میں اس سازش کا سرغنہ یہ بابو محفوظ ہے۔ ہمیں اس سازش کا پتہ اُسی وقت چل گیا تھا جب دو ماہ پہلے بابو محفوظ سرینگر گیا تھا۔ ہماری اطلاع کے مطابق دو تربیت یافتہ کشمیری گوریلے اس مشن کی تکمیل کے لئے دہلی آنے والے تھے۔ ظاہر ہے، وہ کشمیری گوریلے یہاں پہنچ کر بابو محفوظ سے رابطہ قائم کرتے اور اُس کی ہدایات پر عمل کرتے۔ ہم نے بابو محفوظ کی نگرانی جاری رکھی۔ تم دونوں کے بارے میں ہمیں اُسی روز پتہ چل گیا تھا، جب تم دونوں نے مزدوروں کے بھیس میں اُس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد اُس مکان کی بھی نگرانی ہوتی رہی، جس میں تم لوگ قیام پذیر تھے۔ اُس مکان کی نگرانی چوبیس گھنٹے ہو رہی تھی۔ ممکن ہے، ہم لوگ کچھ روز اور انتظار کرتے۔ لیکن آج شام بابو محفوظ کو ہمارے ایک آدمی پر شبہ ہو گیا۔ ہمارا وہ آدمی اُس کے منیم کی حیثیت سے اُس کے پاس کام کر رہا تھا۔ اُس پر شبہ ہوتے ہی بابو محفوظ نے اُسے شام کو اپنے گھر بلا لیا اور اُسے قتل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن منیم کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں ایک ننھا سا لیکن نہایت طاقتور ٹرانسمیٹر پوشیدہ تھا۔ بابو محفوظ کی نیت بھانپ کر منیم نے موقع پاتے ہی ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔ اس طرح ان کی گفتگو ہمارے ہیڈ کوارٹر میں سنی جانے لگی۔ بابو محفوظ کو یقین ہو چکا تھا کہ منیم اب اُس کے گھر سے زندہ نہیں نکل سکے گا۔ اُس نے کچھ ایسی باتیں بھی کہہ ڈالیں جس سے ہمیں نہ صرف یہ پتہ چل گیا کہ دو ایک روز میں سازش پر عمل ہونے والا ہے۔ بلکہ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ منیم کو قتل کرنے والا ہے۔ ہیڈ کوارٹر نے فوراً ہی اپنے اُن آدمیوں کو مطلع کر دیا جو بابو محفوظ کے گھر کے آس پاس تعینات تھے۔ اُنہوں نے مکان پر ریڈ کر دیا۔ بابو محفوظ نے فرار ہونے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر ہم چاہتے تو دوسرے مکان پر ریڈ کر کے تم لوگوں کو بھی گرفتار کر سکتے تھے۔ لیکن ہم نہ تو جنتا میں خوف و ہراس پھیلانا چاہتے تھے اور نہ ہی اس واقعے کی تشہیر کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ایک اور منصوبہ تیار کیا گیا۔ بابو محفوظ کی آواز میں تمہیں فون پر اطلاع دی گئی کہ وہ دس بجے اوبیرائے میں تم دونوں کا انتظار کرے گا۔ وہاں میں تمہاری منتظر

بیٹھی تھی۔ اس کے بعد تو تم لوگ جانتے ہی ہو کہ کس طرح کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے ہو۔ سچ کہا ہے کسی نے، حسن و شباب میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

''ہم تھوکتے ہیں تمہارے حسن و شباب پر۔'' طارق نے نفرت سے کہا۔ ''ویسے تم نے بڑی دلچسپ کہانی سنائی ہے۔ لیکن اس کہانی میں ہم دونوں کہیں بھی فٹ نہیں ہوتے۔''

''اگر تم لوگ اس کہانی میں فٹ نہ ہوتے تو تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا جاتا۔ لیکن یہ تم لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ یہ حقیقت ہم پر کھل چکی ہے کہ تم دونوں اس کہانی کے اہم ترین کردار ہو۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اپنا گھناؤنا رول ادا کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔'' بملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہمارا اس کہانی میں کوئی رول نہیں ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''ہم تو روزگار کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ بابو محفوظ ہمارے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس لئے یہاں آتے ہی ہم نے اُس سے رابطہ قائم کیا تاکہ رہنے کا کوئی ٹھکانہ تو مل سکے۔ اور اس کے ذریعے روزگار کا کوئی بندوبست ہو سکے۔''

''اگر یہ بتا دو کہ تم لوگ یہاں کس مشن پر آئے ہو تو شاید.....''

''ہم کسی مشن کے بارے میں نہیں جانتے۔'' طارق نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''میں چاہتی تھی کہ تم لوگوں پر کوئی سختی نہ ہو۔ لیکن مجبوری ہے۔ رتو مل کو زحمت دینا ہی پڑے گی۔ وہ زبان کھلوانے کے جدید ترین طریقے جانتا ہے۔'' بملا نے یہ کہتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

اُس طرف دیوار کے قریب ہی ایک سٹینڈ پر سرچ لائٹ لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی اُسی لائٹ کی تھی۔ اُس کے پیچھے تاریکی تھی۔ دُور کہیں سے پھٹ پھٹ کی ہلکی سی آواز بھی اُبھر رہی تھی۔ یہ شاید جنریٹر کی آواز تھی۔ بملا کا اشارہ پا کر ایک دیو قامت آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اُس کا قد کسی طرح بھی ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ فری سٹائل ریسلر کی طرح بھاری بھرکم جسم پر صرف پتلون تھی جس پر چوڑی بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ سینہ ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ گنجے سر پر قدرے دائیں طرف تقریباً ایک بالشت لمبی چٹیا لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا طارق کے سامنے آ کر رُک گیا اور سرخ آنکھوں سے اُسے اُوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔

''کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو بالک!'' اُس نے طارق کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ''دیوی جی جو کچھ پوچھ رہی ہیں، بتا کیوں نہیں دیتے؟''

''جب ہم کچھ جانتے ہی نہیں تو.....''

''میں تمہاری زبان سے وہ نکالنا جانتا ہوں جو دیوی جی سننا چاہتی ہیں۔'' دیو قامت رتو مل نے کہتے ہوئے اُسے سر کے بالوں سے پکڑ لیا۔ اُس نے اس طرح جھٹکا دیا کہ طارق اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گھوم گیا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ رتو مل نے ایک ہاتھ اُس کی گردن پر رکھا اور دوسرا کمر پر جما دیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے طارق کو اپنے ہاتھوں پر سر سے اُوپر اُٹھا لیا اور گھما کر پوری قوت سے ایک طرف اُچھال دیا۔ طارق بھد کی آواز سے سرچ لائٹ والے سٹینڈ کے قریب گرا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اچھی خاصی چوٹ آنے کے باوجود اُس نے اپنے حواس قائم رکھے تھے۔ اُس نے رتو مل کو سلیم کی جانب بڑھے دیکھا تو بڑی پھرتی سے کام لیتے ہوئے اپنی جگہ سے لیٹے ہی لیٹے لوٹ لگائی۔ اُس کا ایک پیر، پوری قوت سے سرچ لائٹ والے سٹینڈ پر لگا۔ سٹینڈ اُلٹ گیا۔ لائٹ نیچے گرتے ہی چکنا چور ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی۔ سٹینڈ کو لات مارنے کے بعد طارق اپنی جگہ پر رُکا نہیں۔ وہ لوٹ لگاتا ہوا وہاں سے کئی فٹ دُور نکل گیا تھا۔ یہ پھرتی اُس کے کام آ گئی تھی۔ اگر وہ اپنی جگہ پر رہتا تو اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ تاریکی ہوتے ہی کئی رائفلیں بیک وقت چلا اُٹھی تھیں۔

کمرے میں بملا کی چیخ کے ساتھ ہی گن مینوں کا شور اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''پکڑو..... جانے نہ پائیں۔ دروازہ کور کرو۔ جلدی..... بھاگو!'' بملا چیخ چیخ کر تاریکی میں اپنے آدمیوں کو احکامات جاری کر رہی تھی۔ اور اُس کے آدمی، بدحواسی میں، تاریکی میں دوڑتے ہوئے آپس ہی میں ٹکرا رہے تھے۔ بعض نے ایک دوسرے کو سلیم یا طارق سمجھ کر گرفت میں لے کر ایک دوسرے کی پٹائی بھی کر ڈالی تھی۔ لیکن پھر ایک دوسرے کی آواز پہچان کر چھوڑ دیا تھا۔

جس وقت لائٹ والا سٹینڈ گرا، اُس وقت دیو قامت رتو مل کا ہاتھ، سلیم کی گردن سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اُس کی گردن گرفت میں لینا ہی چاہتا تھا کہ تاریکی پھیل گئی۔ سلیم بڑی پھرتی سے نیچے جھک کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اُس نے دروازے کی طرف بڑھنے کی حماقت نہیں کی تھی بلکہ وہ اُچھل کر دیوار کے ساتھ جا لگا اور آہستہ آہستہ سرکتا ہوا اُس طرف بڑھنے لگا جس طرف بملا کھڑی تھی۔ اب تک کی صورتحال سے سلیم کو یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی تھی کہ ان لوگوں کا تعلق انٹیلی جنس سے تھا۔ اور بملا ہی اس پارٹی کی لیڈر ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ اُس کے اندازے کے مطابق اب تک آٹھ آدمی دوڑتے

ہوئے دروازے کے راستے باہر نکل چکے تھے اور باقی چار ابھی تک کمرے میں تھے جو چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو اپنی موجودگی سے آگاہ کر رہے تھے۔

''پچھلی کھڑکی کا خیال رکھنا۔ وہ اس طرف سے نکلنے کی کوشش نہ کریں۔'' تاریکی میں بملا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

سلیم اپنی جگہ پر رُک گیا۔ بملا کی آواز اُس کے بائیں طرف چند فٹ کے فاصلے پر اُبھری تھی۔ وہ تاریکی میں چاروں طرف گھورنے لگا۔ ایک جگہ اُسے نہایت مدھم سا اُجالا محسوس ہوا۔ وہ غالباً کھڑکی تھی جہاں سے ستاروں کا یہ اُجالا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کافی اُونچی تھی۔ اگر نیچے ہوتی تو یقیناً باہر کی روشنیاں بھی دکھائی دے جاتیں۔ اس کمرے سے باہر بھی شور اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بملا کے آدمی اُنہیں باہر کھنڈر میں تلاش کر رہے تھے۔ بملا نے ایک بار پھر چیخ کر اپنے کسی آدمی کو ٹارچ جلانے کا حکم دیا۔ سلیم اُس وقت بملا کے پیچھے صرف تین قدم کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔

طارق، دیوار کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ ستاروں کی روشنی کے پس منظر میں کھڑکی کا ہیولا اُس نے بھی دیکھ لیا تھا اور وہ غیر محسوس انداز میں رینگتا ہوا اُسی طرف بڑھ رہا تھا۔ کھڑکی میں کوئی چوکھٹ یا فریم وغیرہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کھڑکی تک پہنچ جائے تو اُچھل کر آسانی سے باہر نکل سکے گا۔ سلیم کے بارے میں اُسے پریشانی نہیں تھی۔ سلیم اس دروازے کے قریب تھا۔ اور اُسے یقین تھا کہ وہ کمرے سے نکل چکا ہوگا۔

طارق رینگتا ہوا کھڑکی سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ اُسی وقت بملا کی آواز سنائی دی، جس نے اپنے آدمیوں کو کھڑکی کی نگرانی کا حکم دیا تھا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد اُس نے ایک ہیولے کو کھڑکی کے قریب دیکھ لیا۔ طارق نہایت محتاط انداز میں رینگتا ہوا کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ اُس ہیولے سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اُس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ اور پھر دفعتہً وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور اُس ہیولے کی ٹانگوں سے ٹکرا گیا۔

وہ آدمی اپنے قریب طارق کی موجودگی سے قطعی بے خبر تھا۔ اور جب طارق اُس کی ٹانگوں سے ٹکرایا تو اُس آدمی کے منہ سے نہ صرف چیخ نکل گئی بلکہ بدحواسی میں رائفل کا ٹرائیگر بھی دب گیا۔ کمرہ فائر کی آواز سے گونج اُٹھا۔

طارق بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور اُس شخص کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پیچھے سے اُس کی گردن پر چوک ہولڈ لگا دیا۔ اُس شخص کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی گردن آہنی شکنجے میں کسی جا رہی ہو۔ طارق کے بازو کی ہڈی کا دباؤ اُس کے نرخرے پر بڑھتا جا

۔ہا تھا۔ رائفل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر چکی تھی۔ اُس کی چیخ اور فائر کے جواب میں کمرے میں موجود اُس کے ایک اور ساتھی نے کھڑکی کی طرف فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گولیاں سنسناہٹ کی آواز پیدا کرتی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل گئیں۔ ایک گولی، طارق کے سر سے چند انچ اُوپر دیوار میں پیوست ہوگئی۔

اُسی لمحے بملا کی چیخ سنائی دی۔ سلیم نے موقع پا کر بملا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اُس نے بھی پشت سے بملا کی گردن پر چوک ہولڈ لگایا تھا۔ بملا کی چیخ بھی حلق میں دب کر رہ گئی تھی۔

''کیا ہوا بملا جی! کیا بات ہے.....؟'' تاریکی میں اُس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

''تمہاری بملا دیوی میرے قبضے میں ہے۔ اگر کسی نے فائر کیا تو اُس کی گردن مروڑ دُوں گا۔'' سلیم نے چیخ کر کہا۔ پھر بملا سے مخاطب ہوا۔ ''اِن سے کہو، ہتھیار پھینک دیں۔ بصورتِ دیگر یہ کھنڈر تمہارا مقبرہ بن جائے گا۔''

''بیرو، پرمانند، دُرگا! تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو، ہتھیار پھینک دو۔'' بملا کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

کمرے میں تین رائفلیں پھینکے جانے کی آواز سنائی دی۔ چوتھا آدمی طارق کے شکنجے میں تھا۔ طارق نے اُسے ایک طرف دھکیل کر بڑی پھرتی سے زمین سے اُس کی رائفل اُٹھالی۔

''طارق! کہاں ہو تم..... کیا تم کمرے میں موجود ہو؟'' سلیم نے آواز لگائی۔

''میں یہاں ہوں..... کھڑکی کے پاس۔ ایک رائفل میرے قبضے میں آ چکی ہے۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا اور دوڑ کر سلیم کے پاس پہنچ گیا۔

''کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے.....'' طارق نے چیخ کر کہا اور اس کے ساتھ ہی چھت کی طرف فائر کر دیا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ سلیم نے بدستور بملا کو دبوچ رکھا تھا۔ اُس کے پیچھے طارق تھا جو رائفل سنبھالے اُس سے پیٹھ ملائے اُلٹے قدموں چل رہا تھا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو کہ جہاں ہیں، وہیں کھڑے رہیں۔ اگر کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہاری گردن مروڑ دُوں گا۔'' سلیم نے بملا سے کہا۔

بملا نے چیخ کر ایک بار پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑے رہیں۔ وہ بملا کی آڑ میں تاریک غلام گردش میں چلتے رہے۔ تاریکی میں اُن پر کسی طرف سے بھی حملہ ہو سکتا تھا۔ لیکن بملا، اُن کے قبضے میں تھی اور اُنہیں اُمید تھی کہ بملا کے آدمی

کوئی حماقت کر کے اُس کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔

''بابو محفوظ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے.....؟'' طارق نے چلتے چلتے سلیم سے پوچھا۔

''تم نے شاید اچھی طرح نہیں دیکھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اُسے ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ بابو محفوظ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ کیونکہ بملا ہمارے قبضے میں ہے۔'' سلیم نے جواب دیا۔ وہ عمارت سے باہر نکل کر سیڈان کے قریب پہنچ گئے۔ سلیم تو بملا کو لے کر پچھلی سیٹ میں دھنس گیا۔ اُس نے بملا کو اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔ جبکہ طارق سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ کار سٹارٹ ہونے کی آواز تاریک سناٹے میں دُور تک پھیل گئی تھی۔ طارق نے اُسے ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ کھنڈر سے نکلنے کے بعد تقریباً پچاس گز کا کچا راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک نیم کشادہ پختہ سڑک پر آ گئے۔ بملا کے آدمیوں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا جس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ بملا اُن کے لئے خاصی اہم تھی۔ اور وہ اُس کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

''کہاں چلنا ہے.....؟'' سلیم نے پوچھا۔

''دہلی میں میرا ایک دوست بھی رہتا ہے۔ کالج میں وہ میرے ساتھ سرینگر میں پڑھتا تھا۔ تعلیم ختم کر کے وہ دہلی آ گیا۔ یہاں اُس نے چھوٹا سا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ ایک سال پہلے تک ہم میں خط و کتابت تھی، پھر یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مجھے اُس کے مکان کا پتہ یاد ہے۔ ہم وہیں چل رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس حسینہ کے ذہن سے یہ بات نکالنا ضروری ہے کہ بابو محفوظ یا اس کے کسی خفیہ مشن سے ہمارا کوئی تعلق ہے۔ ہم تو یہاں روزگار کی تلاش میں آئے ہیں اور بابو محفوظ کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اُس سے رابطہ قائم کیا تھا۔'' طارق نے جواب دیا اور گاڑی ایک اور سڑک پر موڑ دی۔ ''تم اسے ذرا نیچے دبائے رکھو! تاکہ یہ راستہ نہ دیکھ سکے۔''

''اگر راستے میں پولیس نے روک لیا تو کیا ہوگا؟ یہ تو ہمیں پھنسا دے گی۔'' سلیم بولا۔

''یہ ایسا نہیں کرے گی۔'' طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر پولیس کی کسی گشتی پارٹی سے سامنا ہو بھی گیا تو نمٹ لیں گے۔''

''کھنڈر میں اس کے آدمیوں کے پاس ٹرانسمیٹر وغیرہ ضرور ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمارے فرار کی اطلاع پولیس کو مل چکی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ پورے شہر کی پولیس چوکس ہو گئی ہوگی۔'' سلیم نے ایک اور خدشے کا اِظہار کیا۔

''ایسی صورت میں یہ ناگن حسینہ ہماری ڈھال کا کام دے گی۔'' طارق مسکرایا۔

سیڈان، ہمایوں کے مقبرے کے اُوپر سے گھوم کر متعدد سڑکیں عبور کر کے لودھی روڈ پر آ گئی۔

صفدر جنگ کے مقبرے کے قریب وہ ریس کورس کی طرف جانے والی سڑک پر مُڑ گئے۔ اُس سڑک پر اُنہوں نے ابھی صرف دو فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک موڑ پر اچانک ہی ایک بھاری ٹرک سامنے آ گیا..... ٹرک کی رفتار خاصی تیز تھی۔ طارق نے سیڈان کو سائیڈ پر لینے کی کوشش کی مگر ٹرک، سر پر پہنچ چکا تھا۔ ٹرک نے سیڈان کے پچھلے حصے کو ٹکر ماری۔ سیڈان لہراتی ہوئی سڑک سے اُتر کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔

طارق کا سر، ونڈ سکرین سے ٹکرایا۔ اُسے اپنی پیشانی پر گرم سیال سا بہتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے چھو کر دیکھا۔ شیشہ لگنے سے اُس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ سلیم سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور بملا اُس کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آگے والی پسنجر زسیٹ پیچھے کی طرف جھک گئی تھی۔ سلیم تو کسی نہ کسی طرح نکل آیا۔ لیکن بملا پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ بے حس و حرکت تھی۔ سلیم نے اُسے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ٹرک رُکا نہیں تھا۔ طارق بڑی مشکل سے دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

''یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔'' سلیم نے کہا۔

''لعنت بھیجو اس پر..... باہر آ جاؤ! ہمیں کم از کم ایک میل اور آگے جانا ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

سلیم بھی باہر آ گیا۔ وہ دونوں ایک طرف دوڑنے لگے۔ وہ کم سے کم وقت میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دُور نکل جانا چاہتے تھے۔ رات آدھی بیت چکی تھی۔ اور اگر واقعی اُن کی تلاش شروع ہو چکی تھی تو وہ کسی بھی وقت گھیرے میں آ سکتے تھے۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ریس کورس کے قریب ایک چھوٹی سی سڑک پر مُڑ گئے۔ یہ دولت مند طبقے کا علاقہ تھا اور یہاں عالیشان بنگلے بنے ہوئے تھے۔

یہ سڑک ویران تھی۔ اس قسم کے علاقے عام طور پر رات نو دس بجے کے بعد ویران ہو جاتے ہیں۔ دولت مندوں کو زیادہ خوف رہتا ہے۔ وہ جلد ہی گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس وقت تو یوں بھی رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ طارق، بنگلوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کی پیشانی سے خون رِس رہا تھا جسے وہ بار بار رُومال سے پونچھ رہا تھا۔

''تم اس طرف کبھی آئے ہی نہیں، بنگلے تک کیسے پہنچو گے؟'' سلیم نے پوچھا۔

''تمہیں یاد ہوگا کہ پرسوں میں نے ٹیلی فون پر پانڈے نامی ایک شخص سے بات کی تھی۔'' طارق نے کہا۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مگر وہ تو ہندو ہے، ہمیں کیسے پناہ دے گا؟'' سلیم بولا۔

''جب مجھے اس مشن پر جانے کے احکامات ملے تھے تو دو تین ایسے ٹھکانوں کا پتہ سمجھا دیا گیا تھا، جہاں ہم ہنگامی صورتِ حال میں پناہ لے سکیں۔ بابو محفوظ ہمارا پہلا رابطہ تھا۔ اس مشن کے بارے میں اُسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ اُسے بھی کسی اور سے ہدایات لینی تھیں۔ وہ شخص کون ہے؟ اور مشن کیا ہے؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ لیکن بہر حال! مجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ کسی ہنگامی صورت حال کے تحت کہاں کہاں پناہ لی جا سکتی ہے؟ اور پانڈے اُن میں سے ایک ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''لیکن میرا سوال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ ایک ہندو اپنی قوم کے خلاف ہماری مدد کیونکر کرے گا؟'' سلیم کے لہجے میں اب بھی اُلجھن تھی۔

''غدار ہر قوم میں ہوتے ہیں۔'' طارق نے کہا۔ ''بعض لوگ دولت کے لالچ میں غداری کرتے ہیں اور بعض لوگ کسی مجبوری کے تحت۔ پانڈے، دولت کے لالچ میں نہیں، ایک مجبوری کے تحت ہماری مدد کرے گا۔ اور اُس کی مجبوری یہ ہے کہ اُس کی بیوی اور بچے سرینگر سے چند میل کے فاصلے پر گل مرگ میں رہائش پذیر ہیں۔ پانڈے کشمیری ہندو ہے اور گل مرگ کا رہنے والا ہے۔ گل مرگ میں اگرچہ اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن پانڈے اس علاقے کا سب سے دولت مند شخص ہے۔ مسلمانوں کا خون چوس چوس کر اُس نے بے پناہ دولت جمع کر رکھی ہے۔ ایک سال پہلے وہ دہلی آیا۔ یہاں بھی اس کا اپنا کاروبار ہے۔ وہ یہاں آ کر کاروبار میں اس قدر اُلجھا کہ واپس جانے کا موقع نہ ملا۔ اس دوران وادی کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ نہ وہ خود گل مرگ جا سکا اور نہ اپنے بیوی بچوں کو یہاں بلا سکا۔ چند ماہ پہلے ہماری تنظیم نے پانڈے سے رابطہ قائم کیا اور اُس سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ دہلی میں وقتاً فوقتاً ہمارے آدمیوں کی مدد کرتا رہے تو گل مرگ میں اُس کے بیوی بچوں کی حفاظت کی جائے گی اور اُنہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ بصورتِ دیگر اُس کے کنبے کے افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ دو ماہ پہلے پانڈے کے بیوی بچوں کو گل مرگ سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا اور پانڈے کو اس کی اطلاع دے دی گئی۔ اس وقت غالباً اس مشن کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ پانڈے کے بیوی بچوں کی گل مرگ سے کہیں اور جگہ منتقلی کا مقصد پانڈے پر دباؤ بڑھانا تھا تاکہ وہ کوئی گڑبڑ نہ کر سکے۔''

''لیکن کار میں اس طرف آتے ہوئے تو تم نے کہا تھا کہ تمہارا کوئی دوست ہے، جس کے ہاں جانا چاہتے ہو۔'' سلیم نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''اُس وقت ہمارے ساتھ بملا تھی۔ بملا انٹیلی جنس کی آفیسر ہے اور اُس کی موجودگی میں

پانڈے کا نام نہیں لیا جا سکتا تھا۔'' طارق نے جواب دیا۔

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدھی رات کو پانڈے کا مکان کیسے تلاش کرو گے؟'' سلیم نے کہا۔

''پرسوں ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے میں نے اُس مکان کا پتہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اُس نے جو نشانی بتائی تھی، اس سے مکان تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دُشواری پیش نہیں آئے گی۔ وہ مکان اسی سڑک پر ہے۔'' طارق نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اُچھل پڑا..... فضا میں اچانک ہی سائرن کی آواز گونج اُٹھی تھی۔ سامنے تقریباً دو سو گز دُور ایک چھوٹا سا چوراہا تھا اور وہاں اس طرح روشنی نظر آ رہی تھی، جیسے دائیں طرف سے کوئی گاڑی آ رہی ہو۔ سائرن کی آواز بھی اُسی طرف سے آ رہی تھی۔

''شاید ہماری تلاش شروع ہو چکی ہے۔'' طارق کہتے ہوئے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

اُسی لمحے پیچھے سے بھی سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دونوں چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ بنگلوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے لان تھے جن کے آگے باڑھ لگی ہوئی تھی۔ طارق اور سلیم دائیں طرف والے بنگلے کی طرف دوڑے۔ اور جیسے ہی اُنہوں نے باڑھ کے پیچھے چھلانگ لگائی، سامنے والے چوراہے سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں ہر طرف گھومتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی سائرن کی آواز تیز ہو گئی۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی جو تیزی سے اُسی طرف آ رہی تھی۔ ٹھیک اُسی لمحے پولیس کی ایک اور گاڑی سائرن بجاتی ہوئی اُسی سڑک پر مُڑی اور پھر دونوں گاڑیاں اس باڑھ کے قریب آ کر رُک گئیں جس کے پیچھے یہ دونوں چھپے ہوئے تھے۔

یہ باڑھ تقریباً دو فٹ اُونچی تھی اور بہت چھدری سی تھی۔ اگر اس طرف روشنی ڈالی جاتی تو اُنہیں آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ باڑھ کے ساتھ گھاس پر لیٹے تھے۔ اُن کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے سائرن بند ہو گئے۔ ایک گاڑی میں سے ایک آدمی اُتر کر دوسری گاڑی کے قریب آ گیا۔ وہ پولیس کی وردی میں تھا اور اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''کچھ پتہ چلا.....؟'' دوسری گاڑی میں سے کسی نے پوچھا۔

''نو سر..... ہمیں ابھی تک کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا۔ لیکن قصہ کیا ہے..... وہ لوگ کون ہیں؟'' پہلی گاڑی سے اُترنے والے نے پوچھا۔

''وہ دونوں غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔ نہایت خطرناک..... انٹیلی جنس نے اُنہیں حراست میں لیا تھا لیکن وہ نہ صرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے بلکہ انٹیلی جنس کی اس پارٹی کی انچارج انسپکٹر بملا کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ جس گاڑی میں مس بملا کو لے کر فرار ہوئے تھے، وہ یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر مل گئی ہے۔ انسپکٹر بملا بھی بے ہوشی کی حالت میں گاڑی میں موجود تھی۔ گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ لوگ گاڑی اور انسپکٹر بملا کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ ایک میل تک کے علاقے کو گھیرے میں لے لیا جائے۔ وہ لوگ پیدل ہیں۔ زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔ اُنہیں ہر صورت میں تلاش کرنا ہے۔''

''انٹیلی جنس میں احمقوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہو گئی سر.....؟''

''پولیس میں بھی تم جیسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔'' جواب دیا گیا۔ ''گشت جاری رکھو! اور ہر مشتبہ شخص کو اُٹھا کر بند کر دو۔''

''یس سر.....!'' نیچے کھڑے ہوئے پولیس والے نے سلیوٹ جھاڑ دیا۔

پہلی گاڑی کا سائرن آن ہو گیا۔ وہ پولیس والا بھی اپنی گاڑی میں آ گیا۔ اُس کے بیٹھتے ہی اُس گاڑی کا سائرن بھی چیخنے لگا اور دونوں گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔

''قسمت اچھی تھی۔ اگر اس باڑھ کا سہارا نہ ملتا تو بے موت مارے جاتے۔'' طارق نے اُٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''اب جلدی سے پانڈے کا بنگلہ تلاش کر لو۔ ورنہ وہ لوگ ہمیں تلاش کر لیں گے۔'' سلیم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

سائرن کی آواز دُور جا چکی تھی۔ سڑک پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ پولیس کی دونوں گاڑیاں تقریباً دو منٹ تک یہاں کھڑی رہی تھیں لیکن کسی بنگلے سے کوئی شخص صورت حال معلوم کرنے کے لئے باہر نہیں نکلا تھا۔

طارق چلتے چلتے ایک جگہ رُک گیا۔ اُس بنگلے کے ایک پلر پر ایک دیوی کا مجسمہ لگا ہوا تھا۔ مجسمے کی اُونچائی تقریباً ڈیڑھ فٹ تھی۔ اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں ترازو تھا، جس کا ایک پلڑا ٹوٹا ہوا تھا۔

''یہ غالباً ہندوؤں کی انصاف کی دیوی ہے۔ لیکن اس کے ترازو کا ایک پلڑا ٹوٹا ہوا ہے۔'' سلیم نے کہا۔

''جس طرح ہندوؤں نے انصاف کا گلا گھونٹ دیا ہے اُسی طرح ان کے انصاف کی اس دیوی نے بھی اپنے ترازو میں سے انصاف والا پلڑا توڑ دیا ہے۔ لیکن بہرحال! پانڈے کا بنگلہ

ہی ہے۔ اُس نے یہی نشانی بتائی تھی۔'' طارق نے جواب دیا۔

''گھنٹی بجاؤں.....؟'' سلیم بولا۔

''احمق مت بنو! ہم دیوار پھاند کر اندر جائیں گے۔'' طارق نے کہا۔

''اور اگر چوکیدار نے دھر لیا تو.....؟''

''دیکھا جائے گا۔ چلو! دیوار پر چڑھو۔'' طارق نے کہا۔

دیوار زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ اُنہیں کودنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ یہ وسیع و عریض لان تھا۔ جس کے دوسری طرف برآمدے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ وہ چند لمحے تاریکی میں دبکے صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر طارق نے اِشارہ کیا اور وہ دونوں دبے قدموں آگے بڑھنے لگے۔ بنگلے کی عمارت کے دونوں طرف گلیارے سے تھے۔ طارق کا رُخ دائیں طرف کے گلیارے کی طرف تھا اور سلیم بائیں طرف جا رہا تھا۔ سلیم ایک کھڑکی کے سامنے رُک گیا۔ اُس نے کھڑکی پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ کھڑکی اندر سے بند نہیں تھی۔ وہ آسانی سے اندر کود گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑکی کے قریب دبکا رہا، پھر تاریکی میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کمرے سے نکل کر وہ ایک راہداری میں پہنچ گیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ اسی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ وہ دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔ یہ بیڈ رُوم تھا۔ سامنے ہی پلنگ پر کوئی کمبل تانے سو رہا تھا۔ سلیم دبے قدموں پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ کمرے کے وسط میں ہی پہنچا تھا کہ عقب سے ایک غراتی ہوئی آواز سن کر اُچھل پڑا.....

''ہاتھ اُٹھا لو! اور خبردار، اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔''

سلیم نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا لئے۔ اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک اُٹھا تھا اور پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔

ایک پستہ قامت اور قدرے بھاری بھر کم آدمی دروازے میں کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رُخ سلیم کی طرف تھا۔

''میں نے تمہیں اُسی وقت دیکھ لیا تھا، جب تم دیوار سے کودے تھے۔'' اُس شخص نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر ہی میں تکیوں پر کمبل ڈال کر چھپ گیا تھا۔ تاکہ تمہیں دھوکہ دے سکوں۔''

سلیم کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اُس شخص نے صرف اُسی کو دیوار سے کودتے ہوئے دیکھا تھا۔ طارق اُس کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

''کون ہو تم.....؟'' وہ شخص دو قدم آگے بڑھ آیا۔

''پستول پھینک دو مسٹر پانڈے! ورنہ تمہاری کھوپڑی اُڑا دُوں گا۔'' دروازے کی طرف سے یہ آواز سن کر وہ شخص اُچھل پڑا۔ وہ طارق تھا جو دبے قدموں وہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس شخص نے پستول پھینک کر دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ طارق نے جلدی سے آگے بڑھ کر پستول اُٹھا لیا۔

''تت.....تم لوگ کون ہو؟ اور میرا نام کیسے جانتے ہو.....؟'' وہ شخص ہکلایا۔ اُس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔

''تم ہاتھ گرا سکتے ہو مسٹر پانڈے!'' طارق نے کہا۔ ''ہم تمہارے دشمن یا چور، ڈاکو نہیں، تمہارے دوست ہیں۔ میرا نام طارق ہے۔ پرسوں فون پر تم سے بات ہوئی تھی۔''

''اوہ.....!'' پانڈے کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ ہاتھ گرا کر طارق کی طرف گھوم گیا۔ سلیم نے بھی ہاتھ گرا دیئے تھے۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ فی الحال مجھ سے رابطہ قائم نہیں کرو گے۔''

''مجبوری ہے۔ اس وقت پورے شہر کی پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ یہاں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے اس وقت گھر میں اور کون ہے؟'' طارق نے کہا۔

''کوئی نہیں..... پرسوں تمہارا فون ملنے کے بعد میں نے دونوں نوکروں کو لمبی چھٹی پر بھیج دیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم دونوں کسی بھی وقت ٹپک پڑو گے۔ ویسے اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ تم لوگوں نے یہاں پناہ لے رکھی ہے تو تمہارے ساتھ مجھے بھی سولی پر ٹانگ دیا جائے گا۔ ویسے یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ میرے بیوی بچوں کو یرغمالی بنا کر مجھے بلیک میل کیا جا رہا ہے۔''

''اور تم لوگوں نے جو ہماری پوری قوم کو یرغمال بنا رکھا ہے، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' طارق نے کہا۔ ''تمہارے حکمران تو ہمیں پینتالیس سال سے بلیک میل کر رہے ہیں۔ کون سا ایسا ظلم ہے، جو ہم پر نہیں توڑا گیا؟ بستیوں کو جلا کر راکھ کر دینا، انسانوں کو زندہ جلا دینا اور اُنہیں بے دردی سے جانوروں کی طرح ذبح کر دینا تمہارے نزدیک عین انصاف ہے۔ لیکن تم لوگ اب یہ بات ذہن میں رکھ لو! کہ وادی کشمیر میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑ چکی ہے۔ یہ طوفانی لہر، غاصبوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔''

''تم لوگوں کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔'' پانڈے نے کہا۔ ''تم لوگوں نے آزادی کا نام تو سنا ہے، اس کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ یہ نہیں جانتے کہ آزادی حاصل کس طرح کی جاتی ہے؟ آزادی کا مفہوم جاننے کے لئے ویت نام کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ ویتنامیوں نے پوری ایک نسل کٹوا کر آزادی کی تاریخ رقم کی ہے۔ الجزائر کے اُن بوڑھوں سے آزادی کا مفہوم پوچھو! جنہوں

نے فرانس کے چنگل سے نکلنے کے لئے خون کے دریا عبور کئے۔ اور پھر افغانستان کی تازہ
مثال تمہارے سامنے ہے۔ اُنہوں نے لاکھوں گردنیں کٹوا دیں اور آخر کار دنیا کی سب
بڑی طاقت رُوس کو اپنی سرزمین سے نکال دیا۔ تم لوگ آزادی کا مفہوم کیا سمجھو مسٹر طا
چھیالیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی وہیں کھڑے ہو، جہاں پہلے دن تھے۔ کھوکھلے نع
سے آزادی نہیں ملتی اور نہ ہی.....''

''بند کرو یہ بکواس!'' طارق دھاڑا۔ ''ہم یہاں تمہارا لیکچر سننے کے لئے نہیں آئے۔ اگ
میں آزادی کی لگن نہ ہوتی تو اس جنت نظیر وادی میں آج ہمارا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔ ہم
پچھلے چھیالیس برسوں میں تمہارے غاصب آقاؤں کو ایک دن کے لئے بھی چین سے بیٹھنے
دیا۔ اور آج وادی سے تمہارے آقاؤں کے قدم اُکھڑ رہے ہیں۔ اور وہ دن دُور نہیں جب
اپنی اس مقدس سرزمین سے اُن کے ناپاک قدموں کے نشان تک مٹا دیں گے۔'' طارق
لمحوں کو خاموش ہوا۔ پھر اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''ہم چند
یہاں رہیں گے اور تمہیں ہماری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے
کوشش کی تو تمہاری بیوی اور بچے.....''

''بس، بس.....آگے کچھ مت کہنا۔'' پانڈے نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ ''اپنی بیوی اور بچوں
خاطر ہی تو میں اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری کر رہا ہوں۔ کاش! میں اُنہیں بھی اپنے سا
ہی لے آیا ہوتا تو آج تم لوگوں کا آلہ کار نہ بنتا۔''

''اب تو تم ہمارے آلہ کار بن ہی چکے ہو۔'' سلیم مسکرایا۔ ''اور عافیت اسی میں ہے کہ ہم
کہیں، چپ چاپ اس پر عمل کرتے رہو۔''

''کیا چاہتے ہو.....؟'' پانڈے نے پوچھا۔

''ہمارا ایک ساتھی انٹیلی جنس والوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ صبح سب سے پہلے ہم یہ
چاہتے ہیں کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے؟ اور اُسے کہاں رکھا گیا ہے؟ میرا خیال ہے
یہ معلومات آسانی سے حاصل کر سکتے ہو۔'' طارق نے کہا۔

''پولیس کا ایک سب انسپکٹر میرا دوست ہے۔ اُس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔
پانڈے نے جواب دیا۔

''اپنے اس سب انسپکٹر دوست کو یہاں لانے کی حماقت مت کرنا۔ بلکہ جب تک ہم یہا
ہیں، تمہارا کوئی جاننے والا یہاں نہیں آئے گا۔'' طارق نے کہا۔

''کب تک یہاں رہو گے.....؟'' پانڈے نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ تو حالات پر منحصر ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''ویسے ہم نے ایک طریقہ سوچا ہے۔
دن کے وقت ہم یہاں تمہارے نوکروں کی حیثیت سے رہیں گے۔ تاکہ کسی کو یہاں ہماری
موجودگی پر شبہ نہ ہونے پائے۔ اگر کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ سکتے ہو کہ ہمیں عارضی
طور پر رکھا گیا ہے۔ اب یہ بتاؤ! کہ ہمیں رات کس کمرے میں گزارنی ہے؟''

''اس بنگلے میں کئی کمرے ہیں۔ جس پر چاہو، قبضہ کر سکتے ہو۔'' پانڈے نے کہا۔

''میرا خیال ہے یہی کمرہ مناسب رہے گا۔ یہاں سے اس کھڑکی کے راستے بیرونی گیٹ پر
بھی نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔ تم اپنا تام جھاڑ اُٹھا کر کسی دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔'' سلیم نے کہا
اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ خاصا وسیع کمرہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار
کے قریب شاندار ڈبل بیڈ تھا اور دوسری طرف آرام دہ صوفہ بھی بچھا ہوا تھا۔ ''ویسے بائی داوے
مسٹر پانڈے!'' سلیم بولا۔ ''یہاں تم رہتے تو اکیلے ہو۔ پھر یہ ڈبل بیڈ کس لئے ہے؟ کیا سنگل
بیڈ پر تمہیں نیند نہیں آتی؟''

''میں سنگل بیڈ پر سوؤں یا ڈبل بیڈ پر.....تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' پانڈے نے اُسے گھورا۔

''تکلیف تو کوئی نہیں ہے۔ ویسے میں سوچ رہا تھا کہ آدمی جب بیوی بچوں سے دُور ہو تو پر
پُرزے نکل آتے ہیں اسکے۔ تم نے بھی تو پر پُرزے نہیں نکال لئے؟'' سلیم مسکرایا۔

''بند کرو اپنی یہ بکواس۔'' پانڈے نے اُسے گھورا اور بستر پر سے کمبل وغیرہ اُٹھانے لگا۔ بیڈ
کے قریب ہی الماری بھی ایستادہ تھی۔ اُس نے الماری کا دروازہ کھولا، پھر کچھ سوچ کر بند کر دیا
اور اُن دونوں کو گھورتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں کم از کم! آج کی رات محتاط رہنا پڑے گا۔'' سلیم نے
پانڈے کے جانے کے بعد طارق کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

''نہیں.....میرا خیال ہے، وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا۔ اُس کے بیوی بچے.....''
راہداری میں قدموں کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ صرف ایک سیکنڈ بعد پانڈے، کمرے میں
داخل ہوا۔ اُس نے ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے دو کمبل پلنگ پر پھینک دیئے اور سائیڈ ٹیبل سے
سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اُٹھا کر واپس مُڑ گیا۔

''ایک منٹ مسٹر پانڈے!'' طارق نے ہاتھ سے اِشارہ کیا۔ ''کچن کس طرف ہے؟''

''دائیں طرف..... راہداری کے آخری میں۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔''
پانڈے نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

طارق بھی اُس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک ٹرے میں

چائے کی دو پیالیاں رکھے واپس آ گیا۔ اُس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ ایک کپ اُٹھا کر سلیم کو دیا اور دوسرا خود اُٹھا لیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دے جاتی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس علاقے میں اُن کی تلاش جاری تھی۔ اور اب تک نجانے کتنے بے گناہوں کو پکڑ کر آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کیا جا چکا ہو گا۔ اُنہیں بہرحال! یہ اطمینان تھا کہ وہ فی الحال محفوظ تھے۔ پولیس یا انٹیلی جنس والے سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ ایک ہندو کے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہوں گے۔

طارق، بابو محفوظ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس نے کھنڈر میں جب بابو محفوظ کو کرسی پر بندھے ہوئے دیکھا تھا تو فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اُن کے فرار کے بعد اُنہوں نے بابو محفوظ کے ساتھ نجانے کیا سلوک کیا ہو گا؟ اُن درندوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

''میرا خیال ہے، تم پلنگ پر سو جاؤ۔ میں یہاں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔'' طارق نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔''

''ہاں..... دو بج رہے ہیں۔ کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔'' سلیم نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا اور اُٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ پانڈے کا پستول ابھی تک اُس کے پاس تھا جسے اُس نے طارق کی طرف اُچھال دیا تھا۔

طارق نے صوفے پر لیٹ کر کمبل اپنے اُوپر کھینچ لیا۔ سلیم تو کچھ دیر بعد سو گیا، لیکن طارق کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ وہ کبھی بابو محفوظ کے بارے میں سوچنے لگتا اور کبھی اپنے اس مشن کے بارے میں۔ مشن کے بارے میں بابو محفوظ کو بھی کچھ علم نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا جس نے اُن کی رہنمائی کرنی تھی۔ لیکن وہ کون تھا؟ کیا وہ بھی بابو محفوظ کی طرح انٹیلی جنس کی نظروں میں تو نہیں تھا؟

وقت دھیرے دھیرے رینگتا رہا۔ اور رات بھر وقفے وقفے سے پولیس سائرن کی آوازیں فضا میں گونجتی رہیں۔ کبھی یہ آوازیں بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں اور کبھی قریب سے۔ سائرن بجاتی ہوئی پولیس کی گاڑیاں کم از کم تین مرتبہ اس بنگلے کے سامنے والی سڑک پر سے گزری تھیں۔

صبح چار بجے کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی اور جب سلیم نے اُسے جگایا تو سات بج رہے تھے۔ وہ انگڑائی لے کر اُٹھ گیا۔

''وہ کہاں ہے پانڈے؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔

''کچن میں ہمارے لئے بیڈ ٹی تیار کر رہا ہے۔'' سلیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد پانڈے چائے لے کر آ گیا۔ اُس نے اُن دونوں کو ایک ایک کپ دیا اور اپنا کپ لے کر خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اور پھر بیڈ ٹی کے بعد ناشتہ بھی پانڈے ہی کو تیار کرنا پڑا تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر نو بجے کے قریب وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

''رات کو میں نے جو کچھ کہا تھا، اُسے ذہن میں رکھنا پانڈے!'' طارق نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''ایسا نہ ہو کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔''

''اطمینان رکھو..... میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔''رات کو میں ایک بات نہیں پوچھ سکا تھا۔ میری پتنی اور بچے کیسے ہیں؟''

''عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانا ہم مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ تمہاری پتنی اور بچے خیریت سے ہیں۔ اور وہ اُس وقت تک خیریت سے رہیں گے، جب تک تم شرافت کا مظاہرہ کرتے رہو گے۔'' طارق نے جواب دیا۔

پانڈے مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ طارق اور سلیم، کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے رہے۔ چند منٹ بعد سفید رنگ کی ایک سیڈان، گیراج سے نکل کر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر سیڈان رُک گئی۔ پانڈے نیچے اُترا، اُس نے گیٹ کھولا، سیڈان باہر نکال کر پھر نیچے اُترا اور گیٹ بند کر کے پھر سیڈان میں بیٹھ گیا اور سیڈان حرکت میں آ کر سڑک پر دائیں طرف گھوم گئی۔

اُن دونوں کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں تھا۔ سب سے پہلے اُنہوں نے گھوم پھر کر مکان کے تمام کمروں کا جائزہ لیا۔ اور پھر اُسی کمرے میں آ گئے۔ پانڈے کی واپسی شام سات بجے ہوئی تھی۔ طارق نے اُس سے سب سے پہلے بابو محفوظ کے بارے میں سوال کیا۔

''میں نے آج شام چار بجے اپنے دوست سب انسپکٹر سے رابطہ قائم کیا تھا۔'' پانڈے نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔''تمہارا دوست بڑا پھسپھسا نکلا۔ مجرموں اور ملک دشمنوں کے ساتھ تم پولیس والوں کا رویہ سمجھ سکتے ہو۔ بابو محفوظ پولیس کے چند ہاتھ بھی برداشت نہ کر سکا۔ اُس کی لاش اس وقت ہسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی ہے۔ پولیس نے کل رات شیر علی نامی ایک بوڑھے کو بھی گرفتار کیا تھا۔ وہ بھی بابو محفوظ کا ساتھی تھی۔ وہ بھی شاید آج رات ہی کا مہمان ہو۔ انٹیلی جنس اور پورے شہر کی پولیس تم دونوں کو تلاش کر رہی ہے۔ شہر میں کئی مقامات پر چھاپے

مارے جا رہے ہیں۔ گزشتہ رات یہاں بعض مسلمان گھروں کی تلاشی بھی لی گئی ہے۔ پولیس کو یقین ہے کہ تم لوگ اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہو۔ یہ علاقہ مکمل طور پر پولیس اور خفیہ والوں کے حصار میں ہے۔''

''صورت حال خاصی سنگین ہے۔'' طارق اُس کے خاموش ہونے پر بولا۔

''کیا تم لوگ بچ کر نکل سکو گے.....؟'' پانڈے نے باری باری اُن کی طرف دیکھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم یہاں ہیں، محفوظ ہیں۔'' طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''پولیس یا انٹیلی جنس والے تو یہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ ہمیں ایک ہندو نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔''

''تم لوگوں نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ اگر انہیں میرے گھر میں تمہاری موجودگی کا شبہ بھی ہو گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی زندہ نہیں بچ سکوں گا۔'' پانڈے نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''اگر تم اپنے بیوی بچوں کے لئے جان دے دو گے تو یہ واقعی ایک نئی بات ہو گی۔ ویسے میرے خیال میں تم ایسا کوئی موقع نہیں آنے دو گے۔ بہر حال! ہم بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے ابھی تک شام کی چائے نہیں پی۔'' طارق بولا۔ پانڈے خونخوار نگاہوں سے اُنہیں دیکھتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

وہ دونوں تقریباً ایک ہفتہ پانڈے کے بنگلے میں محبوس رہے۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ اس دوران پانڈے کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی ملنے والا نہیں آیا تھا یا پھر اُس نے خود ہی سب کو منع کر دیا تھا۔

اس روز شام کو اندھیرا پھیلنے کے کچھ ہی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دونوں چونک گئے۔ ان دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پانڈے ابھی تک نہیں آیا تھا۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ اور وہ دونوں فون کی طرف دیکھتے رہے اور آخر کار فون خاموش ہو گیا.....

پانچ منٹ خاموشی رہی، اور فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔ دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آخر کار طارق نے آگے بڑھ کر ریسیور اُٹھا لیا۔ ماؤتھ پیس میں کچھ کہنے کی بجائے وہ ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔

''تم طارق ہو یا سلیم..... میری بات غور سے سنو!'' ریسیور پر ایک بھاری مردانہ آواز سن کر طارق اُچھل پڑا۔ ''تم لوگ فوراً اس بنگلے سے نکل جاؤ۔ پولیس کسی بھی لمحے پہنچ سکتی ہے۔''

''کون ہو تم.....؟'' طارق نے دریافت کیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا تھا۔

''میرا نام دل وارث ہے۔ مزید تعارف کے لئے آپریشن ریڈ فورٹ کا نام کافی ہے۔ پولیس کو شبہ ہو گیا ہے کہ تم لوگ اسی بنگلے میں پناہ لئے ہوئے ہو۔ پولیس کسی وقت بھی ریڈ کر سکتی ہے۔ میں بابو محفوظ کی طرح تم لوگوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یہاں سے نکل جاؤ۔''

''لیکن ہم کہاں جائیں گے.....؟'' طارق بولا۔ آپریشن ریڈ فورٹ کے حوالے سے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ دل وارث وہی شخص ہے، جسے اس مشن کی رہنمائی کرنا تھی۔

''پانڈے کے بنگلے سے نکلنے کے بعد رکشہ، ٹیکسی جو کچھ بھی ملے، اس پر بیٹھ کر قرول باغ پہنچ جاؤ۔ نارائن سٹریٹ کے کارنر پر لکڑی کا ایک ٹال ہے۔ ٹال والے کو میرا نام بتانا۔ وہ تم لوگوں کو میرے پاس پہنچا دے گا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

''کون تھا.....؟'' سلیم نے سوالیہ نگاہوں سے طارق کی طرف دیکھا۔

''ایک ہمدرد.....!'' طارق نے جواب دیا۔ ''یہاں سے نکلو! پولیس ریڈ کرنے والی ہے۔ اُنہیں یہاں ہماری موجودگی کی اطلاع مل چکی ہے۔''

اور اس کے بعد وہ لوگ مزید وقت ضائع کئے بغیر باہر کی طرف دوڑے۔ طارق نے پانڈے والا پستول، جیب میں ڈال لیا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر اُنہوں نے دونوں طرف سڑک پر جھانکا۔ سڑک پر اِکا دُکا گاڑیوں کی آمد و فت تھی۔ وہ گیٹ سے نکل کر دائیں طرف مُڑ گئے۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چوراہے کی طرف چلنے لگے۔

چوراہے پر پہنچتے ہی اُنہیں ایک خالی رکشہ مل گیا۔ وہ دونوں رکشے میں بیٹھ گئے۔ طارق نے رکشے والے کو قرول باغ چلنے کو کہا۔ رکشہ جیسے ہی حرکت میں آیا، سامنے سے پولیس کی ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار کا سائرن بند تھا۔ لیکن چھت پر فلیش لائٹ جل رہی تھی۔ وہ پولیس کار اُسی سڑک پر مُڑی تھی۔ طارق نے گردن گھما کر دیکھا، اُس سڑک پر دوسری طرف سے بھی ایک پولیس کار آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔

رکشہ، کرزن روڈ سے ہوتا ہوا جیسے ہی ٹاؤن ہال والے چوراہے سے آگے نکلا، طارق نے ڈرائیور کو رُکنے کو کہا۔ رکشہ رُکتے ہی وہ دونوں اُتر آئے۔ طارق نے دس روپے والے دو نوٹ رکشہ والے کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ''ہم نے قرول باغ جانے کا اِرادہ بدل دیا ہے۔'' طارق نے کہا اور سلیم کے ساتھ پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔ رکشہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دونوں ایک اور رکشے میں بیٹھ گئے۔ اس رکشے

کے ذریعے وہ پہاڑ گنج پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ تیسرے رکشے میں بیٹھ کر قرول باغ پہنچے تھے۔ پہلے رکشے میں سفر کرتے ہوئے طارق کو اچانک ہی کچھ خیال آ گیا تھا، اسی لئے اُس نے بار بار رکشے تبدیل کئے تھے۔

قرول باغ کے علاقے میں نارائن سٹریٹ تلاش کرنے میں اُنہیں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ نارائن سٹریٹ کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا گندا نالہ تھا جس کے کنارے پر لکڑی کا ٹال تھا۔ شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ ٹال بند ہو چکی تھا۔ لکڑیاں تولنے والے ایک بہت بڑے ترازو کے قریب ہاتو لیٹا ہوا تھا۔ پول کی طرح گڑی ہوئی ایک لکڑی پر لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ وہ دونوں چارپائی کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔

''ٹال بند ہو چکا ہے۔ لکڑی چاہئے تو صبح آنا لالہ جی!'' ہاتو نے چارپائی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''دل وارث.....''

''میرے ساتھ آؤ.....'' ہاتو نے اِشارہ کیا۔ اُس نے طارق کو پوری بات کرنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔

ایک وسیع رقبے پر لکڑیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ وہ دونوں لکڑیوں کے ان ڈھیروں کے درمیان ایک تنگ سے راستے پر چلتے ہوئے پچھلی طرف نکل گئے۔ یہ نالے کا کنارہ تھا، جہاں ایک طرف دو کچے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اُس کے سامنے مختصر سا صحن بھی تھا۔ وہ ہاتو کے ساتھ یہ صحن عبور کر کے ایک کمرے کے سامنے رُک گئے۔ ہاتو نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

کمرے میں دیوار کے ساتھ ایک شیلف پر لالٹین روشن تھی۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ دو آدمی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اُن کے چہرے دُھندلے سے لگ رہے تھے۔ طارق اور سلیم کو دیکھ کر وہ دونوں اُٹھ گئے، گرم جوشی سے ہاتھ ملائے گئے اور پھر سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہاتو واپس چلا گیا۔

دل وارث، دُبلا پتلا، لمبے قد کا آدمی تھا۔ چھوٹی گول داڑھی نے اُس کے چہرے کو خاصا پُرکشش بنا دیا تھا۔ اُس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ جبکہ دوسرا آدمی قدرے بھاری بھرکم تھا۔ اُس کی عمر بھی چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم پانڈے کے بنگلے میں پناہ گزین ہیں؟ اور یہ کہ پولیس وہاں ریڈ کرنے والی ہے.....؟'' طارق نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد پوچھا۔

''بابو محفوظ سے رابطہ ختم ہونے کے بعد میں پریشان ہو گیا تھا۔ پھر انکشاف ہوا کہ وہ انٹیلی جنس کے ہتھے لگ گیا ہے۔ اور اس رات تم لوگ بھی اُن کی گرفت میں آ گئے تھے۔ پھر دوسرے دن یہ انکشاف ہوا کہ تم دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ پولیس کو شبہ تھا کہ تم لوگ ریس کورس کے آس پاس ایک میل کے علاقے میں کہیں روپوش ہو۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس علاقے میں بعض مسلمان گھروں کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ تم لوگ کہاں غائب ہو سکتے ہو؟ پھر دفعتہً خیال آیا کہ پانڈے کی رہائش، اسی علاقے میں ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تم لوگوں نے وہیں پناہ لے رکھی ہو گی۔ میں نے پانڈے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اپنے طور پر تحقیقات جاری رکھیں۔ تم لوگ اگرچہ کبھی بھی بنگلے سے باہر نہیں نکلے۔ لیکن پانڈے کی عدم موجودگی میں بنگلے کے بعض کمروں میں روشنی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔ محلے والوں کو بھی شاید یہ شبہ ہو گیا تھا کہ بنگلے میں کوئی موجود ہے۔ اُنہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی اور مجھے بروقت اس کا پتہ چل گیا کہ پولیس وہاں ریڈ کرنے والی ہے۔ میں نے فوراً ہی فون کر دیا۔ اگر تم کال ریسیو نہ کرتے تو اس وقت شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ بہرحال! تم لوگوں کا تعاقب تو نہیں ہوا؟'' دل وارث نے آخر میں پوچھا۔

''ہم لوگوں نے تین جگہوں پر رکشے تبدیل کئے ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا۔'' طارق نے جواب دیا۔

ہاتو اُن کے لئے چائے لے آیا۔ اُن کے سامنے چائے رکھنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اُن کی گفتگو بھی جاری رہی۔

''مشن کے بارے میں ہم ابھی تک تاریکی میں ہیں۔ آخر ہمیں پتہ تو چلے کہ ہمیں کس مقصد کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے؟'' طارق نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''ایسا سکیورٹی کے نقطہ نظر سے کیا گیا ہے۔'' دل وارث نے جواب دیا۔ ''یہاں کی صورتِ حال تمہارے سامنے ہے۔ یہ مشن ہماری زندگیوں سے زیادہ اہم ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر کوئی پکڑا جائے تو تشدد کے تحت مشن کا راز فاش کر دے۔ اس لئے جب تک حالات پُرسکون نہیں ہو جاتے، اس مشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہفتے کے بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے اصل منصوبے پر عملدرآمد شروع کر دیں۔ آج کی رات تم لوگ یہیں رہو گے۔ کل کسی دوسری جگہ تمہاری رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا۔''

طارق کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ہاتو دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر

ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟ اس قدر بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟'' دل وارث نے پوچھا۔

''پولیس..... پولیس کی دو گاڑیاں سڑک کے موڑ پر آ کر رُکی ہیں۔ پولیس والے ٹال کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ہاتو نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

وہ لوگ ایک جھٹکے سے اُٹھ گئے۔ دل وارث بیچ کے دروازے سے دوسرے کمرے میں گھر گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ دروازے پر نمودار ہوا اور آٹو میٹک رائفلیں تقسیم کرنے لگا۔

''اگر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو دِلّی دروازے پر قاسم علی سے رابطہ قائم کر لینا۔ وہاں اُس کی پھلوں کی دُکان ہے۔'' دل وارث نے کہا۔

وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ''تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ بصورتِ دیگر تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔''

میگا فون پر یہ اعلان دو مرتبہ دُہرایا گیا۔

''پیچھے نالے کی طرف سے نکل چلو!'' دل وارث نے کہا۔

وہ لوگ کمرے سے نکل کر نالے کی طرف بڑھے۔ وہ جیسے ہی نالے کے کنارے پر پہنچے، نالے کی طرف سے ایک شعلہ سا چمکا اور فضا، فائر کی آواز سے گونج اُٹھی..... گولی، دل وارث کے سر پر سے گزر گئی تھی۔ وہ نیچے گر کر منڈیر کی آڑ میں لیٹ گئے۔ یہ پہلا فائر تھا۔ اس کے بعد چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ وہ چاروں طرف سے گھیرے میں لئے جا چکے تھے۔

طارق اور اُس کے ساتھیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک دونوں طرف سے شدید فائرنگ ہوتی رہی۔ اور پھر اچانک ہی ٹال کے ایک حصے میں لکڑیوں کے ڈھیر سے شعلے اُٹھنے لگے۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے بھی شعلے اُٹھتے ہوئے نظر آئے۔ اس سے پہلے طارق نے پٹرول کی بو محسوس کی تھی۔ جس سے طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جان بوجھ کر ٹال کو آگ لگائی گئی تھی۔

خشک لکڑیوں میں آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ لوگ بری طرح گھیرے میں آ چکے تھے۔ فائرنگ بھی چاروں طرف سے ہو رہی تھی۔

''نالے کی طرف سے ہی نکلنے کی کوشش کرو۔ فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہو!'' دل وارث چیخا..... وہ لوگ مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے نالے کی طرف بڑھنے لگے۔ آگ نے بھی اُنہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آگ کی تپش ناقابل

برداشت ہو رہی تھی۔ آگ کے اس حصار سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ نالہ..... اور اُس طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ لوگ فائرنگ کرتے ہوئے نالے کے کنارے پر پہنچ گئے۔ دل وارث نے نالے میں چھلانگ لگا دی۔ اُس کا ساتھی چھلانگ لگانے کے لئے پر تول رہا تھا کہ ایک گولی اُس کی کھوپڑی میں لگی اور وہ منہ سے آواز نکالے بغیر کنارے پر ڈھیر ہو گیا۔ طارق اور سلیم ساتھ ہی تھے۔ اُنہوں نے بیک وقت نالے میں چھلانگ لگائی تھی۔ گرنے کے بعد وہ اُٹھ کر بھاگے ہی تھے کہ سلیم چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا..... اُس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ طارق اُس سے دو قدم آگے تھا۔ وہ رُک کر سلیم کی طرف لپکا اور اُسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُن کے چاروں طرف گولیاں بارش کے قطروں کی طرح گر رہی تھیں۔

''مجھے چھوڑ دو طارق!'' سلیم کراہا۔ ''تم نکل جاؤ..... جلدی کرو!''

''میں، تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا سلیم!'' طارق اُسے اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ سلیم کی رائفل گر گئی تھی۔ طارق اُسے سہارا دے کر گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آسمان تک اُٹھتے ہوئے شعلوں سے پورا علاقہ روشن ہو رہا تھا۔ وہ لوگ ابھی تین چار گز آگے نکلے ہوں گے کہ نالے کی دیوار سے تین چار پولیس والے کود کر اُن کے سامنے آ گئے..... اُن کی رائفلیں سلیم اور طارق کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ طارق نے بے بسی سے چاروں کی طرف دیکھا اور رائفل پھینک دی۔

کچھ اور پولیس والے بھی نالے میں آ گئے تھے۔ اُن سب نے طارق اور سلیم پر ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ کیچڑ اور غلاظت میں لت پت اِدھر اُدھر لڑھکتے رہے۔ اُن کے جسم کے ہر حصے پر ٹھوکر پڑ رہی تھیں۔ اُن کی چیخیں جلتی ہوئی لکڑیوں کے شور میں دب گئی تھیں۔

دل وارث فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس کا ساتھی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ جبکہ ٹال کا مالک ہاتو، آگ میں زندہ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد طارق اور سلیم کو انٹیلی جنس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ایک ہفتے تک اُن پر تشدد کیا جاتا رہا۔ ہندو بھیڑیوں نے تمام حربے آزما ڈالے۔ لیکن وہ طارق یا سلیم میں سے کسی کی زبان نہ کھلوا سکے۔ اور آخر کار اُنہیں تہاڑ جیل میں منتقل کر دیا گیا.....

☆

تہاڑ جیل میں ایک الگ ہی دنیا آباد ہے۔ سسکیوں، آہوں، چیخوں اور موت کی ہچکیوں کی دنیا..... اس بلند چار دیواری کے اندر انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے انکار نہیں کہ مجرم کو اُس کے جرم کی سزا ضرور ملنی چاہئے تاکہ دوسرے بھی عبرت حاصل کریں۔ لیکن اس جیل میں آنے والے قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ یہاں محافظ، بھیڑیئے بن جاتے ہیں۔ خون آشام بھیڑیئے..... جیل کے کسی نہ کسی حصے سے ہر وقت چیخوں اور کراہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔ یہ اُن قیدیوں کی آوازیں ہوتی تھیں جو بھیڑیا صفت محافظوں کا تختۂ مشق بنتے رہتے تھے۔

تہاڑ جیل میں لائے جانے کے بعد بھی سلیم اور طارق سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اُنہیں کسی نہ کسی تحقیقاتی ٹیم کے سامنے پیش کیا جاتا۔ یہ لوگ پوچھ گچھ کم اور تشدد زیادہ کرتے۔ ہر تحقیقاتی ٹیم کا صرف ایک ہی سوال ہوتا، ان کا مشن کیا ہے؟ اور ان کے ساتھ اور کون کون لوگ شامل ہیں؟ وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح یہ سوال دُہراتے رہتے اور اُن پر تشدد کے نئے نئے حربے آزماتے رہتے۔ لیکن طارق اور سلیم مجاہد تھے۔ سچے مجاہد..... اُنہوں نے مادرِ وطن کے ناموس کی قسم کھا رکھی تھی کہ جان دے دیں گے لیکن زبان نہیں کھولیں گے۔ وہ مادرِ وطن سے کئے ہوئے اپنے اس وعدے پر قائم تھے۔ تشدد کا نشانہ بنتے رہے، لیکن زبان نہیں کھولی۔

آٹھ مہینے گزر گئے۔ تحقیقاتی ٹیموں کی آمد میں وقفہ بڑھتا گیا۔ اور پھر وہ لوگ اُنہیں اس طرح بھول گئے جیسے اُن کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ وہ جب سے گرفتار ہوئے تھے، اس وقت سے اب تک ایک مرتبہ بھی اُنہیں عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اُن کی طرح اس جیل میں بیسیوں ایسے اور قیدی بھی تھے جنہیں جیل میں ڈالنے کے بعد بھلا دیا گیا تھا۔

پہلے اُنہیں الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ پھر جیل کے اس حصے میں ڈال دیا گیا، جہاں عام قیدی تھے۔ قیدیوں میں ہر نوعیت کے لوگ شامل تھے۔ کسی کو ایک روٹی چرانے کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور کوئی قاتل اور ڈاکو تھا۔ یہاں بعض طاقتور قیدیوں نے اپنی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ اُن کا اپنا

راج تھا۔ دوسرے قیدی رعایا کی طرح اُن کے احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔

ایک سال بیت گیا..... انہی دنوں ایک اور قیدی کو یہاں لایا گیا۔ اُس پر متعدد ڈکیتیوں اور قتل کا الزام تھا۔ اُس قیدی نے یہاں آتے ہی اپنا راج قائم کرنے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں قیدی، دو حصوں میں بٹ گئے۔ دو سلطنتیں قائم ہو گئیں..... طارق اور سلیم کسی سلطنت میں شامل نہیں تھے۔ وہ نو مین لینڈ میں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن نئے آنے والے سرغنہ نے طاقت کے ذریعے اُنہیں اپنا محکوم بنانا چاہا تو طارق اور سلیم نے اُس کے دونوں بازو توڑ دیئے۔ جیل میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ پرانے حکمران نے طارق اور سلیم کا ساتھ دیا۔ اس ہنگامے میں لاٹھیوں اور چاقوؤں کے علاوہ پستول بھی استعمال کئے گئے۔ اس ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں ایک قیدی ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ تحقیقات سے جیل کے حکام اس نتیجے پر پہنچے کہ ہنگامے کے اصل ذمہ دار طارق اور سلیم تھے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے ایک قیدی کے بازو توڑے تھے۔ اُن دونوں کو ایک بار پھر خطرناک قیدیوں والے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

جیل کے اس بلاک میں طارق اور سلیم کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جسے دنیا کا خطرناک ترین مجرم قرار دیا گیا تھا۔ اُس پر قتل کے درجنوں الزامات تھے۔ دھوکہ دہی، فریب، جعلسازی اور اسی قسم کے دیگر جرائم کی تعداد کا حساب تو اُس شخص کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ دنیا کی متعدد حکومتوں کو قتل اور اس جیسے سنگین جرائم کے سلسلے میں مطلوب تھا۔ صرف تھائی لینڈ میں اُس پر دو درجن سے زائد افراد کے قتل کے مقدمات تھے اور وہ تھائی لینڈ میں موسٹ وانٹڈ مجرم تھا۔

وہ چارلس سوبھراج تھا..... کوئی انسان پیدائشی مجرم نہیں ہوتا۔ اُسے مجرم بنایا جاتا ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کا گلا کاٹنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چارلس سوبھراج کی داستان خاصی دلچسپ تھی۔ اُس کی ماں ویتنامی اور باپ ہندو تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ویتنام پر جنگ کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ویتناموں پر یہ جنگ مسلط کی گئی تھی اور اُن کی دوسری نسل جنگ کی بھٹی کا ایندھن بنی ہوئی تھی۔ امریکہ حسبِ معمول اس خطے میں بھی اپنا روایتی کردار ادا کر رہا تھا۔ ویتناموں کو ہو چی منہ جیسا حریت پرست لیڈر میسر تھا۔ اُس کی قیادت میں مٹھی بھر ویتناموں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ کو ننگی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ دنیا میں اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لئے امریکہ نے اس خطے کے انسانوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے تھے جن کی مثال صرف چنگیز خان اور ہلاکو کے دور ہی میں مل سکتی ہے۔ اس زمین کے باشندوں کو جنگلوں میں جانوروں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اُن کے لہلہاتے کھیتوں کو ویران اور بستیوں کو پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپان کے ہنستے بستے شہروں

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم بھی امریکہ نے برسائے تھے۔ ایٹم بموں کی مزید تباہی سے
کے لئے جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ویتنام کی بستیوں پر نیپام بم برسائے جا رہے
آگ لگانے والے یہ بم ہزاروں انسانوں کو جلا کر راکھ کر چکے تھے۔ اور جو زندہ بچے تھے
سے پیر تک آبلوں میں چھپ گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ویتنامیوں نے ہتھیار نہیں
تھے۔ وہ اپنے حق کے لئے لڑتے رہے..... اپنے وطن، اپنی سرزمین پر آزادی کا سانس لینے
لئے اپنے پیاروں کی جانوں کے نذرانے پیش کرتے رہے۔

ویتنام کی جنگ عروج پر تھی۔ تباہی اور بربادی کی دیوی نے اُس خطے کو پوری طرح
لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بستیاں ویران ہو چکی تھیں۔ لوگ جنگلوں میں جانوروں جیسی زندگی
رہے تھے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے وہ گھاس اور درختوں کے پتے کھانے پر مجبور
جو لوگ امریکی طیاروں سے برسائی جانے والی گولیوں کی بارش اور نیپام بموں کے شعلوں
بچ جاتے، وہ بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتے۔

اُجڑی ہوئی بستیوں کے بچے کھچے لوگ، روزگار کی تلاش میں بڑے شہروں کا رُخ کر
تھے۔ چودہ سال کی وہ لڑکی بھی ایک دُور دراز کی اُجڑی ہوئی بستی سے نکل کر لاؤس آئی تھی۔
کی چھوٹی سی بستی کو بھی امریکی طیاروں نے پیوند خاک کر دیا تھا۔ صرف چند افراد بچے تھے
جنگل میں پناہ لئے ہوئے تھے اور درختوں کے پتے اور جڑیں کھا کر زندگی کا بوجھ سنبھالے ہوئے
تھے۔ اُن میں مائے کے بوڑھے ماں باپ بھی تھے جو زندگی کے آخری لمحات کے انتظار میں
جنگل میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

مائے، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ پچھلے دو تین برسوں میں اُس کے جسم میں
ہونے والی تبدیلیاں اب نمایاں ہو چکی تھیں۔ اُسے اپنے جسم کی ان تبدیلیوں پر بڑا ناز تھا۔
سال کی عمر بڑی باوری ہوتی ہے۔ مائے کو اپنے حسن و شباب کا پوری طرح احساس تھا۔
اب اُس اُجڑی ہوئی بستی میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں
چاہتی تھی۔ وہ بعض ایسی لڑکیوں کو بھی جانتی تھی جو جب گاؤں میں تھیں تو اُنہیں کئی کئی روز فاقے
کرنے پڑتے تھے۔ درختوں کے پتے کھانے پڑتے تھے۔ لیکن جب وہ شہر چلی گئیں تو اُنہیں
فاقوں سے نجات مل گئی۔ وہ پیٹ بھر کر اچھا کھانا کھاتیں اور اچھا لباس پہنتیں۔ اور مائے کو یقین
تھا کہ شہر جا کر اُسے بھی نہ صرف فاقوں سے نجات مل جائے گی۔ بلکہ پہننے کو اچھے کپڑے بھی
گے۔ اُس نے سوچا کہ شہر جا کر جب اُس کے حالات بدلیں گے تو وہ بوڑھے ماں باپ کو
اپنے پاس بلا لے گی۔ یہی سوچ کر ایک روز وہ اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی.....

جب اُن کی بستی آباد تھی تو وہ چھوٹی سی ڈسپنسری میں نرسنگ کا کام سیکھا کرتی تھی۔ یہ تجربہ
وس میں اُس کے کام آیا۔ ہسپتالوں میں یوں بھی نرسوں کی کمی تھی۔ اُسے ایک ہسپتال میں نرس
حیثیت سے نوکری مل گئی۔ مائے کے وہ خواب تو پورے نہیں ہوئے جو اُس نے شہر کے
والے سے سوچے تھے۔ البتہ اُسے جینے کا ایک سہارا مل گیا تھا۔ اسی دوران سوبھراج نامی ایک
مدنوجوان علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہوا۔ سوبھراج، جوان اور خوبرو تھا۔ لڑکیوں کو اپنے
ال میں پھانسنے کا گر بھی جانتا تھا۔ مائے بھی اُس کے جال میں پھنس گئی۔ سوبھراج نے اپنے
پ کو بہت دولت مند بتایا تھا۔ لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ ایک بہت معمولی سا درزی تھا جو
ھنگ سے کپڑے سینا بھی نہیں جانتا تھا۔

سوبھراج ہی نے مائے کی زندگی کو نئی لذتوں سے روشناس کرایا۔ لیکن لذتوں کے سوا، مائے کو
بھراج سے اور کچھ نہ مل سکا۔ سوبھراج نے اپنا کام دھندا چھوڑ دیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے شراب
ں ڈُھت رہتا۔ مائے کی ساری تنخواہ شراب میں اُڑا دیتا۔ مائے کو گھر کا خرچ پورا کرنے کے
لئے ہسپتال میں اوور ٹائم لگانے کے علاوہ محنت مزدوری اور لوگوں کے گھروں میں کام کرنا پڑتا۔
ں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔

مائے کو بہت جلد احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ اپنے پیٹ میں ایک اور زندگی کا
جھ اُٹھائے ہوئے تھی اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھ رہا تھا۔ مگر سوبھراج کو
ں کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ اب اُس نے مائے کو مارنا پیٹنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ شراب کے
لئے مائے سے پیسے مانگتا۔ اور جب مائے انکار کر دیتی تو سوبھراج اُسے دُھنک کر رکھ دیتا۔
ئے کو بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ وہ سوبھراج کی بیوی نہیں، اُس کی حیثیت صرف ایک داشتہ
ہے۔

مائے کے ہاں جب بیٹا پیدا ہوا تو مائے نے اُس کا نام چارلس سوبھراج رکھا۔ سوبھراج نے
اف انکار کر دیا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ بچہ، باپ کی شفقت سے محروم ماں کی آغوش
پلتا رہا۔ وہ جب ذرا بڑا ہوا تو اُس نے ماں کے علاوہ جس شخص کو اپنے قریب دیکھا، وہ
بھراج تھا۔ وہ سوبھراج کی طرف لپکتا۔ مگر سوبھراج نفرت سے اُسے پیچھے ہٹا دیتا۔

سوبھراج نے ایک روز مائے کو صاف طور پر کہہ دیا کہ نہ تو وہ اُس کی بیوی ہے اور نہ ہی وہ
بچے کا باپ ہے۔ چارلس جب چھ سال کا تھا تو مائے نے ایک فرانسیسی فوجی آفیسر سے شادی
لی۔ اُس فرانسیسی آفیسر نے مائے کی جوانی کو تو سینے سے لگا لیا لیکن اُس کے بچے کو اپنانے
ے انکار کر دیا۔

چارلیس سوبھراج اب ماں کی ماما سے بھی محروم ہوگیا۔ باپ کی شفقت سے تو وہ شروع
سے محروم تھا۔ اب ماں کی ماما بھی دست کش ہو رہی تھی۔ اُسے محبت کی تلاش تھی۔ وہ باپ
طرف دوڑتا تو اُسے بڑی سختی سے ٹھکرا دیا جاتا۔ ماں کی طرف لپکتا تو دوسرے شوہر کے خو
سے وہ بھی پیچھے ہٹ جاتی۔

فرانسیسی فوجی آفیسر کا تبادلہ ہوگیا اور وہ مائے کو ساتھ لے کر فرانس چلا گیا۔ ننھا چارلس ا
روز بلک بلک کر رویا۔ وہ دوڑا دوڑا سوبھراج کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کی مح
کا احساس کرتے ہوئے باپ اُسے سینے سے لگا لے گا۔ لیکن سوبھراج ایک بنئے کی اولاد
اُس نے گھاٹے کا سودا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس نے ایک بار پھر سوبھراج کو اپنی اولاد
کرنے سے انکار کرتے ہوئے ٹھکرا دیا۔

چارلیس سوبھراج، ماں کی ماما اور باپ کی شفقت کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتا
لیکن اُسے نہ تو ماں کی ممتا ملی اور نہ باپ کی شفقت۔ اُس کی محرومیوں میں اضافہ ہوتا
محرومیوں کا یہ احساس اُسے ایک ایسے راستے پر لے گیا جس نے اُس کی زندگی کا دھارا بدل
اُس کا پہلا جرم یہ تھا کہ وہ ایک ایسے باپ کا بیٹا تھا، جس نے اُسے اپنی اولاد تسلیم کرنے
انکار کر دیا تھا۔ اُس کی سزا چارلس کو اس طرح ملی کہ وہ در در کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ اُس کا
جرم یہ تھا کہ اُس نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے آدھی روٹی چرائی تھی اور سزا کے طور پر
دو دن جیل میں گزارنے پڑے۔ آدھی روٹی کی یہ چوری اُس کی مجرمانہ زندگی کا نقطہ آغاز
محرمیوں کا احساس اُسے اس وادی خارزار میں آگے اور آگے لیتا چلا گیا۔ سینے کی گہرائیوں
چھپا ہوا انتقام کا جذبہ آہستہ آہستہ اُبھر کر سامنے آ رہا تھا۔ اُسے انسانوں سے نفرت ہوگئی تھی
اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لئے انسانی زندگیوں سے کھیلنے لگا۔ انسانوں کو بے دردی
موت کے گھاٹ اُتار کر اُسے روحانی تسکین سی ملتی۔

وہ محبت کی تلاش میں دنیا بھر کے ممالک کی خاک چھانتا پھرا۔ اُسے کہیں محبت تو نہ ملی
جب وہ کسی ملک میں داخل ہونے کے بعد وہاں سے رُخصت ہوتا تو اپنے پیچھے سسکیو
آہوں کی لاتعداد داستانیں چھوڑ جاتا۔ اس ملک کی پولیس اُس کی تلاش میں پاگلوں کی طر
بھاگ شروع کر دیتی۔ لیکن وہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اپنے نقش قدم تک مٹا ڈالتا
پولیس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ جاتی۔

چارلس سوبھراج نے قتل اور لوٹ مار کی زیادہ وارداتیں تھائی لینڈ میں کی تھیں۔ وہ
حکومت کو سب سے زیادہ مطلوب آدمی تھا۔ لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے نقش پا مٹ

بھارت پہنچ گیا۔ یہاں بھی اُس کی وارداتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بھارت کے مختلف شہروں میں
اُس نے کئی وارداتیں کیں۔ اُس کی وارداتوں کا یہ سلسلہ آخر کار وائی ایم سی اے کے یوتھ ہاسٹل
پر ختم ہوگیا۔ غیر ملکی سیاحوں کی ایک پارٹی دہلی کے وائی ایم سی اے کے یوتھ ہاسٹل میں مقیم تھی۔
چارلس سوبھراج نے حسب معمول پہلے اُن سیاحوں سے دوستی بڑھائی۔ اور پھر اپنی ایک کینیڈین
دوست کی مدد سے اُن پچیس تیس سیاحوں کو بے ہوشی کی دوا پلا کر لوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے
پکڑا گیا۔ اگر اس دور میں ملک میں اندرا گاندھی کی ایمرجنسی نافذ نہ ہوتی تو وہ کسی نہ کسی طرح
ضرور بچ نکلتا۔ لیکن اندرا کی ایمرجنسی اُسے لے ڈوبی۔ بھارت کی حدود میں چارلس سوبھراج پر
قتل کا کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تھا۔ لیکن اُسے جعلسازی، دھوکہ دہی اور ایسے ہی دیگر جرائم کے
الزام میں چند سال کی سزا سنائی گئی اور اُسے تہاڑ جیل پہنچا دیا گیا۔

1985ء میں چارلس سوبھراج کی سزا پوری ہونے والی تھی۔ سزا پوری ہونے کے بعد چارلس
سوبھراج کو تھائی حکومت کے مطالبے پر تھائی لینڈ کے حوالے کر دیا جاتا۔ جہاں اُس کے خلاف کم
از کم دو درجن افراد کے قتل کے مقدمات درج تھے۔ چارلس سوبھراج کو یقین تھا کہ تھائی لینڈ میں
وہ سزائے موت سے نہیں بچ سکے گا۔ اس کا اُس نے ایک اور حل تلاش کر لیا۔ وہ اپنی رہائی سے
چند ہفتے پہلے محافظوں کو رشوت دے کر جیل سے بھاگ نکلا۔ لیکن ایک ہفتے کے اندر اندر گوا کے
ایک ہوٹل سے پکڑا گیا۔ وہ جان بوجھ کر گرفتار ہوا تھا۔ کیونکہ وہ ہندوستان سے باہر نہیں جانا چاہتا
تھا۔ جیل سے فرار کے جرم میں اُس پر مقدمہ چلا اور ایک بار پھر چند سال کے لئے تہاڑ جیل پہنچا
دیا گیا۔

چارلس سوبھراج کی عمر پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ زندگی کا باقی حصہ بھی تہاڑ جیل میں
گزار دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس خوف ناک حقیقت سے پوری طرح واقف تھا کہ یہاں اُس کی
سزا پوری ہوتے ہی اُسے تھائی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا جہاں اُسے پھانسی کے پھندے
پر لٹکا دیا جائے گا۔ تھائی لینڈ میں موت کی سزا سے بچنے کے لئے وہ تہاڑ جیل میں وقتاً فوقتاً اپنی سزا
میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ جب بھی اُس کی سزا پوری ہونے والی ہوتی، وہ یا تو فرار ہونے کی کوشش
کرتا یا جیل میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ جس پر اُس کی سزا میں اضافہ کر دیا جاتا۔

اپنی سزا میں اضافہ کرنے والی حرکتوں سے قطع نظر چارلس سوبھراج تہاڑ جیل کا سب سے
شریف، نستعلیق اور بے ضرر قیدی تھا۔ اس کے علاوہ وہ جیل میں بڑے ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہا
تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چارلس سوبھراج پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ یا جیل سے باہر اُس
کے رابطے قائم ہیں جو اُس کی مدد کر رہے ہیں۔ تہاڑ جیل میں قیدیوں کو عام طور پر ایسی خوراک

دی جاتی جسے جانور بھی منہ لگانا پسند نہ کرتے ہوں۔ لیکن چارلس سوبھراج ہمیشہ بڑھیا کھانے کھاتا۔ بڑھیا سگریٹ پیتا۔ دو چار قیدی ہر وقت اُس کی خدمت پر مامور رہتے۔ جیل کے محافظ بھی اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے۔ چارلس سوبھراج کو کچھ ایسی چیزیں بھی فراہم کی گئی تھیں جنہیں عیاشی کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ اُس کی کوٹھری میں ایک چھوٹا سا رنگین ٹیلی ویژن اور وی سی پی بھی موجود تھا جس پر وہ بھارتی اور انگلش فلمیں دیکھا کرتا۔ وہ اکثر اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ تیل کے چولہے کے علاوہ اُس کے پاس چند برتن بھی موجود تھے۔ مرغی اُس کے کھانے کا لازمی جزو تھی۔ مرغی وہ خود ذبح کرتا تھا۔

ایک روز بعض اعلیٰ حکام اچانک ہی جیل کے دورے پر آ گئے۔ چارلس سوبھراج کی کوٹھری میں یہ سب کچھ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اُس روز نہ صرف یہ کہ وہ تمام چیزیں اُس کی کوٹھری سے ہٹا دی گئیں بلکہ اُس کی جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ جامہ تلاشی کے دوران اُس کی جیبوں سے دو ہزار روپے سے زائد رقم برآمد ہوئی تھی جسے سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اس واقعے کے تقریباً تین گھنٹے بعد طارق اور سلیم، چارلس سوبھراج کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے چارلس سوبھراج نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور اُس سے کھیلنے لگا۔ طارق کے خیال میں وہ بچوں کے کھیلنے والے شیشے کے بنٹے تھے۔ لیکن جب چارلس سوبھراج نے اُن کے سامنے مٹھی کھولی تو وہ دونوں ششدر رہ گئے۔ اُس کی ہتھیلی پر ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ہیروں کی تعداد پانچ تھی اور تمام ہیرے مٹر کے دانوں سے بڑے تھے۔

''دو تین گھنٹے پہلے تو تمہاری تلاشی لی گئی تھی۔ یہ ہیرے تمہارے پاس کہاں سے آ گئے؟'' طارق نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اُنہوں نے تلاشی میرے لباس کی لی تھی، پیٹ کی نہیں۔'' چارلس سوبھراج نے جواب دیا۔ طارق اور سلیم، حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت تو بات اُن کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ چارلس سوبھراج لاکھوں روپے مالیت کے یہ ہیرے نگل لیا کرتا تھا۔ رفع حاجت کے وقت یہ ہیرے پیٹ سے نکل آتے تو وہ اُنہیں دھو کر پھر محفوظ کر لیتا۔ چارلس سوبھراج کے پاس ان قیمتی ہیروں کی موجودگی کا علم بہت سے قیدیوں کو تھا۔ کئی مرتبہ یہ ہیرے چرانے کی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن کوئی بھی شخص آج تک ان قیمتی ہیروں کا سراغ نہ پا سکا تھا۔

اُس روز اعلیٰ حکام کے معائنے کے وقت چارلس سوبھراج کی کوٹھری سے جو چیزیں ہٹائی گئی تھیں، دوسرے روز وہ سب کچھ پھر وہاں موجود تھا۔ جس پر طارق اور سلیم کو حیرت بھی ہوئی تھی۔

لیکن بہرحال! چارلس سوبھراج کی موجودگی سے طارق اور سلیم کو یہ فائدہ ضرور پہنچا تھا کہ اُنہیں بہتر خوراک مل رہی تھی۔

تہاڑ جیل کے عام قیدیوں کو زندگی کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ وہ جانوروں سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ قیدیوں پر بے پناہ جبر و تشدد کیا جاتا۔ معمولی معمولی باتوں پر اُنہیں ہنٹروں سے اُدھیڑ دیا جاتا۔ چارلس سوبھراج جیسے پُراسرار قوتوں کے مالک چند قیدی ایسے تھے جو جیل میں بھی عیش کر رہے تھے۔ چارلس کی کوٹھری میں ٹیلی ویژن موجود تھا۔ اس کے علاوہ اُسے اخبارات بھی پہنچائے جاتے تھے۔

اُنہی دنوں بھارت کے بعض شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ ٹیلی ویژن پر تو اُن ہنگاموں کے بارے میں زیادہ کچھ نہ بتایا جاتا۔ البتہ اخبارات ان ہنگاموں کی خبریں تفصیل سے شائع کر رہے تھے۔ یہ فسادات کئی شہروں میں پھیل گئے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ اُن کے گھروں کو لوٹ کر نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ مزاحمت کرنے والے مسلمانوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ راہ چلتے مسلمانوں کو چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام تھیں۔ مسلمان ہندوؤں کی بربریت کا شکار ہو رہے تھے اور مسلمانوں ہی کو پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ جبکہ ہندو قتل و غارت کا بازار گرم کئے ہوئے تھے اور اُنہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ گئو ماتا کا پجاری، متعصب اور انتہا پسند ہندو بال ٹھاکرے، مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو بھڑکانے میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔

بال ٹھاکرے کی طرف تو حکومت نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ البتہ مسلمان لیڈروں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ ایسے ہی ایک مسلمان لیڈر کو تہاڑ جیل کے اُس حصے میں لایا گیا جہاں طارق اور سلیم وغیرہ چارلس سوبھراج کے ساتھ سزا بھگت رہے تھے۔ ظہور قادری بھارتی حکومت کے رویئے کے خلاف مسلمانوں کے احتجاجی جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ یہ جلوس دریا گنج کی ایک جامع مسجد سے شروع ہوا تھا اور شہر کے مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا راشٹریہ پتی بھون تک جانا چاہتا تھا۔ اس جلوس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار مسلمان شامل تھے جن میں نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ بہت سے لوگوں نے ایسے پلے کارڈ اُٹھا رکھے تھے جن پر احتجاجی نعرے درج تھے۔ جلوس بالکل پُرسکون تھا۔ شرکاء کا ہنگامہ کرنے کا کوئی اِرادہ نہیں تھا۔ سب لوگ غیر مسلح اور نہتے تھے۔ وہ لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے اور راشٹریہ پتی بھون تک پُرامن احتجاج کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ جلوس جیسے ہی فیروز آباد کے ایک چوراہے پر پہنچا، اچانک ہی ایک طرف سے جے بجرنگ بلی کا شور بلند ہوا اور ہزاروں مسلح ہندو، نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ

پڑے۔ یہ بال ٹھاکرے کے دہشت گرد اور انتہاء پسندوں کی تنظیم شیو سینا کے غنڈے تھے
کی رہنمائی بال ٹھاکرے کا ایک خاص چیلا کر رہا تھا۔

فیروز آباد کا وہ چوراہا میدانِ کارزار کا منظر پیش کرنے لگا۔ لیکن یہ لڑائی یکطرفہ تھی۔ شیو
کے غنڈے آتشیں اسلحہ، لاٹھیوں، کلہاڑوں اور خنجروں سے لیس تھے۔ وہ خونخوار بھیڑیوں کی طر
نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ نہتے مسلمان اپنی جانیں بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے
ہندوؤں نے اُس علاقے میں مسلمانوں کی دُکانوں کو بھی آگ لگا دی تھی اور وہ بھاگتے ہو
مسلمانوں کو اُٹھا اُٹھا کر آگ میں پھینک رہے تھے۔ اُنہیں گولیوں سے بھونا جا رہا تھا اور اُنہ
چھرے گھونپے جا رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک یہ کشت وخون جاری رہا۔ پولیس کے آنے پر ہندو غنڈے بھاگ
نکلے۔ اس ہنگامے میں گیارہ بے گناہ مسلمان شہید اور بیسیوں زخمی ہوئے تھے۔ پولیس نے آ
ہی بڑی تیزی سے کارروائی شروع کر دی۔ اور کارروائی یہ تھی کہ درجنوں مسلمانوں کو بلوے
الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں مسلمانوں کے جلوس کی رہنمائی کرنے وا
ظہور قادری بھی تھا جس کی عمر پچپن سے اُوپر ہی تھی۔ اُسے داڑھی سے پکڑ کر گھسیٹتے اور ٹھوکریں
مارتے ہوئے پولیس کی گاڑی میں بٹھایا گیا اور پھر اُس روز اُسے گرفتار ہونے والے دوسرے
مسلمانوں کے ساتھ تہاڑ جیل پہنچا دیا گیا۔

اپنی بیرک کے پچھلی طرف خوفناک چیخوں کی آواز سن کر طارق اور سلیم بری طرح چونک
گئے۔ تہاڑ جیل میں چیخوں، آہوں اور کراہوں کی آوازیں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہ جیل
ایشیاء کا سب سے بڑا عقوبت خانہ تھا۔ یہاں قیدیوں پر ایسے ایسے انسانیت سوز ظلم ڈھائے
جاتے کہ شیطان بھی شرما جاتا۔ اُن چیخوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے کسی ضعیف العمر شخص کو
تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ طارق اور سلیم اس وقت اپنی کوٹھری میں تھے۔ اُس کوٹھری میں اُن
کے ساتھ دو قیدی اور تھے۔ وہ لوگ پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ طارق کی
نظریں کوٹھری کی پچھلی دیوار میں روشندان پر جم گئیں۔ یہ روشندان تقریباً ایک فٹ چوڑا اور
ڈیڑھ فٹ لمبا تھا۔ فرش سے اُس کی بلندی تقریباً دس فٹ تھی۔ اُس روشندان سے گزرنا اگرچہ
ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چیخوں کی
آوازیں اسی روشندان سے آ رہی تھیں۔

''دیکھنا چاہتے ہو؟ آؤ.....!'' ایک قیدی نے کہا اور روشندان کے نیچے دیوار کے قریب بیٹھ
گیا۔ طارق اُس کے کندھوں پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ قیدی آہستہ آہستہ اُٹھنے لگا۔ قیدی کے

کندھوں پر کھڑے ہو کر طارق، روشندان کے برابر پہنچ گیا۔ اُس نے روشندان کی سلاخوں کو پکڑ
لیا تاکہ قیدی کے کندھوں پر اُس کا بوجھ کم ہو سکے۔

دوسری طرف ایک مختصر سا آنگن تھا۔ دو طرف کی دیواروں پر تیز روشنیوں کے بلب جل
رہے تھے۔ آنگن کے وسط میں فرش پر ایک بوڑھا چت لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے جسم پر صرف پاجامہ
تھا۔ سفید لمبی داڑھی، سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے بازو اور ٹانگیں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں
اور ہر بازو اور ٹانگ پر ایک ایک آدمی کھڑا تھا۔ ایک آدمی بوڑھے پر جھکا ہوا کچھ پوچھ رہا تھا۔
آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن بوڑھے نے زور زور سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ آدمی بوڑھے کی
داڑھی پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ بوڑھے کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ اُس شخص نے
داڑھی کو زوردار جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک اور آدمی سے کچھ کہا۔
وہ دوسرا شخص دیوار کی طرف چلا گیا جہاں ایک سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا۔ قریب ہی فرش پر بجلی کی تار کا
ایک بہت بڑا گچھا پڑا ہوا تھا۔ اُس شخص نے پلگ ساکٹ میں لگا دیا اور سوئچ آن کر کے تار کو
دوسرے سرے سے پکڑ کر بوڑھے کے قریب آ گیا۔ پہلے شخص نے بوڑھے سے ایک بار پھر کچھ
پوچھا۔ بوڑھے نے اس مرتبہ بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ اُس شخص کا اِشارہ پا کر بوڑھے کی ٹانگوں پر
کھڑے ہوئے دونوں آدمی اُتر آئے اور اُنہوں نے بوڑھے کا پاجامہ پکڑ کر کھینچ لیا..... اب
بوڑھا بالکل برہنہ ہو چکا تھا۔ دونوں آدمی پھر اُس کی ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے کے
بازوؤں اور ٹانگوں پر کھڑے ہوئے چاروں آدمیوں کے پیروں میں ربر سول کے جوتے تھے۔

اُس شخص نے تار کا ننگا سرا قریب پڑی ہوئی ہتھوڑی سے لگایا، چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ اُس
کے کچھ پوچھنے پر بوڑھے نے ایک بار پھر سر ہلا دیا تو اُس شخص نے بجلی کی تار کا ننگا سرا بوڑھے
کے برہنہ جسم کے نازک ترین حصے سے لگا دیا..... بوڑھے کے منہ سے خوفناک فلک شگاف چیخ
نکلی۔ وہ اس طرح تڑپا کہ اُس کے جسم پر کھڑے ہوئے چاروں آدمی لڑھک گئے۔ بوڑھا، پختہ
فرش پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اُس کی چیخوں سے شاید آسمان بھی کانپ اُٹھا ہو۔
لیکن اُن درندوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

طارق نیچے اُتر آیا۔ ایک بوڑھے پر بربریت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اُس کی رُوح تک کانپ
اُٹھی تھی۔ بوڑھے کی چیخیں اُس کے بعد بھی دیر تک گونجتی رہیں۔ اُس رات طارق کو ڈھنگ سے
نیند بھی نہ آ سکی۔ جب بھی اُس کی آنکھ کھلتی، اُس کے ذہن میں بوڑھے کی چیخیں گونجنے لگتیں اور
وہ ہڑبڑا کر اُٹھ جاتا۔

دوسرے دن طارق پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ بوڑھا، ظہور قادری تھا جس نے مسلمانوں کے

پُرامن جلوس کی قیادت کی تھی۔ طارق جب چارلس سوبھراج کی کوٹھری میں داخل ہوا تو وہ دی
سے ٹیک لگائے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی انگریزی کا ایک اور اخبار بھی رکھا
تھا جسے طارق نے اُٹھالیا۔ پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی وہ اُچھل پڑا۔ اُس کے لئے دو خبریں قا
توجہ تھیں۔ پہلی خبر ظہور قادری کے متعلق تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ گزشتہ روز مسلمانوں کے
تشدد جلوس کی قیادت کرنے والے ظہور قادری کو پولیس نے ہنگامے، بلوے، قتل، لوٹ مار اور آ
پھوڑ کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ لیکن وہ گزشتہ رات پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا۔ پولیـ
نے اُسے مفرور قرار دے دیا تھا۔ اس خبر کے آخر میں سٹاپ پریس کے حوالے سے دو سطروں
اضافہ کیا گیا تھا کہ ظہور قادری کی لاش فیروز آباد کے ایک گندے نالے میں پڑی ہوئی ملی تھی
لاش پر تشدد کے نشانات تھے اور پولیس نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ قیادت کے مسئلے پر اختلاف کی بنـ
پر ظہور قادری کے ساتھیوں نے اُسے قتل کر کے لاش گندے نالے میں پھینک دی تھی۔

طارق کی رگوں میں خون کھول اُٹھا۔ بوڑھے ظہور قادری کو اُس کے سامنے تشدد کا نشانہ بنـ
گیا تھا اور عوام کو گمراہ کرنے کے لئے پولیس نے اُس کے بارے میں ایک من گھڑت کہانی اخبـ
میں چھپوادی تھی۔

دوسری خبر کشمیر سے متعلق تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیوں میں
ایک بار پھر تیزی آ گئی تھی۔ سرینگر اور آس پاس کے علاقوں میں بھارتی فوج اور کشمیری مجاہدیـ
میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ کشمیری مجاہدین کی سرگرمیوں پر قابو پانے
کے لئے بھارتی حکومت نے مزید فوج کشمیر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

طارق کے لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ اُس کے دوست بھارتی غاصبوں کے خلاف جہاد میں
مصروف تھے۔ اور وہ تین سال سے جیل میں بند تھا۔ اس عرصے میں نہ تو اُس پر کسی قسم کا مقدمہ
چلایا گیا تھا اور نہ ہی کبھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد کچھ عرصے تک تو اُن سے
پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ اور پھر گویا اُنہیں بالکل ہی بھلا دیا گیا تھا۔

لیکن بھارتی انٹیلی جنس اُسے اور سلیم کو نہیں بھولی تھی۔ اُس روز اخبار کی وہ خبر چونکا دینے والی
تھی کہ کشمیری مجاہدین نے سرینگر میں ایک مسلمان وزیر کی بیٹی کو اغواء کرلیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا
کہ کشمیری مجاہدین نے کسی بڑی شخصیت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وزیر کی بیٹی رابعہ، ڈاکٹر تھی۔ کشمیری
مجاہدین اُسے یرغمال بنا کر بھارتی حکومت سے اپنے کچھ مطالبات منوانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر رابعہ
کے اغواء سے ایک بھونچال سا آ گیا۔ سری نگر اور اس کے گردونواح میں بھارتی فوج اور پولیس
کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ گھروں کی تلاشی کے بہانے لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ کشمیری

مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت پر اُن کے گھروں اور دیگر املاک کو آگ لگا دی جاتی۔ اُن پر
گولیوں کی بارش کر دی جاتی۔ ڈاکٹر رابعہ کی بازیابی کے لئے بھارتی فوج اور پولیس نے کشمیری
مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے، وہ بربریت اور جبر و اکراہ کی ایک نئی داستان رقم کر رہے تھے۔
سینکڑوں بے گناہوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور درجنوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ لیکن
ڈاکٹر رابعہ کا سراغ نہ مل سکا۔

ڈاکٹر رابعہ کو لبریشن فرنٹ نے اغواء کیا تھا اور فرنٹ ہی نے بھارتی حکومت کو اپنے مطالبات
پیش کیے تھے۔ ان مطالبات میں سری نگر سے چند مجاہدین کی رہائی بھی شامل تھی۔ لیکن بھارتی
حکومت نے لبریشن فرنٹ کا کوئی بھی مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا اور مجاہدین کے ساتھ سختی سے
نمٹنے کی دھمکی دی۔

اگر کسی ہندو وزیر کی بیٹی کو اغواء کیا جاتا تو پورے ہندوستان میں بھونچال آ گیا ہوتا۔ مگر وہ
ایک مسلمان وزیر کی بیٹی تھی۔ ہندوؤں کو ایک مسلمان اور اُس کی بیٹی سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟
نئی دہلی میں بعض ہندو وزراء نے سرینگر کے مسلمان وزیر سے زبانی طور پر ہمدردی کا اظہار تو کیا
مگر عملی طور پر وہ کچھ نہیں کر سکے۔ البتہ وہ کشمیری مجاہدین کو خوفناک نتائج بھگتنے کی دھمکیاں ضرور
دیتے رہے۔

طارق اور سلیم کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ بھارتی انٹیلی جنس اُنہیں فراموش کر چکی تھی۔ جس
روز مسلمان وزیر کی بیٹی کے اغواء کی خبر شائع ہوئی، اُس سے اگلے روز انٹیلی جنس کے دو آفیسر تہاڑ
جیل پہنچ گئے اور دو محافظ طارق کو پکڑ کر ایک ایسے کمرے میں لے گئے، جہاں قیدیوں کو تشدد کا
نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اُس کمرے میں اذیت رسانی کے ایسے ایسے آلات سجے ہوئے تھے کہ اُنہیں
دیکھ کر ہی رُوح فنا ہو جاتی تھی۔

اُس کمرے میں انٹیلی جنس کے دو آدمیوں کے علاوہ ایک اور آدمی بھی تھا جسے دیکھ کر طارق
چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ناتھورام تھا۔ ایک کشمیری ہندو..... اُس کا اگرچہ سیاست سے کوئی
تعلق نہیں تھا۔ لیکن مقبوضہ کشمیر کی سیاست میں وہ ایک اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ بے پناہ دولت کا
مالک تھا۔ سرینگر اور مقبوضہ کشمیر میں جنونی اور انتہاء پسند ہندوؤں کی کئی تنظیموں کی پشت پناہی کر
رہا تھا۔ وہ ان تنظیموں کو مالی امداد کے علاوہ ہر قسم کا اسلحہ بھی فراہم کرتا۔ ناتھورام ایک موقع پر
مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ لیکن نجانے کس طرح دھوکہ دے کر بھاگ نکلنے میں
کامیاب ہوگیا؟

''مسٹر طارق.....!'' انٹیلی جنس کے ایک آفیسر نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے

کہا۔ ''کل پٹھان کوٹ سے حمید نامی ایک آدمی پکڑا گیا ہے۔ جس سے کچھ اہم قسم کی دستاویزات برآمد ہوئی ہیں۔ حمید نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک اہم مشن پر دہلی جا رہا تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن حمید نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا ہے کہ تین سال پہلے بھی طارق اور سلیم نامی دو آدمیوں کو اس مشن پر بھیجا گیا تو جو پکڑے گئے تھے۔ ہمارے آدمی تم سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر چھوڑ دیا گیا کہ شاید تم لوگ واقعی بے گناہ ہو اور کسی مشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ مشن کیا ہے جس کے لئے ابھی تک تربیت یافتہ ایجنٹوں کو بھیجا جا رہا ہے؟''

''کسی مشن کے بارے میں، میں نہ پہلے کچھ جانتا تھا اور نہ اب جانتا ہوں۔ لیکن تم لوگ حمید نامی اُس شخص سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جس نے یہ دلچسپ انکشافات کئے ہیں؟'' طارق نے جواب دیا۔

''اگر حمید زندہ ہوتا تو ضرور پوچھ لیتے۔'' انٹیلی جنس آفیسر نے جواب دیا۔ ''اُس نے کل رات خودکشی کر لی۔ اُس کی خودکشی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی کوئی اہم مشن ہے۔ ہم اس مشن کی تفصیلات جاننا چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ یہاں تمہارے کون کون سے ساتھی موجود ہیں؟ ہمیں اُن سب کے نام اور پتے معلوم ہونے چاہئیں۔''

''میں کسی مشن کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں تو اپنے دوست کے ساتھ روزگار کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہمیں پولیس نے گرفتار کر لیا اور بغیر کسی عدالتی کارروائی کے آج تک اس جیل میں بند ہیں۔'' طارق نے جواب دیا۔

''اگر تم اس منصوبے کے بارے میں بتا دو تو تمہیں اس جیل سے رہائی مل سکتی ہے۔'' انٹیلی جنس آفیسر نے کہا۔

''میں کچھ نہیں جا.....''

طارق کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی انٹیلی جنس آفیسر کا بھرپور گھونسہ اُس کے جبڑے پر پڑا۔ طارق کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اُس طرف ناتھو رام کھڑا تھا۔ اُس نے طارق کی کمر پر لات رسید کر دی۔ طارق، منہ کے بل فرش پر گرا۔

''کتے کے پلے.....!'' ناتھو رام چیخا۔ ''جو دہشت گرد مجھے سرینگر سے پکڑ کر لے گئے تھے، اُن میں تم بھی شامل تھے۔ میں تمہارا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں؟ ایک ایک کو پہچانتا ہوں۔ کل پٹھان کوٹ سے حمید نام کا جو دہشت گرد پکڑا گیا ہے، اُس نے تمہارا اور تمہارے ساتھی کا نام بتایا

تھا۔ میں تو سرینگر ہی سے حمید کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ حمید بھی تمہارے اسی گروہ کا آدمی ہے۔ میں تم سب کو باری باری سلاخوں کے پیچھے پہنچاؤں گا۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ میں کچھ نہیں جانتا۔'' طارق نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ناتھو رام نے اُس کی کھوپڑی پر ٹھوکر رسید کر دی۔ طارق بلبلا اُٹھا۔ دونوں آفیسر بھی اُس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کرنے لگے۔ طارق کی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

''یہ ایسے زبان نہیں کھولے گا۔'' ایک انٹیلی جنس آفیسر نے کہا اور اُس نے اپنے ساتھی کی مدد سے طارق کے کپڑے اُتار دیئے.....

طارق برہنہ ہو گیا۔ اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اُس کے ہاتھ اور پیر، دیوار میں لگے ہوئے آہنی کنڈوں میں پھنسا دیئے۔ اب طارق اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس آفیسر نے کونے میں رکھی ہوئی میز پر سے ایک سولڈرنگ آئرن اُٹھا لیا۔ اُس کے ساتھ ایک لمبی سی تار منسلک تھی۔ جس کا پلگ سوئچ بورڈ کے ساکٹ میں لگا کر سوئچ آن کر دیا گیا۔

طارق کی آنکھوں میں خوف اُبھر آیا۔ دو دن پہلے ہی تو اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ظہور قادری کو بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے اور پھر اُس کی لاش، فیروز آباد کے ایک گندے نالے سے ملی تھی۔

''اب بھی اپنی زبان کھولنا پسند کرو گے یا اپنی کارروائی شروع کروں.....؟'' انٹیلی جنس آفیسر نے سولڈرنگ آئرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کا اگلا سرا، ہیٹر کے ایل منٹ کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔

''نہیں..... میں کچھ نہیں جانتا۔'' طارق نے جواب دیا۔

انٹیلی جنس آفیسر نے سولڈرنگ آئرن کی سرخ نوک طارق کے دائیں بازو پر رکھ دی..... فضا میں گوشت اور چربی جلنے کی بو پھیلی اور طارق کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ سولڈرنگ آئرن کی نوک گوشت چیرتی ہوئی اندر تک دھنستی جا رہی تھی۔ طارق چیختے ہوئے دائیں بائیں سر جھٹک رہا تھا۔

انٹیلی جنس آفیسر نے سولڈرنگ آئرن کی سرخ نوک طارق کے بازو سے ہٹا کر اُس کے سینے پر ٹھیک دل کے مقام پر رکھ دی..... طارق کے منہ سے ایک بار پھر بھیانک چیخیں نکلنے لگیں۔ انٹیلی جنس آفیسر طارق کے جسم کو جگہ جگہ سے داغتا رہا۔ کمرے میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلتی رہی اور طارق کی چیخیں گونجتی رہیں۔ انٹیلی جنس آفیسر نے سولڈرنگ آئرن کی سرخ نوک طارق کی رانوں کے درمیان جسم کے نازک ترین حصے پر رکھ دی۔ اس مرتبہ طارق کے منہ سے نکلنے والی چیخ بہت

ہی بھیانک تھی۔ اور یہ اُس کی آخری چیخ تھی۔ اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

طارق کو جب ہوش آیا تو وہ اپنی کوٹھری میں تھا۔ سلیم اور کوٹھری کے دوسرے دونوں قیدی اُس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ سلیم کا چہرہ تکلیف کی شدت سے بالکل زرد ہو رہا تھا۔ طارق کے ساتھ بربریت کا یہ رویہ دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ کل کو اُس کی باری بھی آسکتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو آنے والے وقت کے لئے تیار کر رہا تھا۔

ایک ہفتے بعد طارق کے زخم مندمل ہونا شروع ہوئے تھے۔ اُسے نہ تو ہسپتال بھیجا گیا اور نہ ہی جیل کے ڈاکٹر سے اُس کا معائنہ کرایا گیا۔ اُسے مرہم دے کر دن میں دو تین مرتبہ زخموں پر لگانے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ مرہم باقاعدگی سے لگاتے رہنے سے دو ماہ بعد طارق چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ لیکن جسم کے بعض حصوں میں تکلیف اب بھی موجود تھی۔

ایک سال اور گزر گیا۔ اس طرح اُنہیں تہاڑ جیل میں آئے ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ چارلس سوبھراج کے پاس آنے والے اخبارات کے ذریعے وہ کشمیر کی صورتِ حال سے کسی حد تک واقف رہے تھے۔ چند ہفتے قبل ایک کشمیری حریت پسند لیڈر مقبول بٹ کو تہاڑ جیل میں لایا گیا۔ اُسے دوسرے قیدیوں سے الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ طارق اور سلیم نے مقبول بٹ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ البتہ وہ ایک بار پھر نظروں میں آجائیں گے۔ اور پھر ایک روز مقبول بٹ کو تہاڑ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اخبارات کے ذریعے وادی کشمیر اور دہلی میں کشمیری مسلمانوں کے مظاہروں کا پتہ چلا۔ لیکن جیل میں خاموشی رہی۔

وہ دسمبر کی ایک شام تھی۔ ایک دن پہلے بارش ہو چکی تھی جس سے سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آج بھی صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش کسی بھی لمحے شروع ہو سکتی تھی۔ بیشتر قیدی اپنی اپنی کوٹھریوں میں دُبکے بیٹھے تھے۔ قیدیوں کو جو پھٹے پرانے کمبل دیئے گئے تھے، وہ سردی روکنے کے لئے قطعی ناکافی تھے۔ طارق اور سلیم بھی دوسرے دونوں قیدیوں کے ساتھ کوٹھری میں دُبکے بیٹھے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ طارق اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کے قریب بیٹھ گیا اور آسمان سے برستی ہوئی بوندوں کو دیکھنے لگا۔ بیرک کے وسیع آنگن میں کھمبوں پر جلتے ہوئے بلبوں کی روشنی میں برستی ہوئی بوندیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرالی کی آواز سنائی دی تو کوٹھری کا ایک قیدی برتن لے کر دروازے کے قریب آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد کھانے کی ٹرالی دروازے کے سامنے آ کر رُکی۔ ٹرالی کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک کھانا

تقسیم کرنے والا اور دوسرا محافظ۔

محافظ نے دروازے کا تالا کھول دیا۔ طارق کا ساتھی، برتن لے کر باہر آ گیا۔ طارق بھی اُس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ دو برتن اُس نے سنبھال لئے۔ دوسرا قیدی اپنا اور اپنے ساتھی کا کھانا لے کر مُڑا تو طارق نے برتن آگے بڑھا دیئے۔

''کل صبح دس بجے لیٹرین کے قریب ملنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' ٹرالی والے نے برتنوں میں کھانا ڈالتے ہوئے نہایت مدھم لہجے میں سرگوشی کی۔

طارق نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ، وہ آدمی نہیں تھا جو روزانہ کھانا لے کر آتا تھا۔ یہ کوئی تبتی تھا۔ اور ظاہر ہے، یہ بھی کوئی قیدی ہی تھا۔ طارق یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کسی تبتی قیدی کو اُس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ اُس نے کن انکھیوں سے محافظ کی طرف دیکھا جو دو قدم کے فاصلے پر چابیوں کا گچھا لئے کھڑا تھا۔ اُس نے تبتی کی سرگوشی نہیں سنی تھی۔ طارق کھانا لے کر کوٹھری میں آ گیا۔ محافظ نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور ٹرالی والے کے ساتھ اگلی کوٹھری کی طرف بڑھ گیا۔

طارق رات بھر یہ سوچتا رہا کہ وہ تبتی کون تھا؟ اور اُس کا اُس سے کیا تعلق تھا۔ اُس نے سلیم کو اُس تبتی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

صبح دس بجے طارق کسی نہ کسی طرح اُس جگہ پہنچ گیا جہاں اس بلاک کے قیدیوں کے لئے کئی ٹائلٹ بنے ہوئے تھے۔ صفائی کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اس حصے میں دُور تک تعفن پھیلا ہوا تھا۔ پانچ چھ قیدی اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اُن سے چند قدم دُور دو مسلح محافظ بھی مستعد کھڑے تھے۔ ٹائلٹ سے تقریباً سو گز آگے جیل کی بیرونی فصیل تھی جس میں جگہ جگہ بنے ہوئے واچ ٹاورز پر بھی مسلح محافظ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ٹائلٹ اور بیرونی فصیل کے درمیان جیل کا ایک اور بلاک تھا۔ یہ بلاک قید تنہائی بھگتنے والوں کے لئے مخصوص تھا اور عام قیدیوں کے لئے اس طرف جانا ممکن نہیں تھا۔

طارق ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی کمبل میں لپٹا ہوا ایک قیدی اُس کے پاس آ گیا۔ یہ وہی تبتی تھا جس نے گزشتہ رات کھانا دیتے ہوئے اُس سے سرگوشی کی تھی۔ اُس نے کمبل اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ آدھا چہرہ بھی چھپ کر رہ گیا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے.....'' تبتی نے اُس کے قریب رُک کر سرگوشی کی۔ اُس کا نصف چہرہ کمبل میں چھپا ہونے کی وجہ سے کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اُس نے کوئی بات کی تھی۔

''میں تو تمہیں نہیں جانتا۔تم کون ہو.....؟'' طارق نے بھی سرگوشی میں کہا۔

''تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔تمہارے لئے رحمان بابا کا پیغام ہے۔'' تبتی نے سرگوشی کی۔

رحمان بابا کے نام پر طارق چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔اُس کے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ یہ اُسے پھنسانے کی کوئی سازش تو نہیں تھی؟ اس طرح وہ لوگ یہ ثبوت تو حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اُس کا تعلق کشمیری حریت پسندوں کی تنظیم سے ہے؟

''رحمان بابا کون ہے.....اور تم اُسے کیسے جانتے ہو؟'' طارق نے پوچھا۔

''تمہارے کچھ ہمدرد، دہلی میں موجود ہیں جو تمہیں اس جیل سے رہائی دلانا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ اس جیل کا بہت پرانا قیدی ہوں اس لئے کبھی کبھار محافظوں کے ساتھ مجھے جیل سے باہر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔چند روز پہلے تمہارے آدمیوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور تمہاری رہائی میں مدد دینے کے لئے اُنہوں نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔میں جانتا ہوں کہ اگر تمہارے فرار میں میرا ملوث ہونا ثابت ہو گیا تو جیل کے درندہ صفت محافظ میری کھال بھی کھینچ لیں گے۔لیکن دولت میں بڑی کشش ہوتی ہے۔تمہارے آدمیوں نے کہا تھا کہ میں رحمان بابا کے حوالے سے تم سے بات کروں، تاکہ تم کوئی شبہ نہ کر سکو۔''

''تم تو خود طویل عرصے سے جیل میں ہو۔مجھے اور میرے ساتھی کو یہاں سے کیسے نکال سکو گے؟'' طارق نے کہا۔

''میں جب بھی چاہوں، جیل سے فرار ہو سکتا ہوں۔لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔کیونکہ میری سزا پوری ہونے میں صرف تین مہینے رہ گئے ہیں۔''

''ہمیں یہاں سے کس طرح نکالو گے.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''پرسوں شام کو کھانے کے بعد ٹھیک سات بجے تم اپنے ساتھی کو لے کر اسی جگہ آ جانا۔''

''لیکن شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے قیدیوں کو کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔''

''پرسوں ہندوؤں کا ایک قومی تہوار ہے۔ہر تہوار پر قیدیوں کو بھی کچھ رعایت دی جاتی ہے۔ پرسوں رات نو بجے سے پہلے قیدیوں کو بیرکوں میں بند نہیں کیا جائے گا۔اس طرح تمہیں یہاں آنے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔تم اپنے ساتھی کو لے کر ٹھیک سات بجے یہاں پہنچ جانا۔اب جاؤ! وہ محافظ اس طرف آ رہا ہے۔'' تبتی نے کہا۔

اُسی وقت ایک قیدی ٹائلٹ سے نکلا۔باہر کھڑا ہوا ایک قیدی اندر جانے کے لئے آگے بڑھا لیکن طارق اُسے دھکا دے کر ایک ہاتھ سے پیٹ دبائے تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا ٹائلٹ

میں داخل ہو گیا۔

طارق کو دن بھر سلیم سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔اُس روز سلیم کو کسی دوسری جگہ کام پر لگا دیا گیا تھا۔اُن کی ملاقات رات کو اُس وقت ہوئی جب تمام قیدیوں کو اُن کی کوٹھریوں میں بند کیا گیا۔اُس رات بھی کھانا تقسیم کرنے والا وہی تبتی تھا۔لیکن اس وقت اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سردی سے بچنے کے لئے کمبل لپیٹ کر سمٹ کر بیٹھے رہے۔ایک قیدی نے اُونچی آواز میں ایک پہاڑی گیت شروع کر دیا۔اُس کا تعلق پہل گام سے تھا اور وہ قتل کے جرم میں سزا بھگت رہا تھا۔

''یہ سب کچھ کہیں دھوکہ نہ ہو۔'' سلیم نے اُس کی بات ختم ہونے پر کہا۔''یہ لوگ مجاہدین سے ہمارا تعلق ثابت کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔بے پناہ تشدد کے باوجود وہ لوگ ہماری زبان نہیں کھلوا سکے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لوگ اس طرح سے ہمیں پھنسانا چاہتے ہوں؟''

''میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔''اگر ایسا ہوتا تو اب تک وہ ہمیں یہاں سے لے جا چکے ہوتے۔اور دوسری بات یہ کہ اُس تبتی قیدی نے رحمان بابا کا حوالہ دیا تھا۔ اور تم جانتے ہو کہ رحمان بابا کا نام ہمارا سیکرٹ کوڈ ہے۔کوڈ نہایت اہم موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی اور مجاہد پر تشدد کر کے اُنہوں نے یہ نام دریافت کر لیا ہو۔اور اب اُس کے ذریعے ہمیں پھنسانا چاہتے ہوں۔'' سلیم نے کہا۔

''ایسے نہیں ہو سکتا۔'' طارق نے جواب دیا۔''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہر مجاہد سے حلف لیا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں کوئی راز فاش نہیں کرے گا۔ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ پکڑے جانے والے مجاہدین نے تڑپ تڑپ کر اپنی جان تو دے دی لیکن اپنی تنظیم سے متعلق کوئی راز فاش نہیں کیا۔میری اور اپنی ہی مثال لے لو۔تمہارے ساتھ اس جیل میں کیا کچھ نہیں ہوا۔کیا تم نے زبان کھولی تھی؟''

''نہیں..... میں جان دے دُوں گا مگر زبان نہیں کھولوں گا۔'' سلیم کے لہجے میں عزم تھا۔

''اس میں اگرچہ رِسک ہے۔مگر اُس تبتی قیدی کی بات پر ہمیں اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔'' طارق نے کہا۔

''بالفرض اُس کی مدد سے ہم اس جیل سے فرار ہو بھی گئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم جائیں گے کہاں؟ ہمارے جوٹھکانے تھے، وہ انٹیلی جنس کی نظروں میں آ چکے ہیں۔ظاہر ہے، ہم

سڑکوں پر تو دندناتے نہیں پھریں گے۔'' سلیم نے کہا۔

''یہاں سے نکل جائیں تو چھپنے کا کوئی ٹھکانہ بھی مل جائے گا۔'' طارق نے کہا۔ سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اور پھر وہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ اگلا دن اور اُس سے اگلے دن گزارنا اُن کے لئے مشکل ہو گیا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ تیسرے دن ہندوؤں کا کوئی تہوار تھا۔ صبح سے دوپہر تک تمام قیدیوں کو اپنے اپنے بلاکس کی صفائی پر لگا دیا گیا۔ اس تہوار کے حوالے سے قیدیوں کو کچھ رعایت دی گئی تھی۔ جیل کے ہر بلاک میں قیدیوں کے لئے کھیلوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

طارق اور سلیم جس بلاک میں تھے، وہاں دوسرے کھیلوں کے علاوہ والی بال کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ شام سات بجے والی بال کا فائنل تھا۔ ایک طرف قیدیوں کی ٹیم تھی اور دوسری طرف جیل کے محافظوں کی۔ طارق اور سلیم عام طور پر والی بال کھیلا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ ٹیم میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ اُن تماشائیوں میں شامل تھے جو گراؤنڈ کے چاروں طرف جمع تھے۔

وہ دونوں کمبل اوڑھے کھڑے تھے کہ ایک اور قیدی اُن کے قریب آ گیا۔ اُس نے بھی کمبل لپیٹا ہوا تھا۔ وہ طارق کے بالکل ساتھ مل کر کھڑا ہو گیا۔ طارق نے گردن گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔ یہ وہی تبتی قیدی تھا۔ وہ طارق کی طرف جھک گیا اور اُس کے کان میں اس طرح سرگوشی کی کہ قریب کھڑے ہوئے دوسرے قیدی کے کان تک آواز نہیں جا سکی۔

''دائیں طرف سے ٹائلٹ کا ڈبلیو سی اپنی جگہ سے اُکھڑا ہوا ہے۔ اُسے اُٹھا کر گٹر میں گھس جانا۔ گٹر کا تعفن تمہاری طبیعت کو ناگوار تو کرے گا لیکن جیل سے نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ جیل کی فصیل سے تقریباً سو گز دُور گٹر کا ڈھکن کھلا ہوا ہے۔ وہیں جھاڑیوں میں ایک آدمی تمہارا منتظر ہو گا۔ اُس کا نام پشکر ہے۔ وہ تمہیں تہاڑ بستی میں چندن نامی ایک ہندو کے گھر پہنچا دے گا۔ تمہیں اُس وقت تک چندن کے گھر میں رہنا پڑے گا، جب تک تم لوگوں کی تلاش کے ہنگامے سرد نہ پڑ جائیں۔ اس وقت صرف فصیل کی برجیوں کے محافظ چوکس ہیں۔ تم کسی کی نظروں میں آئے بغیر ٹائلٹ تک جا سکتے ہو۔''

طارق اُس کی تمام باتیں غور سے سن رہا تھا۔ پشکر اور چندن کے نام سے ایک لمحے کو اُس کے ذہن میں شبہے نے سر اُبھارا تھا۔ لیکن پھر اُس نے تبتی کی ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''یہ ٹارچ رکھ لو! کام آئے گی۔'' تبتی قیدی نے کمال کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پنسل ٹارچ اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

والی بال کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ کھیل دیکھنے والے قیدی ہر بال پر شور مچا رہے تھے۔

طارق دوسری طرف کھڑے ہوئے سلیم کی طرف جھک گیا۔ ''ٹھیک ایک منٹ بعد تیسرے ٹائلٹ میں پہنچ جانا۔'' اُس نے سلیم کے کان میں سرگوشی کی۔

طارق ایک سیکنڈ وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے ہٹ کر ٹائلٹ کی طرف چلا گیا۔ اس طرف نیم تاریکی تھی۔ مرغیوں کے ڈربوں جیسے چھوٹے چھوٹے ٹائلٹ بنے ہوئے تھے جن کے اندر تاریکی تھی۔ طارق، تیسرے ٹائلٹ میں گھس گیا اور پنسل ٹارچ کی روشنی میں ڈبلیو سی کا جائزہ لینے لگا۔ سیمنٹ کی ایک بھاری سل تھی جس کے درمیان میں سوراخ بنا ہوا تھا۔ اُس سوراخ کے دونوں طرف پیر رکھنے کی جگہ تھی۔ سیمنٹ کی یہ سل گٹر کے اُوپر فٹ تھی۔ چاروں طرف ایک باریک سی جھری نظر آ رہی تھی۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس سل کو سیمنٹ لگا کر جوڑا نہیں گیا تھا بلکہ ویسے ہی رکھی ہوئی تھی۔ وہ جھک کر اُس سل کو اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ہاتھ ڈالنے کی جگہ نہیں تھی۔ اور ویسے بھی سل بہت بھاری تھی۔

ٹھیک ایک منٹ بعد قدموں کی آواز سن کر اُس نے ٹارچ بجھا دی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''طارق.....!'' تاریکی میں ہلکی سی سرگوشی اُبھری۔

''اندر آ جاؤ!'' طارق نے سلیم کی آواز پہچان کر جواب دیا۔

سلیم اندر آ گیا۔ طارق نے ایک بار پھر پنسل ٹارچ روشن کر لی اور سل کا جائزہ لینے لگا۔

''اس سل کو اُٹھانا ہے۔ یہ گٹر ہی ہمارے فرار کا راستہ ہے۔'' طارق نے کہا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ یہاں کھڑے ہونے سے ہی دماغ پھٹا جا رہا ہے اور تم ہو کہ غلاظت سے بھرے ہوئے گٹر میں اُترنا پڑے گا؟'' سلیم نے کہا۔

''مجبوری ہے۔'' طارق نے سرگوشی کی۔ ''اپنے کاز کے لئے ہمیں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ہم ایک مقصد لے کر یہاں آئے تھے اور اب وہ مقصد ہمیں بلا رہا ہے۔ وطن کی سرزمین کو ہماری ضرورت ہے۔ سمجھو! کہ یہ بھی ہمارے لئے ایک امتحان ہے۔ دیر مت کرو۔ میرے ساتھ مل کر یہ سل اُٹھاؤ!''

اس مرتبہ سلیم نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ دونوں مل کر سل اُٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن سل کے چاروں طرف جھری اتنی تپلی تھی کہ اُنگلی بھی داخل نہیں ہو سکتی تھی جس سے سل کو اپنی جگہ سے ہلایا جا سکتا۔ طارق، ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں لکڑی کا بالشت بھر لمبا ایک ٹکڑا نظر آ گیا۔ یہ دراصل ایک استعمال شدہ مسواک تھی جسے کسی نے یہاں پھینک دیا تھا۔ طارق نے مسواک اُٹھا لی اور سل کی جھری میں پھنسانے کی کوشش کرنے

لگا۔ پہلی مرتبہ کی کوشش میں مسواک ٹوٹ گئی۔ وہ دوبارہ کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ سل اپنی جگہ سے کچھ اُوپر اُٹھ گئی۔ سلیم نے فوراً ہی اپنی اُنگلیاں پھنسا دیں۔ اُنگلیوں کے زور سے سل تھوڑی سی اُوپر اُٹھ گئی۔ اب طارق نے بھی اُنگلیاں پھنسا دیں اور وہ دونوں آہستہ آہستہ سل کو اُوپر اُٹھانے لگے۔ سل اُٹھتے ہی انتہائی ناگوار بو کا بھبکا اُن کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اُن دونوں کو اپنے دماغ کی نسیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔ طارق نے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ نیچے گٹر خاصا گہرا تھا اور اُس میں اُترنے کے لئے دیوار کے ساتھ سیڑھیوں کی طرح آہنی سریئے لگے ہوئے تھے۔

اُسی لمحے باہر بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ یقیناً محافظ تھے جو دو سے زیادہ تھے۔ ''جلدی کرو..... نیچے اُترو! محافظ اسی طرف آ رہے ہیں۔ شاید انہیں کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے۔'' طارق نے ٹارچ بجھاتے ہوئے سرگوشی کی۔

تعفن سے سلیم کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے لیکن وہ نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوار میں لگے ہوئے سریوں پر پیر رکھتا ہوا گٹر میں اُتر گیا۔ محافظ کے بھاری قدموں کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ طارق چوتھی سیڑھی پر رُک گیا۔ اُس نے ایک پیر دیوار میں لگے ہوئے سیڑھی نما سریئے پر رہنے دیا اور دوسرا پیر مخالف دیوار کے ساتھ جما کر دونوں ہاتھوں سے سیمنٹ کی بھاری سل کو اپنے اُوپر کھینچنے لگا۔ سل خاصی بھاری تھی۔ وہ کسی قسم کی آواز بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اُسے سل کو کھینچنے میں مزید دُشواری پیش آ رہی تھی۔ سل آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر آ رہی تھی۔ محافظ کے قدموں کی آواز بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ سل میں چوتھائی انچ کے قریب جھری رہ گئی اور اس جھری سے ہلکی سی روشنی دیکھ کر طارق کو سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ محافظ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی تھی۔ طارق نے سل کو آخری مرتبہ ہلکا سا جھٹکا دیا۔ سل آواز کئے بغیر اپنی جگہ پر فٹ ہو گئی۔ اس کے بعد صرف ایک سیکنڈ بعد ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی کا بھاری پیر، سل پر پڑا ہو۔

طارق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے اپنا سانس تک روک لیا۔ اُسے اپنے سر پر دھماکے سے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ''رامو! وہ دونوں کہیں بھی نہیں ہیں۔ تمام ٹائلٹ بھی خالی پڑے ہیں۔ اور یہ دو کمبل مجھے وہاں پڑے ہوئے ملے ہیں۔'' ایک محافظ کی آواز طارق کی سماعت سے ٹکرائی اور اس کے فوراً ہی بعد سیٹیوں کی آواز گونجنے لگی۔

طارق کی شرٹ پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ اُس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ٹانگیں لرزنے لگیں اور وہ اپنے آپ کو سنبھالے آہستہ آہستہ لوہے کے سریوں پر نیچے اُترنے لگا۔

☆.....☆.....☆

سیٹیوں کی آوازیں باتھ رُومز کے آس پاس ہی گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ سر پر چھت ہونے کی وجہ سے طارق کو یہ آوازیں دبی دبی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ البتہ دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی دھمک سر پر بہت واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ طارق دیوار میں لگے ہوئے آہنی سریوں پر قدم جماتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے اُترتا رہا۔ اُس کے ہاتھ نمی میں تر ہو رہے تھے۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ نمی پسینے کی تھی یا غلاظت کی؟

چھٹی سیڑھی سے نیچے اُترنے کے بعد اُسے یوں لگا جیسے اُس کا پیر کیچڑ میں دھنس گیا ہو۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سیڑھیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اُس کا پیر کیچڑ میں دھنستا چلا گیا اور بالآخر اُس کا پیر ایک جگہ ٹِک گیا۔ اُس نے دوسرا پیر بھی نیچے رکھ لیا۔ وہ پنڈلیوں تک کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔

''سلیم.....!'' اُس نے نہایت مدھم سرگوشی میں سلیم کو پکارا۔

''میں اس طرف ہوں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلے آؤ!'' جواب میں سلیم کی بہت ہلکی سی سرگوشی سنائی دی۔

طارق کے اندازے کے مطابق سلیم اُس سے تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ طارق ابھی قدم آگے بڑھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے سر کے عین اُوپر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیختی ہوئی سی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ارے رامو..... یہ دیکھ! یہ ڈبلیو سی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے، وہ لوگ گٹر میں اُتر گئے ہیں۔''

طارق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سنسنی کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے ڈبلیو سی والی سیمنٹ کی اُس بھاری سل کو اُس کی جگہ سے ہٹائے جانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ طارق نے سر اُوپر اُٹھا کر دیکھا۔ سل اپنی جگہ سے تھوڑی سی ہٹ گئی تھی اور جیل کی سائرن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ شور کی بہت سی دیگر آوازیں بھی اُس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کی تلاش زور و شور سے شروع ہو چکی

تھی۔

''ٹارچ جلاؤ.....اور نیچے جھانک کر دیکھو!'' اُوپر سے ایک آواز سن کر طارق جیسے ہوش میں آ گیا۔ اُس نے تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھ دیوار پر جما کر اُس طرف بڑھنے لگا جس طرف سے سلیم کی آواز سنائی دی تھی۔ دو قدم اُٹھا کر وہ گٹر کے اگلے بند حصے میں داخل ہو گیا۔ ٹھیک اُسی لمحے روشنی کا ہالا اُس جگہ پڑا جہاں چند سیکنڈ پہلے وہ موجود تھا۔ وہ آواز پیدا کئے بغیر مزید آگے سرکتا چلا گیا اور سلیم کے پاس پہنچ گیا۔ تعفن سے اُس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا اور گھٹن سے سانس بھی رُکتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''نیچے اُتر کر دیکھو! اگر وہ لوگ گٹر میں اُترے ہیں تو زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔ ٹارچ کی روشنی میں نظر آ جائیں گے۔'' اُوپر سے ایک آواز سنائی دی۔

''نیچے غلاظت بھری ہوئی ہے۔ میں اس میں کیسے اُتر سکتا ہوں؟'' دوسری آواز سنائی دی۔

''اگر تمہیں اپنی نوکری بچانی ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ جلدی کرو!'' پہلی آواز اُبھری۔ اس مرتبہ لہجے میں تحکم کا عنصر تھا۔

''ٹھیک ہے مائی باپ!'' دوسری آواز میں بے بسی تھی۔

طارق نے سلیم کا بازو پکڑ کر دبا دیا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ تقریباً پانچ گز کے بعد گٹر کی یہ سرنگ دائیں طرف مُڑ گئی۔ وہ دونوں اس طرف گھومے ہی تھے کہ سرنگ میں روشنی دکھائی دی۔ گٹر میں اُترنے والا محافظ غالباً آخری سیڑھی پر قدم رکھے اس طرف روشنی ڈال رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس کی آواز سنائی دی۔

''یہاں کوئی نہیں ہے حوالدار! میرا خیال ہے وہ لوگ گٹر میں نہیں اُترے۔ بلکہ کسی اور طرف گئے ہوں گے۔ ممکن ہے، ابھی تک جیل میں ہی کسی جگہ چھپے ہوئے ہوں اور باہر نکلنے کے لئے موقع کی تلاش میں ہوں۔ اُنہیں جیل ہی کے کونوں کھدروں میں تلاش کیا جانا چاہئے۔'' گٹر میں اُترے ہوئے محافظ نے چیخ کر کہا۔

طارق اور سلیم اپنی جگہ پر سانس روکے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد جب اُوپر سے ڈبلیوسی کی بھاری سل رکھے جانے کی آواز سنائی دی تو دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''اُس تبتی نے کہا تھا کہ جیل کی فصیل کے بعد ہمیں تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ اور میرے خیال میں فصیل یہاں سے تقریباً بیس گز دُور ہے۔ اب جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اگر اُن لوگوں نے باہر بھی محافظ بھیج دیئے تو گٹر سے نکلتے ہی دھر لئے جائیں گے۔'' طارق نے کہا۔

''یہاں رُکنے کو کس کافر کا دل چاہتا ہے؟ بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔'' سلیم نے جواب دیا۔

طارق نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسل ٹارچ روشن کر لی اور اُس کی مدھم روشنی میں وہ دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، گھٹن میں اضافہ ہو رہا تھا اور اُنہیں سانس لینے میں دُشواری پیش آ رہی تھی۔

ایک جگہ گٹر کی سرنگ بائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ طارق کے اندازے کے مطابق وہ اب تک تقریباً اسّی گز کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور اُنہیں چالیس پچاس گز کا فاصلہ مزید طے کرنا تھا۔ وہ رُکے بغیر آگے بڑھتے رہے۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، گھٹن کم ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ ایک جگہ رُک گئے۔ یہاں تازہ ہوا آ رہی تھی۔ طارق نے ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیوار میں ایک جگہ لوہے کی سلاخیں سیڑھیوں کی طرح لگی ہوئی نظر آئیں۔ وہ اُس دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ طارق نے سر اُوپر اُٹھا کر دیکھا۔ بہت دُور آسمان پر ستارے جھلملاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''تم میرے پیچھے آؤ!'' طارق کہتا ہوا آہنی سریوں پر چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ رُک گیا اور بڑی احتیاط سے گردن باہر نکال کر جھانکنے لگا۔ اُس کے چاروں طرف تاریکی اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سامنے اور دائیں بائیں خاصے فاصلے پر روشنیاں جگمگاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا، جیل کی اُونچی دیوار پر جگہ جگہ بنے ہوئے واچ ٹاورز میں بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔

''پشکر!'' طارق نے تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ سناٹے میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ دوسری مرتبہ سرگوشی کے جواب میں دائیں طرف تقریباً دس گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی اُبھری اور ایک سرگوشی سنائی دی۔

''طارق بابو! میں اس طرف ہوں۔''

''باہر آ جاؤ سلیم!'' طارق نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا اور گٹر سے باہر آ گیا۔

اس کے بعد سلیم بھی گٹر سے نکل آیا۔ وہ ان جھاڑیوں کے قریب پہنچ گئے جہاں سے سرگوشی سنائی دی تھی۔ تاریکی میں اُس شخص کے چہرے کے نقوش دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن وہ ایک دُبلا پتلا اور دراز قامت آدمی تھا۔

''اُس طرف تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلو!'' پشکر نے کہا۔

وہ دونوں اُس کے پیچھے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ اُنہوں نے جھاڑیوں میں

ابھی تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ دائیں طرف سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپ کی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ گاڑی تیزی سے اُسی طرف آ رہی تھی۔

''بھاگو..... یہ پولیس ہے۔'' پشکر نے کہا اور تیزی سے ایک طرف بھاگ اُٹھا۔ طارق اور سلیم نے بھی اُس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ جیپ قریب آ رہی تھی۔ اچانک سلیم کا پیر جھاڑیوں میں اُلجھا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ وہ اُٹھ کر بھاگا ہی تھا کہ فضا، فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ اس کے ساتھ ہی سلیم کی فلک شگاف چیخ طارق کی سماعت سے ٹکرائی۔ اُس نے رُک کر پیچھے دیکھا سلیم گر چکا تھا۔ طارق دوڑ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ سلیم کے جسم میں تین چار گولیاں لگی تھیں طارق نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی تو سلیم کراہ کر رہ گیا۔

''تم بھاگ جاؤ طارق! میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ میرے جسم میں کئی گولیاں پیوست ہو چکی ہیں۔ میرا خیال دل سے نکال دو..... وطن کو تمہاری ضرورت ہے۔ بھاگ جاؤ..... جلدی کرو!''

سلیم کی حالت واقعی ایسی نہیں تھی کہ اُسے ساتھ لے جایا جا سکتا۔ طارق نے تیزی سے قریب آتی ہوئی جیپ کی طرف دیکھا اور جھاڑیوں میں ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ لاتعداد گولیاں طارق کے دائیں، بائیں اور سر کے اُوپر سے گزر گئیں۔ لیکن وہ ایک عمارت کے تاریک ہیولے کی طرف دوڑتا رہا۔ پشکر بھی اُس نے اُسی عمارت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ ایک کچا مکان تھا جو کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ طارق جیسے ہی ایک شکستہ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا، کسی سے ٹکرا گیا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ پشکر تھا۔

''کک..... کون ہو تم.....؟'' پشکر ہکلایا۔

''میں طارق ہوں۔ پولیس کی جیپ اسی طرف آ رہی ہے۔ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پہنچنے کی کوشش کرو!'' طارق بولا۔

''مجھے پہلے ہی اس قسم کی صورتحال کا اندازہ تھا۔ تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟''

''وہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گیا ہے۔ اگر تم بھی اپنا جسم چھلنی نہیں کروانا چاہتے تو جلدی نکل چلو یہاں سے.....'' طارق نے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ.....!'' پشکر کہتے ہوئے ایک شکستہ دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسی لمحے فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ فائرنگ تقریباً تین سو گز دُور ہوئی تھی۔ دونوں کھنڈر نما مکان سے نکل کر مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔ تقریباً دو سو گز آگے ایک چھ

سی بستی تھی۔ بستی پر سناٹا طاری تھا۔ ابھی اگرچہ رات کے نو بھی نہیں بجے تھے لیکن فائرنگ کی آوازیں سن کر لوگ گھروں میں دُبک گئے تھے۔

بستی کے کتوں نے بھونک کر اُن کا استقبال کیا۔ لیکن وہ کتوں کو ہشکارتے ہوئے دوڑتے رہے۔ اور جلد ہی اُس بستی سے نکل گئے۔ بستی سے تقریباً پچاس گز آگے ایک بہت بڑا برساتی نالہ تھا جس کے دوسری طرف شہر کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ پشکر بڑی تیزی سے نالے کے ڈھلوان کنارے پر اُترتا چلا گیا۔ طارق بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔

کنارے کے قریب نالے کا پانی پنڈلیوں تک تھا۔ جبکہ درمیان میں کمر تک گہرا تھا۔ بہاؤ زیادہ تیز نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے پانی میں چلتے رہے اور جلد ہی نالے کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے جہاں پختہ سڑک تھی۔ سڑک کے دوسری طرف پارک تھا اور پارک کے پرلی طرف شہر کی باقاعدہ آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ سڑک پر بائیں طرف سے ایک گاڑی کو آتے دیکھ کر پشکر نے طارق کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ کر سڑک عبور کر کے پارک میں داخل ہو گیا۔

پارک میں سناٹا تھا۔ پولز پر جلتی ہوئی بتیاں اونگھتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ سردی کی وجہ سے پارک میں کسی ذی رُوح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ دونوں بلند پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چلتے رہے۔ اچانک ایک جگہ وہ رُک گئے۔ جھاڑیوں کے دوسری طرف کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پشکر نے طارق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں آگے بڑھ کر جھاڑیوں کے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ طارق بھی دبے قدموں آگے بڑھ آیا۔ دوسری طرف اگرچہ تاریکی تھی لیکن دو انسانی سائے ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ اُن میں ایک مرد تھا اور ایک عورت۔

پشکر نے طارق کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود یکدم اُچھل کر جھاڑیوں کے دوسری طرف پہنچ گیا..... عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بدحواسی میں اپنی بکھری ہوئی ساڑھی سمیٹنے لگی۔ وہ آدمی بھی بہت زیادہ بدحواس ہو گیا تھا۔

''کک..... کون ہو تم.....؟'' وہ آدمی ہکلایا۔ خوف سے اُس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

''یہ تو تمہیں تھانے چل کر پتہ لگے گا کہ میں کون ہوں۔'' پشکر نے کہا۔ ''یہ لونڈیا کون ہے..... اور تم کون ہو.....؟''

''میں راجکمار ہوں۔ اور یہ..... یہ میری پتنی ہے۔'' وہ شخص ہکلایا۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس

کے درمیان رہی ہوگی۔ جبکہ عورت کی عمر بھی پچیس کے لگ بھگ تھی۔

''یہ تمہاری پتنی ہے؟'' پشکر غرایا۔ ''پتنی سے محبت کا اظہار گھر میں نہیں کر سکتے، جو یہاں جھک مار رہے ہو؟ پینٹ قمیص اُتار دو! اور یہ کوٹ اور جوتے بھی۔

''آ..... آپ کیا کر رہے ہیں مہاراج.....؟''

''جلدی کرو..... میں نے جو کچھ کہا ہے، اُس پر عمل کرو!'' پشکر غرایا۔

اُس شخص نے جلدی سے جوتے، کوٹ اور قمیص پتلون اُتار دی۔ اب اُس کے جسم پر بنیان اور انڈرویئر کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ پشکر نے اُس کے کپڑے اور جوتے اُٹھا کر جھاڑی کے دوسری طرف پھینک دیئے۔ طارق مسکرا دیا۔ وہ دل ہی دل میں پشکر کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ طارق کے جسم پر جیل کا لباس تھا اور اس لباس میں وہ لوگوں کے سامنے نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرح پارک سے گزرتے ہوئے اُس کے لئے لباس کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔ طارق نے جیل کا لباس اُتار کر اُس نوجوان کے کپڑے پہن لئے جو اُس کے جسم پر کسی حد تک ڈھیلے تھے۔ جوتے بھی کام دے گئے۔ اُس نے جیل کا لباس، گٹھڑی سی بنا کر گھنی جھاڑی میں ٹھونس دیا اور اُس جھاڑی کے اُوپر سے کود کر سامنے آ گیا۔ اُس شخص کی حالت دیکھ کر طارق کو ہنسی آ گئی۔ وہ سردی اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''سر.....!'' پشکر نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دو پرندے پکڑے ہیں۔ چونچیں لڑا رہے تھے یہاں جھاڑیوں میں چھپ کر۔ ان کا کیا کریں..... لے چلیں تھانے اور بند کر دیں حوالات میں؟''

''مجھے معاف کر دیجئے..... بھگوان کے لئے مجھے شما کر دیجئے۔ اگر میرے پتی کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مجھ سے جو چاہیں، لے لیں۔ میں آپ کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔''

''تمہارا پتی کیا کرتا ہے.....؟'' طارق نے کہتے ہوئے لڑکی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ دُور سے آنے والی مدھم روشنی میں وہ خاصی خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔

''جی وہ..... وہ سیٹھ مادھولعل کا سیوا کار ہے۔ آج دوپہر مالک کے ساتھ بریلی گیا ہے۔ تین چار دن بعد آئے گا۔'' عورت نے جواب دیا۔

''پتی، سیٹھ مادھولعل کا سیوا کار ہے اور تم نے یہاں جنتا سیوا شروع کر رکھی ہے۔'' طارق نے اُسے گھورا۔

''مجھے شما کر دیجئے سرکار! مجھے تھانے مت لے کر جایئے..... اس کے بدلے جو بھینٹ

چاہے، مجھ سے لے لیجئے۔''

''تم اس وقت جو بھینٹ دینا چاہتی ہو، اس سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کہاں رہتی ہو؟ اور گھر میں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''شاہجہان آباد میں میرا فلیٹ ہے۔ جہاں میرے سوا گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے تو اس کو اپنے گھر کیوں نہیں لے کر گئیں.....؟'' پشکر نے اُسے گھورا۔

''یہ مجھے بازار میں مل گیا تھا سرکار! بہلا پھسلا کر مجھے یہاں لے آیا۔'' لڑکی نے جواب دیا اور اُس نوجوان کو برا بھلا کہنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔

''اے..... کیا نام ہے تمہارا پاپی.....؟'' پشکر نے اب اُس آدمی سے پوچھا۔

''شنکر..... میرا نام شنکر ہے سرکار!'' وہ شخص خوفزدہ سے لہجے میں بولا۔

''اگر اس وقت ہمیں ایک اور ضروری کام نہ ہوتا تو تمہیں تھانے لے جا کر اُلٹا ٹانگ دیتے۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ کپڑوں کا خیال دل میں لائے بغیر دوڑ لگا دو۔ اگر پیچھے مُڑنے کی کوشش کی تو پھر ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تیار ہو جاؤ۔ ایک..... دو..... تین.....''

پشکر کے تین کہتے ہی شنکر نامی وہ شخص بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح بھاگ اُٹھا اور چند سیکنڈ بعد ہی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

''تم ہمارے ساتھ چلو۔ کیا نام ہے تمہارا؟'' پشکر نے لڑکی کی طرف رُخ بدلا۔

''مادھوری نام ہے جی۔ لیکن آپ مجھے کہاں لے جائیں گے.....؟ چھوڑ دیجئے نا مجھے سرکار! تھانے مت لے جایئے۔'' مادھوری نے روتے ہوئے کہا۔ ''آپ جو کہیں گے.....''

''ہم تمہارے گھر چل رہے ہیں۔'' پشکر نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''میرے گھر.....؟'' مادھوری کا رونا ایک دم بند ہو گیا۔

''ہاں..... تمہارے گھر۔ اگر کسی نے ہمیں، تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو تم یہی کہو گی کہ ہم تمہارے پتی کے دوست ہیں۔ ہم تمہیں زیادہ پریشان نہیں کریں گے۔ کھا پی کر رُخصت ہو جائیں گے۔ اب اپنا لباس درست کر لو! راستے میں کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم بھی تمہیں بہلا پھسلا کر لے جا رہے ہیں۔'' پشکر نے کہا۔

مادھوری نے اپنی ساڑھی درست کی اور اُن کے ساتھ چل پڑی۔ اُس کا خوف اب کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ پارک سے نکل کر وہ سڑک پر پہنچ گئے۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری

تھی۔ اِکا دُکا پیدل راہ گیر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اگلے چوک پر اُنہیں ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پشکر نے مادھوری کو اپنے اور طارق کے درمیان بٹھایا تھا۔ پشکر ہی نے ڈرائیور کو شاہجہان آباد چلنے کو کہا تھا۔

طارق کو شبہ تھا کہ اس وقت تک شہر میں بھی اُس کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو اس مرتبہ زندہ نہیں بچے گا۔

شاہجہان آباد متوسط طبقے پر مشتمل گنجان آبادی والا رہائشی اور کاروباری علاقہ تھا۔ لال قلعہ بھی اُسی علاقے میں واقع تھا اور چاندنی چوک کو تو اُس علاقے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

لال کنواری سیتا رام بازار سے چاندنی چوک کی طرف مُڑتے ہی مادھوری نے پشکر کا ہاتھ دبا دیا اور پشکر نے ڈرائیور کو ٹیکسی روک دینے کو کہا۔ ٹیکسی رُکتے ہی وہ نیچے اُتر آئے۔ پشکر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ طارق کا ہاتھ بھی بے اختیار کوٹ کی اندرونی جیب میں چلا گیا۔ اُس نے ٹٹول کر دیکھا تو جیب میں ویلٹ موجود تھا۔ اُس نے ویلٹ نکال لیا۔ اُس میں مختلف مالیت کے پانچ چھ سو روپے کے کرنسی نوٹ موجود تھے۔ اُس نے دس دس کے دو نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیئے اور پشکر اور مادھوری کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

چاندنی چوک کو اگر دلّی کا دل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ متوسط اور نچلے طبقہ کا سب سے بڑا کاروباری مرکز تھا۔ یہاں دستکاری، زیورات اور اسی قسم کی لاتعداد دُکانیں تھیں۔ بقول شخصے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب تھا۔ کسی زمانے میں یہاں ایک نہر ہوا کرتی تھی جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ لیکن انگریزوں کے دور میں یہ نہر بند کر دی گئی اور چوک کے وسط میں ایک چرچ، فوارہ اور گھنٹہ گھر تعمیر کر دیا گیا۔

گرمیوں میں چاندنی چوک پر رات گئے تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دہلی کے زندہ دل بانکے یہاں مٹرگشت کرتے رہتے۔ پان کی دُکانوں کے سامنے لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع رہتے اور ریستورانوں میں ہجوم رہتا۔ لیکن سردیوں میں اس کی رونق جلد ماند پڑ جاتی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ سخت سردی کی وجہ سے عام دُکانیں تو سرِ شام ہی بند ہو چکی تھیں۔ چند پان کی دُکانیں اور ریستوران کھلے ہوئے تھے۔ لیکن وہ رونق نہیں تھی جو یہاں کا خاصا تھا۔ وہ چاندنی چوک سے ہوتے ہوئے نیتا جی سبھاش مارگ پہنچ گئے۔ موڑ پر پہنچتے ہی اُنہیں رُک جانا پڑا۔ تقریباً تیس گز آگے پولیس کی ایک موبائل کار کھڑی تھی اور وہ اس طرف سے گزرنے والی گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ طارق کا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ پورے شہر میں اُن کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔

"کس طرف جانا ہے مادھوری.....؟" پشکر نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"اس سڑک کے پار تیسری گلی میں وہ بلڈنگ ہے جس کے تیسرے مالے پر میں رہتی ہوں۔" مادھوری نے جواب دیا۔

"اگر یہاں تک آنا تھا تو ٹیکسی اتنی دُور کیوں چھوڑ دی تھی.....؟" پشکر نے اُسے گھورا۔

"ٹیکسی والا اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے میں مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرا گھر دیکھ لے اور بعد میں کسی وقت آ کر مجھے پریشان کرے۔ وہ غالباً سمجھ گیا تھا کہ میرا، تم لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں ایسے لوگوں سے بچنا چاہتی ہوں۔ میں ایک شریف عورت ہوں اور....."

"تمہاری شرافت تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔" پشکر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لو کہ میں تمہارا پتی ہوں۔ میرا نام پشکر ہے اور یہ میرا دوست بکرم۔ سمجھیں.....؟"

"تم شاید پولیس کو دیکھ کر ڈر گئے ہو۔ لیکن تم تو خود....."

"ہاں، ہاں..... ہم خود بھی پولیس والے ہیں۔ لیکن اس وقت میں نہیں چاہتا کہ اپنی شناخت کروا کر ان پولیس والوں کی اُلٹی سیدھی باتوں کا جواب دینا پڑے۔ تم وہی کہو گی، جو تمہیں کہا گیا ہے۔ سمجھیں؟"

"سمجھ گئی پتی مہاراج!" مادھوری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ چلتے رہے۔ اُس موبائل وین کے ساتھ تین پولیس والے تھے۔ ایک وین کے سامنے کھڑا تھا اور دو، ایک کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ یہ لوگ جیسے ہی قریب پہنچے، تیسرے پولیس والے نے اُنہیں روک لیا۔

"کون ہو تم لوگ..... اور کہاں سے آ رہے ہو؟" پولیس والے نے پوچھا۔

"ہم یہیں رہتے ہیں حوالدار جی..... یہ میرے پتی ہیں پشکر۔ اور یہ ان کا دوست بکرم ہے۔ ہم فلم دیکھنے گئے تھے۔ بڑا نام تھا شہنشاہ کا۔ لیکن بڑی بور فلم ہے۔ ہم تو انٹرول میں اُٹھ کر آ گئے۔ امیتابھ اب ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اسے چاہئے کہ فلم انڈسٹری چھوڑ کر کسی سینما کے سامنے کا جو اور مونگ پھلی بیچنا شروع کر دے۔"

"لگتا ہے تمہیں امیتابھ اچھا نہیں لگتا۔" پولیس والے نے مسکراتے ہوئے کہا اور پشکر اور طارق کی طرف دیکھنے لگا۔

"اجی مجھے تو زہر لگتا ہے۔" مادھوری نے تنک کر کہا۔ "میں تو ان کے کہنے پر چلی گئی تھی۔"

''یہ سب کیا ہو رہا ہے حوالدار جی؟ کسی ڈاکو یا قاتل کی تلاش ہے؟'' پشکر بولا۔

''تہاڑ جیل سے دو خطرناک قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ ایک تو پولیس کی گولیوں سے مارا گیا اور دوسرا پولیس کو دھوکہ دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پورے شہر میں اُسی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔'' پولیس والے نے جواب دیا۔

''آپ کے پاس تصویر تو ہو گی اُس قیدی کی جس سے اُس کی شناخت ہو سکے؟'' پشکر نے کہا۔

''نہیں..... وہ کشمیری مسلمان ہے۔ صرف یہی اُس کی شناخت ہے۔'' پولیس والے نے کہا اور دائیں طرف سے آتی ہوئی ایک کار کو رُکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

طارق کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے پشکر کو کہنی سے ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ پشکر نے مادھوری کا ہاتھ تھام لیا اور وہ تینوں سڑک پار کرنے لگے۔ کسی پولیس والے نے اُنہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ ایک قدرے کشادہ سڑک پر چلتے رہے۔ اس سڑک پر اِکا دُکا دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ تیسری گلی کی نکڑ پر ملہاری کا ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ چند آدمی اُس ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس گلی میں تمام عمارتیں تین تین اور چار چار منزلہ تھیں۔ وہ پانچویں عمارت میں داخل ہو گئے۔ گیٹ وے میں مدھم سی روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا اور زینے میں نیم تاریکی تھی۔ مادھوری آگے تھی۔ اُس کے پیچھے پشکر اور آخر میں طارق۔ وہ اندھیرے میں احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتے رہے۔

تیسری منزل کی لینڈنگ پر وہ لوگ رُک گئے۔ آمنے سامنے دو فلیٹوں کے دروازے تھے۔ یہاں بھی اندھیرا تھا۔ مادھوری نے بلاؤز میں سے چابی نکالی اور ٹٹول کر دروازہ کھولنے لگی۔

دروازہ کھلتے ہی پشکر اور طارق بھی اُس کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ مادھوری دیوار ٹٹول کر سوئچ تلاش کرنے لگی۔ اُس کے بتی جلانے سے پہلے طارق دروازہ بند کر چکا تھا۔

بلب کی تیز روشنی میں ایک لمحے کو طارق کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور جب اُس کی آنکھیں روشنی سے مانوس ہوئیں تو اُس نے پہلی مرتبہ غور سے مادھوری کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اب کوئی خوف نہیں تھا اور وہ خاصی حسین تھی۔ پشکر کو بھی اُس نے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کی عمر کا آدمی تھا۔ دراز قامت، چھریرا بدن اور چہرے کے نقوش خاصے جاذبِ نظر تھے۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا اور جنس مخالف کے لئے اُس میں خاصی کشش تھی۔ جیل سے فرار ہوتے وقت بھی طارق یہی سوچتا رہا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی دھوکہ تو نہیں ہو رہا؟ اُس کا تعلق

کشمیر کی لبریشن فرنٹ سے تھا۔ اُنہیں ہندوؤں کا بدترین دُشمن تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب ایک ہندو ہی اُسے موت کے منہ سے نکال کر لایا تھا۔ اُس کے ذہن میں اچانک سلیم کا خیال اُبھر آیا۔ اُس کا دوست..... اُس کا ساتھی.....! سلیم نے جیل میں بڑا تشدد برداشت کیا تھا۔ اور اب فرار کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ راستے میں جب پولیس والے نے یہ بتایا تھا کہ جیل سے فرار ہونے والے دو قیدیوں میں سے ایک پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہو چکا ہے تو طارق کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی کیفیت کو دوسروں سے چھپا سکا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو.....؟''

پشکر کی آواز سن کر طارق چونک گیا۔ ''اوہ..... کچھ نہیں۔ میں دراصل! اپنے دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' اُس نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے.....'' پشکر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر مادھوری کی طرف متوجہ ہو گیا جو قریب کھڑی تھی۔ ''کیا چائے مل سکے گی؟ اس وقت ہم دونوں بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہے ہیں۔''

''تم لوگ اُس کمرے میں چل کر بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' مادھوری نے کہا۔

''چائے سے پہلے میں نہانا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے شوہر کے کپڑوں کا ایک جوڑا چاہئے۔'' طارق نے کہا۔

''میں، تمہیں کپڑے نکال دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے، تمہیں پورے آ جائیں گے۔'' مادھوری کہتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں بھی دوسرے کمرے میں آ گئے۔ یہ دو کمروں کا فلیٹ تھا اور ساز و سامان دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اُن کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔

مادھوری نے ایک پینٹ شرٹ لا کر طارق کو دی۔ ''باتھ رُوم ادھر ہے۔ تم نہا لو! میں اتنے میں چائے بناتی ہوں۔'' مادھوری کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ پشکر بھی اُس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا۔

طارق نے جسم پر جو لباس پہن رکھا تھا، اُس کی جیبوں سے تمام چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں اور مادھوری کے شوہر کے کپڑے اُٹھا کر باتھ رُوم میں گھس گیا۔

باتھ رُوم میں جب اُس نے کپڑے اُتارے تو اپنے جسم پر کئی جگہ غلاظت چپکی ہوئی دیکھ کر اُسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ خوب مل مل کر نہایا۔ اور پھر مادھوری کے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ پشکر، کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی وقت مادھوری کچن سے چائے لے کر آ گئی۔ ایک کپ اُس نے اپنے سامنے رکھ لیا اور دوسرا اُن کی طرف بڑھا دیئے۔

''میرا خیال ہے، تم لوگ وہ نہیں ہو، جو ظاہر کیا تھا۔ پولیس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہیں تم وہی تو نہیں جنہیں پولیس تلاش کر رہی ہے؟'' مادھوری نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''تم غلط سمجھی ہو۔'' پشکر بولا۔ ''تم نے اُس پولیس والے کو یہ کہتے ہوئے تو ضرور سنا ہوگا کہ جیل سے دو آدمی فرار ہوئے تھے اور اُن میں سے ایک پولیس کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔''

''کچھ دیر پہلے تم اُس کے کسی ساتھی کے بارے میں افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔'' مادھوری نے پشکر کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''وہ تو ہم کچھ اور بات کر رہے تھے۔'' پشکر نے جواب دیا۔

''تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟'' مادھوری نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ''جب تم لوگوں نے پارک میں مجھے اُس آدمی کے ساتھ پکڑا تھا تو میں یہی سمجھی تھی کہ تم لوگوں کا تعلق پولیس سے ہے۔ تم لوگوں نے اُس شخص کو چھوڑ دیا۔ تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ اب تم لوگ مجھے کھلونے کی طرح استعمال کرو گے۔ لیکن تمہیں میرے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر میرے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو؟''

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم اس شہر میں پردیسی ہیں اور آج کی رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ پارک میں اسی نیت سے گئے تھے کہ کہیں پڑ کر سو رہیں گے۔ لیکن اتفاق سے تم دونوں ہمارے ہاتھ لگ گئے۔ ہم نے سوچا کہ تم دونوں میں سے کسی کے گھر رات بسر کی جا سکتی ہے۔ وہ شخص تو ہمارے لئے بیکار ثابت ہوا۔ تم نے بتایا کہ تمہارا شوہر، شہر سے باہر گیا ہوا ہے اور تم گھر میں اکیلی ہو، اسی لئے ہم یہاں آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔'' اس مرتبہ طارق نے جواب دیا۔

''اس شہر میں اجنبی ہو یا پولیس سے بچنا چاہتے ہو.....؟'' مادھوری نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''تم نے پارک کی جھاڑیوں میں اُس شخص کا لباس کیوں پہنا تھا؟ کیا یہ غلط ہے کہ تم جیل کے کپڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے؟ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ جیل کا وہ لباس اب بھی وہاں جھاڑیوں میں موجود ہوگا۔''

طارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اُس نے پشکر کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل رہے تھے۔ مادھوری واقعی ذہین عورت تھی۔ پارک سے لے کر گھر پہنچنے تک جو کچھ بھی ہوا تھا، اس سے مادھوری نے اُن کے بارے میں بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔

''تمہارے ساتھ پارک میں وہ آدمی کون تھا؟'' پشکر نے پوچھا۔

''میں اُسے نہیں جانتی۔'' مادھوری نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے بازار میں ملا تھا

اور بہلا پھسلا کر، لالچ دے کر اپنے ساتھ لے گیا۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں، شریف عورت ہوں۔ اگر میرے پتی کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''تمہاری شرافت کا مظاہرہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کوئی شریف عورت نہ تو کسی لالچ میں آتی ہے اور نہ ہی کسی کو دعوت دیتی ہے۔''

''مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' مادھوری نے جواب دیا۔ ''میں یہی سمجھی تھی کہ تم لوگ میری مجبوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو۔ میں ہر قیمت پر اس بات کو اپنے پتی سے چھپانا چاہتی ہوں۔ وہ بہت ظالم آدمی ہے اور اکثر مجھے مارتا پیٹتا رہتا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' پشکر نے کہا۔ ''تم نے امانت میں خیانت کر کے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی۔ شریف عورتیں، زندگی تج دیتی ہیں، گیلی لکڑی کی طرح زندگی بھر سلگتی رہتی ہیں لیکن تمہاری طرح بھٹکتی نہیں ہیں۔''

''تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟ جاؤ! چلے جاؤ.....!'' مادھوری چیخی۔

''چیخو مت.....!'' شنکر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ''یہ مت بھولو کہ ہم نے تمہیں ایک آدمی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا۔ اور اگر تمہارے شوہر کو اس بات کی بھنک بھی مل گئی تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''کیا چاہتے ہو تم لوگ.....؟'' مادھوری کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''صرف آج کی رات یہاں بسر کرنا چاہتے ہیں۔ شاید کل کا دن بھی یہیں گزارنا پڑے۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''تو تم لوگ وہی ہو نا، جنہیں پولیس تلاش کر رہی ہے؟ لیکن اُن میں سے تو ایک مارا گیا تھا۔ اور تم لوگ.....''

''پولیس نے اپنی کارکردگی بڑھانے کے لئے ایک قیدی کے مارے جانے کا ڈھونگ رچایا ہے۔'' پشکر نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''کسی راہ گیر کو چھلنی کر کے اُسے قیدی ظاہر کر دیا۔ جبکہ ہم دونوں زندہ ہیں اور تمہارے سامنے ہیں۔ پولیس کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ تہاڑ جیل سے فرار ہونے والے قیدی کشمیری مسلمان ہیں۔ ہم دونوں سہارن پور کے رہنے والے ہیں۔ ایک ڈکیتی کے دوران تین آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ہم سہارن پور سے بھاگ کر دہلی آ گئے۔ ہمارا ارادہ یہاں سے بمبئی جانے کا تھا لیکن ایک سال پہلے دہلی کی پولیس نے ہمیں ڈھونڈ نکالا۔ پولیس مقابلے میں ایک اور آدمی ہمارے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک سال سے جیل میں تھے۔ ہمارا

مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے۔ چند روز بعد مقدمے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ ا
مقدمے کا فیصلہ ہمارے لئے سزائے موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے فرار کا منصوبہ بنایا ا
بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ ہمیں سر چھپانے کو جگہ کی تلاش تھی اور اتفاق سے تم ہم
مل گئیں۔''

''شکل سے تو تم لوگ ڈاکو اور قاتل نہیں لگتے؟'' مادھوری نے باری باری دونوں کی طرف
دیکھا۔

''شکلیں اکثر دھوکہ دے جاتی ہیں۔'' پشکر نے کہا۔ ''ہمیں بھارت کا سفاک ترین انسان
کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پنجاب، ہریانہ اور اُتر پردیش
میں ہمارے نام کی دُھوم مچی ہوئی ہے۔ لوگ ہمارا نام سن کر ہی تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔''

مادھوری کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ آنکھوں میں خوف کی جھلک سی اُبھر آئی۔ وہ
ایک مرتبہ پھر باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

''اگر تم ہم سے تعاون کرو گی تو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' پشکر نے اُس کے
چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟'' مادھوری نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ یہ جان کر ہی وہ
دہل گئی تھی کہ اس وقت وہ دو انتہائی سفاک اور خطرناک انسانوں میں گھری ہوئی ہے۔

''صرف تعاون.....!'' پشکر نے کہا۔ ''ہم آج کی رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ پولیس کا
یہ جوش و خروش کل صبح تک ختم ہو جائے گا یا زیادہ سے زیادہ کل شام تک یہ سرگرمی رہے گی۔
ہنگامہ سرد پڑتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''اگر میرے شوہر کو یا کسی اور کو پتہ چل گیا کہ تم لوگ میرے فلیٹ میں پناہ لئے ہوئے ہو تو
میں بھی ماری جاؤں گی۔'' مادھوری نے کہا۔

''تمہارا پتی بقول تمہارے، تین چار دن کے لئے بریلی گیا ہوا ہے اور رات کو تمہارے کسی
پڑوسی کے آنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک ہم یہاں رہیں گے، تم اِس بات کا خیال
رکھو گی کہ کوئی پڑوسی یا پڑوسن تمہارے فلیٹ میں آنے نہ پائے۔ اب رات آدھی ہونے والی
ہے۔ تم چاہو تو اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ ہم یہیں سوتے جاگتے رات گزار لیں گے۔'' پشکر
نے کہا۔

مادھوری چند لمحے اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس نے
کمرے کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود اُسے اُن سے کوئی ڈر محسوس نہیں

ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پلنگ پر لیٹی رہی، پھر پلنگ کے قریب چھوٹی سی میز پر رکھے ہوئے ریڈیو کا
سوئچ آن کر دیا۔ اس وقت ریڈیو پر ایک فلمی گیت آ رہا تھا۔ لیکن وہ گیت جلد ہی ختم ہو گیا اور
خبریں نشر ہونے لگیں۔ مادھوری کچھ دیر تک خبریں سنتی رہی۔ اُسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں
تھی۔ وہ ریڈیو بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ اُسی وقت بلیٹن کی ایک نئی خبر شروع ہوئی اور مادھوری بٹن
دباتے دباتے رہ گئی۔ نیوز ریڈر کہہ رہا تھا.....

''آج شام دہلی کی تہاڑ جیل سے دو خطرناک قیدی فرار ہو گئے۔ اُن کا تعلق کشمیر لبریشن
فرنٹ سے تھا۔ اُنہیں چار سال پہلے دہلی میں حکومت ہند کے خلاف تخریبی سرگرمیوں، دہشت
گردی اور جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور اُن کا مقدمہ ابھی زیر سماعت تھا۔ ابتدائی
تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ وہ گٹر کے راستے فرار ہوئے تھے۔ اُن کے فرار کی اطلاع ملتے ہی
پولیس نے جیل کے آس پاس کے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک موقع پر دونوں مفرور قیدی
پولیس کی نظروں میں آ گئے۔ اُنہوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک قیدی پولیس کی گولیوں
کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا جب کہ دوسرا قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس ذرائع کے
مطابق فرار ہونے والے اس قیدی کو باہر کی امداد بھی حاصل تھی۔ لیکن آخری مرتبہ ایک اور آدمی کو
بھی اُس کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ مفرور قیدی کا نام طارق سعید ہے۔ اُس کی عمر تیس سال
اور.....''

ریڈیو پر مفرور قیدی کا حلیہ بتایا جا رہا تھا۔ یہ حلیہ اس قدر واضح تھا کہ طارق کو ہزاروں لوگوں
میں بھی شناخت کیا جا سکتا تھا۔ مادھوری نے ریڈیو بند کر دیا۔

طارق اور پشکر بھی خبریں سن رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے ریڈیو کی
آواز اُن تک صاف پہنچ رہی تھی۔ ریڈیو بند ہو گیا تو وہ دونوں معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے
کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔'' پشکر نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''تمہارا حلیہ اس قدر واضح ہے کہ تمہیں
آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں چند روز تک کسی پناہ گاہ میں رہنا
ہوگا۔''

''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔'' طارق نے کہا۔

''وہ کیا.....؟'' پشکر نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''جیل میں جس قیدی نے فرار ہونے میں میری مدد کی تھی، وہ تبتی تھا۔ میں تو اُس کا نام بھی
نہیں جانتا۔ اُس نے کہا تھا کہ جیل کے باہر پشکر ہمارا انتظار کرے گا۔ اور تم ہمیں مل گئے۔ فرار

کی اس کوشش میں میرا ساتھی، جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تم اگر چاہتے تو صورتِ حال کی نزا
کے پیشِ نظر مجھے چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا حالانکہ تمہاری جان کو بھی ا
خطرہ ہے جتنا مجھے۔ میں تمہارے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں جان سکا۔ تم کون ہو؟ اور کس
کہنے پر ہمیں جیل سے نکالا گیا ہے.....؟''

''مجھے صرف یہ حکم ملا تھا کہ تم دونوں کو بحفاظت تہاڑ بستی میں چندن نامی ایک شخص کے
پہنچا دُوں۔ لیکن تمہارا اب تہاڑ بستی میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' پشکر نے کہا۔ پھر
لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میرے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ میں کل صبح تہاڑ جا کر چند
سے ملوں گا۔ اس کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ تمہیں کہاں پہنچانا ہے؟''

''کیا تمہارا تعلق کسی تنظیم سے ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''ہاں.....!'' پشکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہماری تنظیم بال ٹھاکرے کی شیو سینا
مقابلے میں بنائی گئی تھی۔ بال ٹھاکرے نفرت اور تعصب کو ہوا دے رہا تھا۔ لیکن ہماری تنظیم
مقصد آپس میں محبت اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنا ہے۔ ہم مذہب و قومیت سے بالاتر ہو
کام کرتے ہیں۔ ہماری یہ تنظیم فی الحال خفیہ طور پر کام کر رہی ہے اور اس کے ممبروں کی تعداد
زیادہ نہیں ہے۔ تنظیم کے لیڈروں نے بعض بڑی تنظیموں سے رابطے قائم کر رکھے ہیں۔ ہم ایک
دوسرے کے کام آتے ہیں۔ تمہاری تنظیم نے بھی ہماری تنظیم سے رابطہ قائم کر کے تم دونوں کو جیل
سے نکلوانے کی درخواست کی تھی۔ اس کے لئے پچھلے تین مہینوں سے پلاننگ ہو رہی تھی۔ اور
اسے عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ لیکن مجھے تمہارے ساتھی کی موت کا افسوس رہے گا۔''

''میں اُسے کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔'' طارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرا بہترین
دوست تھا۔ ہم نے بہت عرصہ ایک ساتھ گزارا تھا۔''

''دوستوں کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔'' پشکر کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

آہٹ سن کر اُن دونوں نے بیک وقت پیچھے گھوم کر دیکھا۔ مادھوری اپنے کمرے کے
دروازے میں کھڑی اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک نئے خوف کی جھلک
نظر آ رہی تھی۔

''اوہ.....تم!'' طارق ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ ''تم نے شاید ریڈیو کی خبریں.....''

''میں نے ریڈیو کی خبریں بھی سنی ہیں اور تم دونوں کی باتیں بھی۔'' مادھوری نے جواب دیا۔
اُس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ''تم لوگ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔
میں کسی مفرور کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتی۔ اگر تم لوگ نہ گئے تو میں شور مچا کر لوگوں کو جمع

لوں گی۔''

''جذبات میں آ کر شاید تم یہ بھول گئی ہو کہ ہم نے تمہیں پارک میں کس حالت میں پکڑا
تھا۔'' پشکر بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے سامنے آ گیا۔

''میں اپنے اس جرم کی اتنی بڑی قیمت نہیں دے سکتی جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑے۔
تم لوگ تخریب کار اور دہشت گرد ہو۔ نجانے کتنے بے گناہ تمہارے ہاتھوں موت کے گھاٹ
اُترے ہیں.....اور کتنے لوگ اور مریں گے.....؟''

''تم نے شاید ریڈیو کی اس خبر پر یقین کر لیا ہے کہ میں تخریب کار اور دہشت گرد ہوں۔ لیکن
یقین کرو! کہ آج تک کوئی انسان تو کیا چڑیا کا بچہ بھی میرے ہاتھ سے نہیں مرا۔ تمہارے ریڈیو
نے ہماری دہشت گردی کی فرضی اور من گھڑت داستانیں تو سنا دیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ تمہارے
سورما کشمیر میں نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ وہاں روزانہ
سینکڑوں لوگوں کو جانوروں کی طرح بے دردی سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ اُنہیں زندہ جلایا جا رہا
ہے اور اُن کی عورتوں کو سرِ عام رُسوا کیا جا رہا ہے۔ اُن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ آزادی مانگ
رہے ہیں جو اُن کا پیدائشی حق ہے۔ کیا تمہیں اُن عورتوں سے کوئی ہمدردی نہیں، جنہیں اُن کے
گھروں سے نکال کر سڑکوں پر ننگا کیا جا رہا ہے؟ اُن معصوم بچوں سے کوئی ہمدردی نہیں، جنہیں
سنگینوں کی نوک پر اُچھالا جا رہا ہے؟ کیا جرم کیا ہے اُن معصوم بچوں کا؟ کتنی دہشت گردی کی ہے
اُنہوں نے؟ کیا تمہیں اُن بوڑھے ماں باپ سے کوئی ہمدردی نہیں جن کے جوان بیٹوں کو اُن کی
آنکھوں کے سامنے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جاتا ہے۔ میرا اور میرے دوست کا جرم صرف
یہ تھا کہ ہم روزگار کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ لیکن ہمیں دہشت گردی کے الزام میں جیل میں
ٹھونس دیا گیا۔ ان چار برسوں کے دوران جیل میں ہمارے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا،
تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ہمارا جرم صرف یہ ہے کہ ہم کشمیری ہیں اور مسلمان ہیں۔ یہاں
آئے دن مسلمانوں کا قتلِ عام ہوتا ہے۔ اُن کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ آخر کیا جرم
ہے اُن کا؟ تمہاری اس بلڈنگ میں بھی مسلمان گھرانے ہوں گے۔ اُنہوں نے کتنی مرتبہ تمہارا
گھر جلایا؟ کتنی بار تمہاری عصمت لوٹی گئی؟ خاموش کیوں ہوں مادھوری.....! جواب دو۔ کسی
مسلمان نے تمہیں کبھی کیا گزند پہنچائی ہے.....؟'' طارق کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ خاموش ہو کر
مادھوری کی طرف دیکھنے لگا جو خاموش کھڑی تھی۔

''دیکھو مادھوری.....!'' اِس مرتبہ پشکر نے اُسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہندو ہوں۔
میری ہمدردیاں ہندوؤں سے ہونی چاہئیں اور ہیں۔ میں وطن کا غدار نہیں ہوں۔ مجھے بھی

ہندوستان سے اتنی ہی محبت ہے، جتنی تمہیں ہو سکتی ہے۔ میرا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو ہندوستان کو محبت اور آشتی کا گہوارا بنانا چاہتے ہیں۔ یہ محبت اور بھائی چارہ اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب ہم دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسرے کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھیں، کسی کا حق غصب نہ کریں۔ اگر کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو تو وہ کبھی سر اُٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ آج پنجاب، کشمیر، تامل ناڈو اور سکم وغیرہ میں جو لوگ اپنا حق مانگ رہے ہیں، کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ماضی میں اُن کے ساتھ بہت سی زیادتیاں ہوئی ہیں، اُن کے حقوق سلب کئے گئے ہیں؟ کیا حقدار کو اُس کا حق نہیں دیا جانا چاہئے؟ بولو..... میری بات کا جواب دو مادھوری! اس وقت تم ہمارے سامنے بے بس کھڑی ہو۔ تمہیں جس حالت میں پکڑا گیا تھا، اس کے پیشِ نظر تم آسانی سے بلیک میل ہو سکتی ہو۔ یہاں آتے ہی تم نے اپنے آپ کو پلیٹ میں سجا کر ہمارے سامنے پیش کر دیا تھا۔ لیکن اس شخص نے۔'' اُس نے طارق کی طرف اِشارہ کیا۔ ''اس مسلمان نے تمہیں ڈانٹ دیا۔ کیا یہ اس کی شرافت کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ لوگ نہ تو کسی کے ساتھ زیادتی کرنا جانتے ہیں اور نہ ہی کسی کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بولو مادھوری! خاموش کیوں ہو.....؟''

''میں..... میں کچھ نہیں جانتی۔ تم لوگ صبح یہاں سے چلے جاؤ۔'' مادھوری نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا اور کمرے میں داخل ہو کر دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

''یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔'' طارق نے پشکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ خبر ریڈیو پر بھی نشر ہو سکتی ہے، اور تمہارا حلیہ اس تفصیل سے بتایا جائے گا کہ آسانی سے شناخت کر لئے جاؤ گے۔'' پشکر نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''مادھوری نے بہرحال! ہمیں رات گزارنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں کل صبح چندن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُس سے معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کہاں پہنچایا جائے۔''

''اگر چندن سے ملاقات نہ ہوئی تو.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''اس صورت میں مجھے بھی کچھ پریشانی ہو سکتی ہے اور تمہیں بھی۔'' پشکر نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ میں مادھوری کو اس بات پر آمادہ کر لوں گا کہ اپنے پتی کے آنے تک تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دے دے۔''

''کیا تم.....''

''نہیں..... میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے مسٹر طارق!'' پشکر نے اُس کی بات کا مطلب سمجھتے

ہوئے کہا۔ ''میں جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں، وہ کٹر ہندو ہیں۔ اگر تمہیں میں اپنے ساتھ لے گیا اور اُنہیں ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ تم نہ صرف مسلمان ہو بلکہ جیل سے بھی بھاگے ہوئے ہو تو وہ تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کریں گے بلکہ تمہارا فیصلہ خود کریں گے۔ اور تمہارے ساتھ میرا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔'' پشکر نے اپنے گلے پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے چھری چلا رہا ہو۔

''صورتحال بے حد اُلجھ گئی ہے۔'' طارق بڑبڑایا۔ ''چار سال پہلے دہلی آنے کے بعد ہم نے جس آدمی سے رابطہ قائم کیا تھا، وہ ہماری وجہ سے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد دو دیگر آدمی ہماری وجہ سے مارے گئے۔ وہ آخری شخص ہمیں منزل تک پہنچانے والا تھا۔ لیکن نہ صرف وہ خود مارا گیا بلکہ ہم بھی پکڑے گئے۔ میرا ساتھی جیل سے فرار کی کوشش میں مارا گیا اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہاں کس سے رابطہ قائم کیا جائے؟''

''ویسے بائی دا وے، تم دہلی کس مشن پر آئے تھے.....؟'' پشکر نے پوچھا۔

''کوئی مشن نہیں تھا۔'' طارق نے کہا۔ ''ہمیں صرف یہ کہا گیا تھا کہ دہلی پہنچ کر ہم بابو محفوظ سے رابطہ قائم کریں۔ وہ ہمیں کہیں کام دلوا دے گا۔''

''شاید تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔'' پشکر بولا۔

''نہیں..... یہ بات نہیں ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''مجھے خود بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں مکمل طور پر اندھیرے میں ہوں۔''

''دیکھو دوست!'' پشکر نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''جس طرح ایک ہاتھ کی پانچ اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اُسی طرح ایک گھر میں رہنے والے افراد کے مزاج اور فطرت بھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ میں اور میری تنظیم کے لوگ ہندوستان کو ایک گھر کی طرح سمجھتے ہیں جس میں بسنے والے افراد کے مزاج اور فطرت بالکل الگ الگ ہیں۔ یہاں بال ٹھاکرے جیسے متعصب اور انتہا پسند ہندو بھی ہیں اور مجھ جیسے ہندو بھی۔ بال ٹھاکرے یہاں کسی اور کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بزورِ طاقت سب کا حق مارنا چاہتا ہے۔ اور مجھ جیسے لوگ اس سرزمین پر سب کا حق تسلیم کرتے ہیں اور مل جل کر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہماری تنظیم نے تمہاری لبریشن فرنٹ سے معاہدہ کیا ہے کہ تم دونوں کو جیل سے نکال کر ایک مخصوص مقام تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس آپریشن کے پہلے مرحلے میں تمہارا ساتھی، جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس جگہ کے بارے میں صرف چندن جانتا ہے۔ صورتِ حال خاصی اُلجھ گئی ہے۔ اگر میری چندن سے ملاقات نہ بھی ہوئی تو میں تمہیں اس طرح تنہا اور بے سہارا نہیں چھوڑوں گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ رات آدھی ہو چکی ہے۔ آرام سے سو جاؤ! صبح دیکھا

جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اُس کمرے میں فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ پشکر نے ایک کرسی کا کشن اُٹھا کر سرکے تکیہ بنالیا اور دری پر لیٹ گیا۔ جبکہ طارق ریگزین کے صوفے پر لیٹ گیا۔ اُس نے بھی کرسی کا کشن اُٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

پشکر تو جلد ہی سو گیا لیکن طارق، صوفے پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ وقت، دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ ہر سو گہرا سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی اور کسی مکان کی چھت پر بلیوں کے غرانے کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اچانک فائر بریگیڈ کی گاڑی کے سائرن کی آواز سن کر طارق چونک گیا۔ یہ آواز کبھی بہت قریب سے آتی محسوس اور کبھی دُور سے۔ شاید کہیں آگ لگی ہوگی یا کسی کا گھر جلا ہوگا۔ دہلی جیسے بڑے شہر میں کی کوئی بھی بات ہوسکتی تھی۔ لیکن طارق کے ذہن میں پانچ سال پہلے کا واقعہ اُبھر آیا۔ وہ خو مرگ کا رہنے والا تھا اور اُس روز اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے بارہ مولا گیا ہوا تھا۔ کا ارادہ تھا کہ اُسی شام واپس آ جائے گا۔ لیکن جب وہ واپس آنے لگا تو دوست نے روک شام ہوچکی تھی۔ راستہ خطرناک تھا۔ اور یوں بھی بھارتی فوجی پوری وادی میں خونی بھیڑیوں طرح دندناتے پھر رہے تھے۔ شام کے بعد کسی کو پھرتے دیکھ کر وہ کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے اور اُس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیتے تھے۔

اُسی روز صبح بارہ مولا سے چند میل دُور سوپور میں مجاہدین اور بھارتی فوجیوں میں جھ ہوئی تھی اور بارہ مولا میں بھی کشیدگی پھیل گئی تھی۔ طارق کے دوست نے اسی لئے اُسے روکا تھا کہ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ جائے۔ لیکن طارق کا خیال تھا کہ کوئی ناخو واقعہ بارہ مولا میں بھی پیش آ سکتا تھا۔ اور اُس کا یہ خیال درست نکلا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے تقریباً دو گھنٹے بعد بارہ مولا کی ایک نواحی بستی میں مجاہدین اور بھارتی فوجیوں کے ایک دستے کا آمنا سامنا ہوگیا۔ جن مجاہدین نے یہ چھاپہ مار کارروائی کی تھی، وہ چند فوجیوں کو کے گھاٹ اُتارنے کے بعد بارہ مولا کی طرف آ گئے تھے۔ وہ اگرچہ یہاں رُکے بغیر کسی طرف نکل گئے تھے۔ لیکن بھارتی فوجی اُن کے تعاقب میں بارہ مولا پہنچ گئے۔ مجاہدین کی میں گھروں کی تلاشی لیتے ہوئے اُنہوں نے وہی کچھ کیا جس کی اُن جیسے وحشیوں سے توقع سکتی تھی۔ اُنہوں نے چند نوجوانوں کو گرفتار کرلیا۔ اُنہیں چھڑانے کے لئے لوگوں نے مزا کی تو فوجیوں نے فائر کھول دیا اور چند گھروں کو آگ لگا دی۔ فائرنگ سے دو بوڑھے شہ گئے اور پانچ مکان جل کر راکھ ہو گئے۔ طارق چشمِ تصور سے ان مکانوں سے اُٹھتے

وں کو دیکھ رہا تھا۔

گزرے ہوئے واقعات اُس کے ذہن میں فلمی مناظر کی طرح گھومتے رہے۔ اُسے جموں قریب چھوٹی سی بستی کا وہ منظر یاد آ گیا جب بھارتی فوجیوں نے شیراز بابا کی معصوم پوتی روشا اتھ ڈالا تھا۔ طارق اپنی جان بچانے کے لئے چھپا ہوا تھا۔ لیکن اُس سے یہ برداشت نہ ہو سکا وہ اپنی کمین گاہ سے باہر آ گیا۔ یہ اُس کی غیرتِ ایمانی کا امتحان تھا جس میں وہ سرخرو ہوا۔ اُس نے تینوں فوجیوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُن کی لاشیں کھڈ میں پھینک دی تھیں۔ پھر بم کے ساتھ دہلی کی طرف آتے ہوئے امرتسر میں جو کچھ ہوا، وہ بھی اُسے یاد تھا۔ بھارت کا روسماج عفریت بنا ہوا تھا۔ اور سب کو نگل لینا چاہتا تھا۔ اس عفریت کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔

طارق اب روشا کے بارے میں سوچنے لگا۔ کتنی معصوم اور کتنی حسین تھی وہ۔ اچانک ہی رق کے ذہن میں یہ خیال بھی اُبھر آیا کہ جب فوجی کیمپ میں یہ اطلاع پہنچی ہوگی کہ تین جیوں کو قتل کر کے اُنہیں جیپ سمیت کھڈ میں پھینک دیا گیا ہے تو اُن بھارتی فوجیوں نے خونی ھیڑیوں کی طرح آس پاس کی بستیوں پر بلہ بول دیا ہوگا۔ شیراز بابا کی بستی بھی اُن سے نہیں ئی ہوگی۔ شیراز بابا، روشا اور بستی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا......؟ رق اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کو گھورنے لگا۔

پھر نجانے کتنی دیر ہوئی ہوگی کہ آہٹ سن کر وہ اُٹھ کر بیٹھا۔ اُس نے گردن گھما کر دیکھا، دھوری اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اُس کے جسم پر صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز چہرہ سُتا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی ایک لمحہ کو بھی نہیں سوئی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑی چند لمحوں تک طارق کی طرف یکھتی رہی پھر خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ طارق اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ کچن سے برتنوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، پھر مادھوری کچن سے باہر آ گئی۔ اُس نے چائے کی دو پیالیاں اُٹھائی ہوئی تھیں۔

''چائے پی لو......!'' اُس نے ایک پیالی طارق کی طرف بڑھا دی۔

''شکریہ......! میں اس وقت واقعی چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔'' طارق نے اُس کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔ یہ بغیر دُودھ کی چائے تھی۔ ''میرا خیال ہے تم ابھی تک سوئی نہیں ہو۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟''

''پانچ بجنے والے ہیں۔'' مادھوری نے جواب دیا۔

''بیٹھو......!'' طارق، صوفے پر ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گیا۔

"شکریہ...... میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" مادھوری نے روکھے لہجے میں کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

طارق چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس وقت سردی بڑھ گئی تھی۔ اُس کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں تھا۔ پشکر بھی بغیر کچھ اوڑھے دری پر سو رہا تھا۔ طارق کو اُس وقت بغیر دودھ کے چائے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد اُس نے خالی کپ قریب کی میز پر رکھ دیا اور مادھوری کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک مرتبہ اُس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اُٹھ کر کمرے میں چلا جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اُس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سمٹ کر بیٹھا رہا۔ دری پر سویا ہوا پشکر بھی بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ سردی کے مارے وہ بھی چاقو کی طرح مڑ گیا تھا۔

صبح چھ بجے کے قریب پشکر بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ باتھ رُوم کا چکر لگانے کے بعد اُس نے مادھوری کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اُسے جاگتے پا کر چائے کی فرمائش کی اور طارق کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مادھوری بھی کمرے سے نکل آئی۔ اس مرتبہ اُس نے ساڑھی لپیٹ رکھی تھی۔ وہ خاموشی سے کچن میں چلی گئی اور اُن کے اور اپنے لئے چائے بنا کر لے آئی۔ اس مرتبہ وہ اُن کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، لکڑی کی کھڑاویں پہنے ہوئے تھا اور اُوپر والی منزل سے نیچے آ رہا تھا۔ کھڑاووں کی کھٹ کھٹ کی آواز صبح کی خاموشی میں بڑی زوردار محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد سیڑھیوں پر ایک بار پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ کوئی نیچے سے اُوپر آ رہا تھا۔ آواز فلیٹ کے دروازے کے ساتھ رُک گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے کوئی بالٹی فرش پر رکھی ہو۔ اس کے فوراً ہی بعد دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"یہ کون ہے......؟" پشکر نے سوالیہ نگاہوں سے مادھوری کی طرف دیکھا۔

"گھوسی ہے...... میں دودھ لے کر آتی ہوں۔" مادھوری کہتے ہوئے اُٹھ گئی۔

"ایک بات ذہن میں رکھنا مادھوری......"

"میں سمجھتی ہوں۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" مادھوری نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور کچن سے ایک چھوٹی پتیلی لے کر بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔ پشکر بھی دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"کیوں ری مادھوری! رات بھر جاگتی رہی ہے کیا؟ تیری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا کرتی رہی رات بھر...... تیرا پتی تو یہاں ہے نہیں۔" باہر سے دودھ والے کی آواز سنائی دی۔

"تجھے کیا پتہ میرا پتی گھر پر ہے یا نہیں۔ ہماری جاسوسی کرتا ہے کمینے؟" مادھوری نے کہا۔

"اری...... وہ کل صبح مجھے راستے میں مل گیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ بریلی جا رہا ہے۔ سچ بتا! ہے گھر میں؟"

"بک بک مت کر! دودھ ڈال۔ اور سن! ایک پاؤ دودھ زیادہ دینا۔ رات کو بلی پی گئی تھی۔ بازار سے لانا پڑا۔" مادھوری نے کہا۔

"اری ایک پاؤ کیا، تو کہے تو دودھ میں نہلا دوں تجھے۔"

"بکتا رہ تو۔ لا! پتیلی مجھے دے۔" مادھوری نے غصے سے کہا۔

"ہائے رے مادھوری ڈکشٹ کی فوٹو سٹیٹ کاپی! غصے میں تو، تو واقعی بہت خوبصورت لگتی ہے۔"

"چل...... دفعان ہو جا یہاں سے۔" مادھوری نے کہتے ہوئے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

"بڑی دوستی ہے گھوسی سے۔" پشکر نے مادھوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حرامی ہے...... مجھ پر بری نظر رکھتا ہے۔" مادھوری کہتے ہوئے کچن میں گھس گئی اور چولہا جلا کر دودھ گرم کرنے لگی۔ اسی دوران پشکر بھی کچن میں آ گیا۔

"یہ پیسے رکھ لو! کچھ دُکانیں کھل جائیں تو ہمارے ناشتے کے لئے کچھ لے آنا۔ ناشتے کے بعد میں چلا جاؤں گا۔ میرا ساتھی یہیں رہے گا۔ ہو سکتا ہے، میں دو گھنٹوں بعد واپس آ جاؤں۔ اس دوران کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔ سمجھی؟" پشکر نے پچاس روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ سمجھتی ہوں۔ بار بار دھمکانے کی ضرورت نہیں ہے۔" مادھوری نے کہا۔ "لیکن میں یہ چاہوں گی کہ تم لوگ آج یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میرے پڑوسیوں کو یہ شبہ ہو گیا کہ دو غیر مردوں نے رات میرے ساتھ میرے فلیٹ میں گزاری ہے تو وہ ہنگامہ مچائیں گے۔ اور جب میرے پتی کو اس بات کا پتہ چلے گا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اپنے پتی سے بہت ڈرتی ہو...... وہ جلاد ہے کیا؟" پشکر نے اُسے گھورا۔

"وہ بہت ظالم ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔" مادھوری نے جواب دیا۔ پشکر چند لمحے اُس کے پاس کھڑا رہا۔ پھر کچن سے نکل آیا۔ کچھ دیر بعد مادھوری ناشتہ وغیرہ لینے کے لئے چلی گئی۔ پشکر کی ہدایت کے مطابق وہ دروازے کو باہر سے تالا لگا گئی تھی تا کہ اُس کی عدم موجودگی میں

مادھوری یا اُس کے پتی کا کوئی جاننے والا نہ ٹپک پڑے۔

''کیا یہ پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع نہ کر دے گی؟'' طارق نے کہا۔

''نہیں.....'' پشکر مسکرایا۔ وہ اپنے شوہر سے بہت ڈرتی ہے۔ اُس کے دل میں اس لئے ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی، جس سے وہ خود بھی پھنستی ہو۔''

طارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آدھے گھنٹے بعد مادھوری انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن لے کر آ گئی اور کچن میں گھس کر ناشتہ تیار کرنے لگی۔

ناشتے کے بعد آٹھ بجے کے قریب پشکر فلیٹ سے نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد مادھوری کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ مادھوری اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ طارق صوفے پر اونگھنے لگا۔

اچانک آہٹ سن کر طارق کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مادھوری صفائی کر رہی تھی۔ طارق اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ مادھوری فرش پر جھاڑو پھیرتی ہوئی اُس کے سامنے پہنچ گئی۔ اُس کی ساڑھی کا پلو ڈھلکا ہوا تھا۔

طارق اپنے آپ میں سنسنی کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ اُس کی سانس تیز ہو گئی۔ مادھوری کچھ اور جھکی تو اُسے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''مادھوری.....'' طارق نے بے اختیار اُسے بانہوں میں پکڑ لیا۔

''کیا ہے.....؟'' مادھوری نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تم اپنے شوہر سے بہت ڈرتی ہو.....؟''

''ہاں..... وہ مجھے بہت مارتا ہے۔ اپنی بے بسی کا انتقام لیتا ہے مجھ سے۔ جب وہ کر پاتا تو بھیڑیوں کی طرح بھنبھوڑتا ہے مجھے..... یہ دیکھو!'' مادھوری نے کہتے ہوئے اپنا بلاؤز نیچے کھینچ دیا.....

طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا ہو..... مادھوری کے دونوں طرف ایسے نشان تھے جیسے کسی درندے نے دانت پیوست کئے ہوں۔

''اور..... اور یہ دیکھو.....'' مادھوری نے اپنا پیٹی کوٹ بھی اُوپر اُٹھا دیا۔ اُس کی رانوں پر دانتوں کے ایسے ہی متعدد نشانات تھے۔

''وہ تمہارے ساتھ اتنا ظلم کرتا ہے تو تم اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟'' طارق نے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ اُسے اپنے سینے میں لاوا سا کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''میں اُسے نہیں چھوڑ سکتی۔'' مادھوری نے سسکی بھری۔ ''میرے باپو نے اُس سے دس ہزار روپے لئے تھے۔ بیچا تھا مجھے اُس قصائی کے ہاتھ میں..... میں اُسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔'' وہ باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔

طارق نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اُس کی یہ حرکت بالکل غیر اختیاری تھی۔ مادھوری پکے ہوئے پھل کی طرح اُس کی آغوش میں گر گئی..... لیکن اس سے پہلے کہ طارق کے ہاتھ کوئی اور حرکت کرتے، دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا..... دروازے کے دھڑ دھڑانے کی آواز بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ طارق اُچھل پڑا مادھوری بھی پیچھے ہٹ گئی۔

''دروازہ کھولو مادھوری.....'' باہر سے کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا۔

''کون ہے.....؟'' مادھوری نے اُٹھ کر ساڑھی درست کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں خوف کا ہلکا سا عنصر موجود تھا۔

''پولیس آئی ہے مادھوری..... دروازہ کھولو!'' باہر سے کہا گیا۔ یہ آواز مادھوری کے پڑوسی کی تھی۔

دونوں اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ مادھوری کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ اُس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ شاید پولیس کو کسی طرح خبر ہو گئی تھی کہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی اُس کے فلیٹ میں چھپا ہوا ہے۔ طارق کی حالت بھی اُس سے مختلف نہیں تھی۔ اُس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اُس کے ذہن میں پہلا سوال یہ آیا تھا کہ پولیس کو خبر کیسے ہوئی؟

''دروازہ کھولو مادھوری! ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔'' اس مرتبہ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

''میرے ساتھ آؤ.....!'' مادھوری، طارق کو اِشارہ کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ اُس فلیٹ میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ مادھوری نے اُسے الماری میں گھسا کر سامنے کپڑے ٹانگ دیئے اور الماری کا دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئی۔

طارق، الماری میں کپڑوں کے پیچھے سمٹا کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد فلیٹ میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔

''تمہارا نام مادھوری ہے..... اور تم جیٹھا نند کی پتنی ہو؟'' ایک بھاری آواز نے پوچھا۔

''جی سرکار..... لیکن بات کیا ہے؟'' مادھوری کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''پہلے ہم اس فلیٹ کی تلاشی لیں گے، پھر بتائیں گے کہ کیا بات ہے؟'' اُس آواز نے کہا۔

قدموں کی آواز سے طارق نے اندازہ لگایا کہ وہ دو پولیس والے تھے۔ ایک پولیس وا
کے قدموں کی آواز اُسے اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بھاری قدموں کی وہ آواز الما
کے سامنے رُک گئی۔ طارق کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی اور پورے جسم میں سنسنی کی لہریں
دوڑ رہی تھیں۔ اُس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔

''بات کیا ہے..... تم لوگ زبردستی میرے فلیٹ میں کیوں گھس آئے ہو؟ کس چیز کی تلا
ہے تم لوگوں کو.....؟'' مادھوری نے سوال کیا۔ اُس کے لہجے میں ہلکا سا خوف نمایاں تھا۔ وہ اپ
آپ پر قابو رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

''ہمیں تمہارے پتی جیٹھا نند کی تلاش ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''میرے پتی کی تلاش ہے؟'' مادھوری بری طرح چونک گئی۔ ''تمہارا خیال ہے کہ میں نے
اُسے پلنگ کے نیچے یا کپڑوں کی الماری میں چھپا رکھا ہے؟ وہ تو اپنے سیٹھ کے ساتھ بریلی گ
ہے۔ لیکن پولیس کو اُس کی تلاش کیوں ہے..... کیا، کیا ہے اُس نے؟''

''تمہارا پتی اپنے سیٹھ کو قتل کر کے بھاگا ہے۔'' پولیس والے نے بتایا۔

''کیا.....؟'' مادھوری کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ ''وہ..... وہ ایسا نہیں کر سکتا۔''

''ایسا تو وہ کر گزرا ہے۔'' پولیس والے نے جواب دیا۔ ''سیٹھ نے کل شام بریلی میں ایک
کمپنی کے مالک سے دو لاکھ روپے لئے تھے۔ سیٹھ کے پاس اتنی بڑی رقم دیکھ کر جیٹھا نند کی نیت
ڈانواں ڈول ہوگئی۔ اُس نے رات ہی کو موقع پا کر سیٹھ کو قتل کر دیا اور رقم لے کر بھاگ نکلا۔
ہمیں صبح چھ بجے ٹیلی فون پر بریلی پولیس سے اس قتل اور جیٹھا نند کے فرار کی اطلاع مل گئی تھی۔
ہم نے سیٹھ کے مینجر سے فون پر رابطہ قائم کر کے جیٹھا نند کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے
یہاں کا پتہ بتا دیا۔ ہمیں تمہارا فلیٹ ڈھونڈنے میں خاصا وقت لگ گیا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے پتی نے قتل جیسی سنگین واردات کرنے کے بعد سیدھا گھر کا رُخ
کیا ہوگا؟'' مادھوری نے کہا۔ ''بڑے بھولے ہو حوالدار جی! اگر میرے پتی نے واقعی سیٹھ کو قتل کیا
ہے اور وہ دو لاکھ کی رقم لے کر بھاگا ہے تو اب وہ اس طرف کا رُخ نہیں کرے گا۔ وہ محض
میرے لئے اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ اُس نے تو مجھے میرے باپ سے دس ہزار میں
خریدا تھا۔ دو لاکھ روپے میں تو وہ مجھ جیسی کئی عورتوں کو خرید لے گا۔ یہاں تم لوگ اپنا وقت ضائع
کر رہے ہو۔ اُسے کہیں اور تلاش کرو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔''

پولیس والے نے الماری کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ الماری کے اندر چھپے
ہوئے طارق کی جان، سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔ ایک ہلکے سے جھٹکے سے دروازے کا ہینڈل کھل سکتا

تھا۔ مادھوری بظاہر بڑے ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ لیکن اندر سے اُس کی رُوح تک کانپ رہی
تھی۔ اگر پولیس والے نے الماری کھول دی تو اُنہیں اُس کا قاتل شوہر نہیں تو البتہ اُس سے بڑا
اور زیادہ خطرناک مجرم مل جائے گا۔ ایسی صورت میں مادھوری کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں
تھا۔ لیکن پولیس والے نے الماری کے ہینڈل سے ہاتھ ہٹا لیا۔

''معلوم ہوتا ہے، تم اپنے پتی سے بہت تنگ آئی ہوئی ہو۔'' پولیس والے نے کہا۔ ''ہم جا
رہے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے میرا مشورہ ہے کہ اگر کسی وقت تمہارا پتی یہاں آ جائے تو فوراً
تھانے میں اطلاع کر دینا۔ بصورتِ دیگر تم بھی اُس کے جرم میں شریک سمجھی جاؤ گی۔ اور تمہاری
یہ خوبصورت جوانی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ضائع ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''سمجھ گئی حوالدار!'' مادھوری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''وہ ادھر آیا تو میں فوراً تمہیں بتا
دُوں گی۔''

''گڈ..... یہی تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ چلو کرشنا!'' پولیس والے نے آخری الفاظ اپنے
ساتھی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

ایک بار پھر بھاری قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ مادھوری نے جلدی سے آگے بڑھ کر
باہر کا دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے سامنے اُسی بلڈنگ کے رہنے والے کچھ لوگ جمع تھے۔ اُن
میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ اُن لوگوں نے پولیس والوں کی طرف دیکھا اور پھر مادھوری کی
طرف دیکھنے لگے۔ پولیس والے جب سیڑھیاں اُتر گئے تو بیک وقت کئی سوال مادھوری کی
سماعت سے ٹکرائے۔

''کیا ہوا مادھوری..... پولیس یہاں کیوں آئی تھی.....؟''

''سنا ہے تمہارے پتی نے مرڈر کر دیا ہے مادھوری.....؟''

''ارے وہ ہے ہی خونی۔ پکڑا گیا یا نہیں؟ پولیس تمہارے پاس کیوں آئی تھی.....؟''

''مجھے کچھ نہیں معلوم..... میں کچھ نہیں جانتی۔'' مادھوری نے چیختے ہوئے دھڑ سے دروازہ
بند کر دیا اور سٹنگ رُوم میں آ کر اُونچی آواز میں رونے لگی۔ جیٹھا نند بہت ظالم تھا۔ اُس نے
مادھوری کو اُس کے غریب ماں باپ سے دس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ وہ پتنی سے زیادہ اُسے
اپنی زرخرید لونڈی سمجھتا تھا۔ جیٹھا نند اُس پر ظلم کرتا تھا، اُسے مارتا پیٹتا تھا۔ لیکن تھا تو اُس کا پتی۔
وہ اُس سے لاتعلق نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ انکشاف مادھوری کے لئے بہت ہی رُوح فرسا تھا کہ جیٹھا
نند نے اپنے سیٹھ کو قتل کر دیا تھا اور دو لاکھ روپے لے کر بھاگ گیا تھا۔ اب پولیس اُسے تلاش کر
رہی تھی۔ کیا وہ... واپس آئے گا؟ مادھوری یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ آہٹ سن کر چونک گئی۔ اُس

نے گردن گھما کر دیکھا، طارق اُس کے قریب کھڑا تھا۔

''تت.....تم.....؟'' وہ اُس کی طرف دیکھ کر ہکلائی۔

''ہاں.....تم نے الماری کا دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا تھا۔ آہستہ سے دھکا دینے سے کھل گیا۔'' طارق نے کہا۔

''یہاں پولیس کیوں آئی تھی.....تمہیں معلوم ہے؟'' مادھوری بولی۔

''ہاں..... میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے بچا لیا۔ مجھے تمہارے شوہر کے بارے میں سن کر افسوس ہوا۔''

''مجھ سے ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں۔'' مادھوری نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''پتی کے ہوتے ہوئے بھی میں کون سا سکھی تھی۔ اور تمہیں بھی میں نے اس لئے نہیں بچایا تھا کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ پولیس اگر تمہیں یہاں دیکھ لیتی تو تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاتی۔ لیکن اب مجھ پر رحم کرو..... یہاں سے چلے جاؤ! پولیس نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ اُنہیں میرے قاتل پتی کی تلاش ہے۔ وہ اُس کی تلاش کے بہانے وقت بے وقت یہاں آتے رہیں گے۔ اور پھر میرے پڑوسی..... اُنہیں بھی پتہ چل گیا ہے کہ میرے پتی نے خون کر دیا ہے۔ یہ پڑوسی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ مجھ سے ہمدردی جتانے کے لئے آتے رہیں گے۔ اپنی باتوں سے میرا جگر چھلنی کر دیں گے۔ میرا جینا حرام کر دیں گے۔ میں کسی کو یہاں آنے سے کب تک روک سکوں گی؟ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ اگر کسی کو تمہارے بارے میں بھنک بھی مل گئی تو.....''

''جذباتی مت بنو مادھوری!'' طارق نے اُسے ٹوک دیا۔ ''تم جانتی ہو کہ پشکر ایک اہم کام سے گیا ہوا ہے۔ اُس کی واپسی تک مجھے ہر صورت میں یہاں رہنا ہے۔''

''اور اگر وہ واپس نہ آیا تو؟'' مادھوری نے اُسے گھورا۔

''تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد چلا جاؤں گا۔ کیونکہ موجودہ حالات کے تحت میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتا۔'' طارق نے جواب دیا۔

مادھوری جواب دینے کی بجائے آنسو بہاتی رہی۔ طارق بھی ریگزین کے صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران مادھوری کے بعض پڑوسیوں نے اُس کے دروازے پر دستک دی تھی لیکن مادھوری نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

☆

پورا دن گزر گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اُنہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مادھوری کی کیفیت دیکھ کر طارق نے بھی اُس سے کھانے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ زبانی ہمدردی کا اظہار کرنے کے علاوہ طارق، دن بھر مادھوری سے دُور ہی رہا تھا۔ اگر پولیس والے دروازے پر دستک نہ دیتے تو شاید وہ بہک جاتا۔ مادھوری کوئی پارسا عورت نہیں تھی۔ گزشتہ رات فلیٹ میں آنے کے بعد اُس نے خود اپنے آپ کو پلیٹ میں سجا کر اُن کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اور صبح اُس کے دامن پر داغ لگتے لگتے رہ گیا تھا۔

مادھوری اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد دو کپ چائے بنا کر لے آئی۔ ایک کپ اُس نے طارق کی طرف بڑھا دیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آج تمہیں بھوکا رہنا پڑا۔'' مادھوری نے کہا۔

طارق جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر تین مرتبہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ بالکل ایسے لگا تھا، جیسے کسی نے صرف ایک اُنگلی سے ہولے سے دروازہ بجایا ہو۔ طارق چونک گیا۔ یہ بات صبح ہی طے ہوگئی تھی کہ پشکر جب واپس آئے گا تو اسی طرح مخصوص انداز میں دستک دے گا۔

''تم اُس کمرے میں چلے جاؤ!'' مادھوری اُٹھتے ہوئے بولی۔

طارق چائے کا کپ اُٹھا کر کمرے میں داخل ہو کر دروازے کے پیچھے چلا گیا۔ مادھوری نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پشکر ہی تھا جس نے ایک چھوٹی سی گٹھڑی اُٹھا رکھی تھی۔ اُس کے اندر آتے ہی مادھوری نے دروازہ بند کر دیا۔ پشکر کی آواز سن کر طارق کمرے سے باہر آ گیا۔

''میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' مادھوری کچن میں چلی گئی۔

''کیا رہا.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے پشکر کی طرف دیکھا۔

''صورتحال خاصی سنگین ہے۔'' پشکر نے جواب دیا۔ ''تہاڑ بستی میں گزشتہ رات ہی پولیس پہنچ گئی تھی۔ آج دوپہر تک پولیس نے بستی کو گھیرے میں لئے رکھا اور تمہاری تلاش میں بستی کے تمام گھروں کی تلاشی لی جاتی رہی۔ ماضی میں بھی اکثر ایسا ہوتا رہا ہے۔ جیل سے فرار ہونے والے قیدی، پولیس سے بچنے کے لئے اس بستی کے کسی نہ کسی گھر میں پناہ لے لیتے ہیں۔ تہاڑ

بستی کے لوگ بہت غریب ہیں۔ وہ روپے پیسے کے لالچ میں مفرور قیدیوں کو پناہ دے دیتے ہیں۔ بعض اوقات پکڑے بھی جاتے ہیں اور اُن کی باقی زندگی جیل کے اندر ہی کٹتی ہے۔ لیکن آج پولیس بستی کے کسی گھر سے کسی مفرور قیدی کو برآمد نہ کر سکی۔ چندن آج صبح ہی سے غائب تھا۔ تقریباً دو گھنٹے پہلے اُس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نئی صورتحال سامنے آئی ہے۔'' پشکر چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔'' آج دوپہر پولیس کو پارک کی جھاڑیوں میں چھپائی گئی تمہاری جیل کی وردی مل گئی ہے۔ تقریباً دوپہر ہی کو شنکر نامی اُس نوجوان نے بھی پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ گزشتہ رات ہم نے مادھوری کو پکڑا تھا۔ اُس نے بیان دیا ہے کہ رات کو ایک آوارہ عورت اُسے بہلا پھسلا کر پارک کے ایک تاریک گوشے میں لے گئی تھی۔ اچانک میں وہاں پہنچ گیا اور اپنے آپ کو پولیس والا ظاہر کر کے اُس کے کپڑے اُتروا لئے۔ شنکر نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا جو جھاڑیوں میں چھپا رہا تھا اور اُس کے اُترے ہوئے کپڑے جھاڑیوں میں چھپے ہوئے دوسرے آدمی نے پہنے تھے۔ شنکر کے اس بیان سے پولیس کو یہ تصدیق بھی ہوگئی ہے کہ جیل کی وہ وردی تم نے ہی جھاڑیوں میں چھپائی تھی۔ شنکر کے بیان کے مطابق ہم اُس عورت کو ساتھ لے گئے تھے جو اُسے بہلا پھسلا کر پارک میں لے گئی تھی۔ اُس نے پولیس کو مادھوری کا حلیہ بھی بتایا ہے۔ میرا واضح حلیہ وہ اس لئے نہیں بتا سکا کہ تاریکی میں وہ میرا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ شنکر نے پولیس کو بتایا ہے کہ مادھوری نامی وہ عورت اُسے کناٹ سرکس کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں ملی تھی۔ حالانکہ وہ پارک کناٹ سرکس سے خاصا دُور ہے۔ پولیس، مادھوری کو کناٹ سرکس اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں تلاش کر رہی ہے۔''

''یہاں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں ہیں۔'' طارق نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''کیوں..... کیا ہوا؟'' پشکر نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''گزشتہ روز مادھوری کا شوہر، بریلی میں اپنے سیٹھ کو قتل کر کے دو لاکھ روپے لے اُڑا۔ وہ ابھی تک مفرور ہے اور پولیس اُس کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ مگر وہ تو میری قسمت اچھی تھی اور کچھ مادھوری کی ذہانت نے کام کر دکھایا۔ ورنہ میں اس وقت ایک بار پھر تہاڑ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتا۔''

''اوہ.....!'' پشکر کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔'' یہ پولیس والے ایک مرتبہ جس کے پیچھے لگ جائیں، اُسے آسانی سے نہیں چھوڑتے۔ شنکر نامی اُس نوجوان کے بیان کے بعد پولیس نے مادھوری کی تلاش شروع کر دی ہے۔ پولیس کو یقین ہے کہ تہاڑ جیل کا مفرور قیدی

اُس کے ساتھ ہے۔ اور ممکن ہے اُس نے مادھوری کو ڈرا دھمکا کر اُس کے گھر میں پناہ لے رکھی ہو۔ مادھوری کا شوہر بھی قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب ہے۔ اگر اس حوالے سے بھی مادھوری کا نام سامنے آ گیا تو پولیس کو اُس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس لئے میرے خیال میں اب زیادہ دیر یہاں ٹکنا مناسب نہیں ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو، ہمیں یہاں سے رُخصت ہو جانا چاہئے۔''

''چندن سے کچھ معلوم ہوا.....؟'' طارق نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''ہاں..... لیکن چندن کی طرف جانا اب خطرے سے خالی نہیں۔ تمہیں مطلوبہ جگہ تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی ہے۔ تم جلدی سے یہ لباس تبدیل کر لو۔ میں تمہارے لئے ایک وگ اور فرنچ کٹ نقلی داڑھی لے آیا ہوں۔ اس کے ساتھ مونچھیں بھی ہیں۔ یہ حلیہ بدلنے کے بعد تمہیں طارق کی حیثیت سے نہیں پہچانا جا سکے گا۔ چلو! اب تم جلدی سے اپنا کام شروع کر دو۔'' پشکر نے وہ چھوٹی سی گٹھڑی اُس کی طرف بڑھا دی جو وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔

اسی وقت مادھوری، پشکر کے لئے چائے بنا کر لے آئی۔ طارق گٹھڑی لے کر کمرے میں گھس گیا۔ پہلے اُس نے لباس بدلا۔ سفاری سوٹ اُس کے جسم پر بالکل فٹ آیا تھا۔ پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنا حلیہ بدلنے لگا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اُس نے تنقیدی نگاہوں سے آئینے میں دیکھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اُس حلئے میں وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔ نیلے رنگ کا سفاری سوٹ، گھنگریالے بال، باریک نوک دار مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی میں وہ بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔

''اب تو شاید تمہارے گھر والے بھی تمہیں نہ پہچان سکیں۔'' پشکر اُسے دیکھ کر بولا۔ لیکن اُس کے قریب ہی کھڑی ہوئی مادھوری اُسے دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ..... یہ کون ہے؟ اور اندر کیسے آیا.....؟'' وہ بدحواس ہو کر بولی۔

''یہ میرا دوست طارق ہے۔ اس نے بھیس بدل لیا ہے۔ اب ہم لوگ جا رہے ہیں یہاں سے۔ تمہاری میزبانی کا بہت بہت شکریہ۔ یہ تھوڑی سی رقم رکھ لو! تمہارے کام آئے گی۔'' پشکر نے کہتے ہوئے ایک ہزار روپے کے نوٹ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

''تو کیا واقعی تم لوگ جا رہے ہو.....؟'' مادھوری کو شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں..... ہمارا مزید یہاں رُکنا تمہارے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ذرا باہر جھانک کر دیکھو! زینے پر کوئی ہے تو نہیں؟ میں نہیں چاہتا کہ ہمیں یہاں سے نکلتے ہوئے کوئی دیکھ لے اور بعد میں تم سے اُوٹ پٹانگ سوال کرتا رہے۔'' پشکر نے کہا۔

مادھوری نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ زینے پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ وہ دونوں تیزی سے باہر نکل آئے اور سیڑھیاں اُترنے لگے۔ وہ ابھی زینے پر ہی تھے کہ نیچے سے دو پولیس والے اُوپر آتے ہوئے نظر آئے۔ اُن میں ایک کانسٹیبل تھا اور دوسرا ہیڈ کانسٹیبل۔ قریب سے گزرتے ہوئے دونوں پولیس والوں نے بڑی گہری نظروں سے اُن کی طرف دیکھا تھا مگر اُن سے کچھ پوچھنے یا روکنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ دونوں بلڈنگ سے نکل کر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گلی میں چلنے لگے۔ نیتا جی سبھاش مارگ سے نکل کر وہ ایک بار پھر چاندنی چوک میں آ گئے۔ ابھی شام کے آٹھ بجے تھے اور چاندنی چوک کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ موڑ پر ایک ریسٹورنٹ کے سامنے دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ تمام ٹیکسیوں کے ڈرائیور ایک ٹیکسی کے قریب کھڑے گپ شپ کر رہے تھے۔ پشکر ایک ٹیکسی کے قریب رُک گیا۔ اُس ٹیکسی کا ڈرائیور فوراً ہی اُن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیوں شریمان جی! کناٹ پلیس چلو گے؟'' پشکر نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جرور چلیں گے مہاشے جی..... پدھاریئے!'' ڈرائیور نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ انجن سٹارٹ ہوا، ٹیکسی ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی اور ہلکی رفتار سے ایک طرف چلنے لگی۔

ٹیکسی، مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی کناٹ پلیس پہنچ گئی۔ یہ نئی دہلی کا مصروف ترین علاقہ تھا۔ پشکر نے وجے چوک کے ساتھ پارلیمنٹ سٹریٹ پر ٹیکسی رُکوائی اور ڈرائیور کو کرایہ دے کر نیچے اُتر آیا۔ دوسرے دروازے سے طارق بھی اُتر چکا تھا۔

بہت بڑے چوراہے پر بڑا خوبصورت پارک بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف دو منزلہ عمارتیں تھیں۔ یہاں بے شمار دُکانیں اور ریسٹورنٹ وغیرہ تھے۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اس حصے میں آ گئے۔ یہاں زیادہ تک دُکانیں تبتی باشندوں کی تھیں۔ یہ تبتی باشندے دراصل وہ مہاجر تھے جو برسوں پہلے اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے تھے۔ اُن کی اکثریت اسی علاقے میں آباد تھی اور یہاں کا زیادہ کاروبار بھی اُن ہی کے قبضے میں تھا۔

طارق ابھی تک یہ نہیں جان سکا تھا کہ پشکر اُسے کہاں لے جا رہا ہے؟ اُس نے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دونوں ایک تنگ سی سڑک پر آ گئے۔ یہاں تبتی باشندوں کی چھوٹی چھوٹی لاتعداد دُکانیں تھیں۔ ان دُکانوں پر ہر قسم کا سامان دستیاب تھا۔ قدیم نوادرات کی دُکانیں بھی تھیں اور بعض اچھے اور بڑے جنرل سٹور بھی تھے۔ ہر دُکان پر گاہک نظر آ رہے تھے۔

اُن میں کچھ غیر ملکی بھی تھے۔

وہ دونوں نوادرات کی ایک دُکان کے سامنے رُک گئے۔ دُکان کے سامنے تبت اینٹیک شاپ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اُس دُکان کی چوڑائی تو شاید دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی لیکن لمبائی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ یہ دُکان اندر دُور تک کسی سرنگ کی طرح نظر آ رہی تھی جس کے دونوں طرف شیلفوں میں ایسی چیزیں بھری ہوئی تھیں جنہیں ایک عام آدمی کاٹھ کباڑ کا نام ہی دے سکتا تھا۔ لیکن یہ چونکہ ایک اینٹیک شاپ میں تھیں اس لئے انہیں آثارِ قدیمہ اور نوادرات کا نام دیا گیا تھا۔ درمیان میں بھی ایسی چیزوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

اُس اینٹیک شاپ کا مالک ایک بوڑھا تبتی تھا۔ اُس کے چہرے پر جھریوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ طارق کے خیال میں اُسے بھی آثارِ قدیمہ میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

اس وقت دُکان میں تین گاہک تھے۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ اُن کا تعلق کسی یورپی ملک سے تھا اور طارق کے خیال میں قدیم چیزوں کے قدردان یہی لوگ تھے جو اس قسم کی چیزوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے کو تیار رہتے تھے۔

طارق اور پشکر دُکان کے سامنے ہی رُک کر چیزوں کے انبار کو دیکھتے رہے۔ پھر جب وہ گاہک باہر نکل گئے تو یہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ اُنہیں دیکھ کر بوڑھے تبتی کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نمودار نہیں ہوئے۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ یورپی گاہکوں کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ ایسی چیزوں کے خریدار یورپین ہی ہیں۔ انڈین لوگ تو محض وقت ضائع کرنے آتے ہیں۔ طارق اور پشکر تنگ راستے پر چلتے ہوئے سرنگ نما دُکان میں آگے بڑھتے رہے۔ بوڑھا تبتی اپنی کرسی پر بیٹھا گہری نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے شاید شبہ تھا کہ یہ لوگ کوئی چیز اُٹھا کر جیب میں رکھ لیں گے۔

وہ دونوں ایک جگہ رُک گئے۔ طارق نے شیلف پر سے ایک پیالہ اُٹھا لیا۔ یہ پیالہ ایک پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا اور اُس کی بیرونی سطح پر مہاتما بدھ کی شبیہہ کندہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک ٹیگ بھی لگا ہوا تھا جس میں انگریزی میں پتھر کے اس پیالے کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ طارق چند لمحے اُس پیالے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر ٹیگ پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے لگا۔ اسی دوران بوڑھا تبتی اُس کے قریب آ گیا۔

''پتھر کا یہ خوبصورت پیالہ تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔'' بوڑھے نے اُس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیالہ راجستھان کے ایک قدیم تاریخی شہر الور کے کھنڈرات میں کھدائی کے دوران برآمد ہوا تھا۔ تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ پیالہ شہنشاہ

اشوک نے بنوایا تھا۔ اشوک، مہاتما بدھ کا بہت بڑا پیروکار تھا۔ اُس کے دورِ حکومت میں بدھ مذہب نے جو ترقی کی.....''

''اگر پتھر کا یہ پیالہ اس قدر تاریخی اہمیت کا حامل ہے تو اسے تو دہلی کے سرکاری میوزیم میں ہونا چاہئے تھا۔'' طارق نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہی تو بدقسمتی ہے کہ جو لوگ میوزیم کے کرتا دھرتا ہیں، وہ ایسی چیزوں پر توجہ نہیں دیتے۔ اُنہوں نے تو اُوٹ پٹانگ قسم کی چیزیں میوزیم میں بھر رکھی ہیں، جنہیں نوادرات کا نام دے دیا گیا ہے۔'' بوڑھے تبتی نے کہا۔

''بہرحال! اس کی قیمت کیا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''ویسے تو یہ انمول چیز ہے۔ اس کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ لیکن میں تمہیں یہ تاریخی پیالہ صرف پچاس روپے میں دے سکتا ہوں۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

طارق نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے پیالہ دوبارہ شیلف پر رکھ دیا۔

''میرا خیال ہے، تم لوگوں کو کچھ خریدنا نہیں ہے۔ محض میرا وقت ضائع کرنے کے لئے آئے ہو۔'' بوڑھے نے باری باری اُن دونوں کو گھورا۔

''ہمیں واقعی کچھ نہیں خریدنا۔'' پشکر نے بوڑھے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ رحمان بابا کہاں ملے گا؟''

''کیا.....؟'' بوڑھا اُچھل پڑا۔ ''تم لوگ کون ہو.....؟'' اُس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہمیں چندن نے یہاں بھیجا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ تم ہمیں رحمان بابا تک پہنچا دو گے۔''

''اوہ.....!'' بوڑھے کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ''میرے ساتھ آؤ!'' وہ اُن دونوں کو لے کر دُکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔ بالکل آخر میں سرنگ نما یہ دُکان دائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ اُس طرف دُکان زیادہ لمبی نہیں تھی۔ البتہ یہاں بھی کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اُس نے ایک شیلف پر پیچھے کی طرف ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ یہ ہندوؤں کی قدیم دیوی شنو دیوی کا مجسمہ تھا۔ پیتل کا بنا ہوا یہ مجسمہ چھ انچ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ اُس کے جسم کا ہر حصہ الگ ہو سکتا تھا اور اُسے آسانی سے دوبارہ فٹ بھی کیا جا سکتا تھا۔ وشنو دیوی کے چھوٹے سے اس مجسمے کا دایاں بازو غائب تھا۔ بوڑھے تبتی نے یہ مجسمہ گتے کے خالی ڈبے میں رکھا اور اُنہیں اِشارہ کرتا ہوا دُکان کے بیرونی حصے میں آ گیا۔

''تیسری سڑک پر ایک جگہ تمہیں ڈلہوزی ہاؤس کا نیون سائن نظر آئے گا۔ اُس عمارت کے

اندر چلے جانا۔ وہاں سے کسی سے بھی پون کا پوچھ لینا۔ پون ہی وہ آدمی ہے جو تمہیں رحمان بابا تک پہنچائے گا۔ وشنو دیوی کا یہ مجسمہ پون کو دے دینا۔ تمہارے پاس مجسمے کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہو گی کہ تم غلط آدمی نہیں ہو۔'' بوڑھے تبتی نے مجسمے والا ڈبہ پشکر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے.....!'' طارق نے کہا۔ ''بڑا پیچیدہ طریقہ کار اپنا رکھا ہے تم لوگوں نے۔''

''احتیاط بہت ضروری ہے۔'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور اگر میرا خیال غلط نہیں تو تم ہی وہ نوجوان ہو، جسے تہاڑ جیل سے نکلوایا گیا تھا۔ مجھے تمہارے ساتھی کی موت کا افسوس ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد سے اب تک تمہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا، مجھے اس کا بھی اندازہ ہے۔ لیکن بہرحال! اب تمہیں مزید پریشانیاں نہیں اُٹھانی پڑیں گی۔ تمہیں آج رات ہی تمہارے آدمیوں کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ یہ پیچیدہ طریقہ کار بھی صرف اسی لئے اختیار کیا گیا ہے کہ تمہارے لیڈر کا یہی حکم تھا۔ اگر تمہارے فرار کے فوراً بعد ہنگامہ نہ مچتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

''لیکن تم لوگ کون ہو..... اور ہمارے لئے یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟'' طارق نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارے اس سوال کا جواب اس نوجوان نے دے دیا ہو گا۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دونوں اُس اینٹیک شاپ سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئے اور پھر تیسری سڑک پر اُنہیں ڈلہوزی ہاؤس والا نیون سائن تلاش کرنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ یہ سڑک کافی کشادہ تھی۔ اس پر دونوں طرف بڑی بڑی دُکانیں، شوروم اور ڈیپارٹمنٹل سٹورز تھے۔ اُن دکانوں پر آنے والے گاہکوں کا تعلق بھی اُونچے طبقے سے تھا۔ سڑک کے دونوں طرف قیمتی اور چمکتی ہوئی کاریں کھڑی تھیں۔

ڈلہوزی ہاؤس دراصل ایک بہت بڑا کلب تھا۔ شیشے والے مرکزی دروازے پر ایک باوردی بونا کھڑا تھا۔ اُس کا قد بمشکل تین فٹ رہا ہو گا۔ اُنہیں دیکھ کر اُس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ آگے ایک مختصر لابی تھی۔ فرش پر دبیز قالین تھا جس پر صوفے رکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں شیشے کی ٹاپ والی ایک گول کافی ٹیبل بھی پڑی تھی۔ ایک صوفے پر دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اُن پر توجہ دیئے بغیر لابی سے آگے شیشے کے ریوالونگ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

اُس دروازے سے آگے ایک وسیع ہال تھا۔ اُس ہال میں روشنی مدھم تھی۔ دُور سے کسی کا چہرہ پہچاننا مشکل تھا۔ اُس ہال میں تقریباً ڈیڑھ درجن میزیں بچھی ہوئی تھیں لیکن کوئی میز خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دائیں طرف بار کاؤنٹر کے سامنے بھی کچھ لوگ سٹولوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''یہاں کوئی ٹیبل خالی نہیں سر! اگر آپ پسند کریں تو کرسٹل رُوم میں.....'' ایک باوردی ملازم نے اُن کے قریب آ کر کہا۔

''ٹھیک ہے..... کرسٹل رُوم ہی سہی۔'' پشکر نے اُسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''اس طرف تشریف لائیے!'' ملازم نے اشارہ کیا۔ وہ، ملازم کے ساتھ بائیں طرف بڑھ گئے۔ سامنے دیوار میں بظاہر کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہ جیسے ہی قریب پہنچے، دیوار کا ایک حصہ بائیں طرف سرک گیا۔ اُس آٹومیٹک دروازے کا میکنزم شاید فرش میں تھا۔ بوجھ پڑتے ہی حرکت میں آ گیا تھا اور دروازہ کھل گیا تھا۔

کرسٹل رُوم واقعی کرسٹل رُوم تھا۔ چھت اور دیواروں پر نصف اُوپری حصے پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بار کاؤنٹر بھی تھا۔ یہاں بھی میزوں پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ مدھم روشنی اور مہکتی فضا میں دیواروں سے پھوٹتی ہوئی موسیقی کی مدھم لہریں بڑا رُومان انگیز تاثر دے رہی تھیں۔ کرسٹل رُوم میں آنے کے بعد طارق اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اُن کے ساتھ آنے والے باوردی ملازم نے اُنہیں ایک میز پر بٹھا دیا۔

''ابھی ویٹریس آئے گی۔ اپنی فرمائش اُسے نوٹ کرا دیجئے!'' اُس ملازم نے کہا اور واپس چلا گیا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد طارق، متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر میز پر حوا کی بیٹی ایک نئے رنگ میں نظر آ رہی تھی۔ ڈلہوزی ہاؤس کا شمار اُن جگہوں میں ہوتا تھا، جہاں دولت اور ہوس کے پجاری، شکار کھیلتے تھے۔ ہاں کوئی شکار کرتا ہے اور کوئی شکار ہوتا ہے۔ شکار اور شکاری دونوں ہی ایک دوسرے کی تاک میں رہتے ہیں۔

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی تعداد اگرچہ اچھی خاصی تھی۔ لیکن کسی طرف سے کوئی آواز تک نہیں آ رہی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ایسی جگہوں پر اُونچی آواز میں بات کرنا بھی خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے۔

تین ویٹریس ہال میں مختلف میزوں پر سرو کرتی پھر رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ایک ویٹرس اُن کی طرف آ گئی۔ اُسے دیکھ کر طارق کو سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُس لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سال رہی ہوگی۔ اُس کے جسم پر لباس بھی لباس کے نام پر تہمت تھا۔

''یس پلیز.....!'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہم، پون کے مہمان ہیں۔ اُس سے پوچھو کہ وہ ہماری کیا تواضع کرنا چاہتا ہے؟'' پشکر نے کہا۔

''جی..... میں سمجھی نہیں۔'' لڑکی نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تمہارے نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جب پون کو بتاؤ گی کہ اُس کے مہمان آئے ہیں تو وہ سمجھ جائے گا۔'' پشکر مسکرایا۔

''یس سر.....!'' لڑکی کہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی۔

طارق اُس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ لچکتی ہوئی بار کاؤنٹر کے ساتھ ایک دروازے میں داخل ہو گئی۔ اُس کی واپسی میں پانچ منٹ لگے تھے۔ وہ میزوں کے درمیان گھومتی ہوئی اُن کے قریب آ گئی۔

''آئیے سر! مسٹر پون آپ کے منتظر ہیں۔'' ویٹریس نے کہا۔ وہ دونوں میز سے اُٹھ گئے۔ گتے کا وہ ڈبا پشکر کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں، ویٹریس کے پیچھے چلتے ہوئے کاؤنٹر کے ساتھ اسی راستے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک نیم تاریک سی راہداری تھی۔ فرش پر گرے کلر کا قالین بچھا ہوا تھا۔ تقریباً پندرہ فٹ کے بعد راہداری دائیں طرف مُڑ گئی۔ اُس طرف دس قدم کے فاصلے پر نیچے اُترنے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ سات سیڑھیاں اُترنے کے بعد پھر ایک تنگ سی راہداری تھی جس کا اختتام ایک کمرے پر ہوا۔ ویٹریس کمرے کے سامنے رُک گئی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''یس..... کم اِن!''

ویٹریس نے دروازہ کھول دیا۔ پہلے خود اندر داخل ہوئی، پھر اُنہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف شیشے کے ٹاپ والی بہت بڑی آفس ٹیبل تھی جس پر چند دیگر چیزوں کے علاوہ ایک انٹرکام اور چار ٹیلی فون سیٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ میز کے پیچھے والی دیوار میں دائرے کی شکل میں ایک خوبصورت الماری بنی ہوئی تھی جس میں شراب کی مختلف اقسام کی چند بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر نیم عریاں لباس میں لڑکیوں کی بڑی بڑی رنگین تصویروں والے فریم آویزاں تھے۔ میز کے ساتھ تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور سامنے والی دیوار کے ساتھ آرام دہ صوفہ بچھا ہوا تھا جس کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل بھی موجود تھی۔ شیشے کے ٹاپ والی بڑی آفس ٹیبل کے پیچھے جو آدمی بیٹھا تھا، اُسے دیکھ کر طارق دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ دُبلا پتلا

سا آدمی تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ گردن تک لمبے بال بالکل سفید تھے اور مونچھیں بالکل کالی جو چوہے کی دُم کی طرح دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں۔

''آپ کے مہمان مسٹر پون!'' طارق اور پشکر کے ساتھ آنے والی ویٹریس نے کہا۔

''تھینک یو رجنی! تم جا سکتی ہو۔'' پون نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ویٹریس خاموشی سے باہر نکل گئی۔ جی شریمان جی! آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟'' پون نے پشکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پشکر نے کچھ کہنے کی بجائے گتے کا وہ ڈبا اُس کے سامنے رکھ دیا۔ پون نے ڈبا کھولا تو اس میں وشنو دیوی کی مورتی دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے مورتی کو ڈبے میں سے نکال کر میز پر رکھ دیا اور میز کی دائیں طرف والی سب سے نچلی دراز کھول کر پیتل کا ایک چھوٹا سا باز و نکالا اور اُسے مورتی میں فٹ کرنے لگا۔ باز و، مورتی میں بالکل فٹ آ گیا تھا۔ پون مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور بڑی گرمجوشی سے باری باری دونوں سے ہاتھ ملایا۔

''آپ میں سے طارق کون ہے.....؟''

''یہ طارق ہیں۔ اور میرا نام پشکر ہے۔'' پشکر نے تعارف کرایا۔ ''مسٹر طارق کچھ پریشان ہو رہے ہیں۔ انہیں کب تک رحمان بابا کے پاس بھیج دیا جائے گا؟''

''یہاں سے سیدھے رحمان بابا کے پاس ہی جائیں گے۔'' پون نے کہا۔ ''لیکن پہلے یہ بتائیے! کہ کیا پینا پسند کریں گے؟ کافی یا کچھ اور؟''

''کافی ٹھیک رہے گی۔'' طارق، پشکر سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

پون نے انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کر ایک بٹن دبایا، تین کپ کافی کے لئے کہا اور ریسیور رکھ کے شہر کی موجودہ صورتحال کے بارے میں اُن سے باتیں کرنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک ویٹریس کافی لے کر آ گئی۔ یہ رجنی نہیں، کوئی اور ویٹریس تھی۔ وہ اُن تینوں کے سامنے کافی رکھ کر واپس چلی گئی۔

اُنہیں یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ طارق اپنے آپ میں کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دراصل جیل سے فرار ہونے کے بعد سے اب تک وہ دوسروں کے ہاتھ میں رہا تھا۔ دوسروں کی مرضی کا محتاج..... وہ اپنے طور پر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ دوسروں کی ہدایات پر عمل کرنے کا اس لئے بھی پابند تھا کہ اُن کے بغیر وہ اپنوں سے رابطہ بھی قائم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس قسم کے کاموں میں رازداری برتی جاتی ہے۔ لیکن موجودہ طریقہ کار سے وہ اُلجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔

کافی پینے کے بعد پون نے میز کے نیچے لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا اور سامنے والی دیوار کا ایک حصہ سلائیڈنگ ڈور کی طرح اپنی جگہ سے سرک گیا۔ دروازہ کھلتے ہی دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ لباس اور چہروں سے وہ دونوں چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔

''گاڑی تیار ہے.....؟'' پون نے پوچھا۔

''یس سر.....!'' اُن میں سے ایک نے جواب دیا۔

وہ دونوں اُٹھ کر پون کے ساتھ اُس خفیہ دروازے سے باہر آ گئے۔ اُن کے نکلتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس طرف بھی ایک کمرہ ہی تھا۔ لیکن اس میں دو تین کرسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کمرے سے آگے ایک تنگ سی راہداری تھی جس کے اختتام پر اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ اُن سیڑھیوں نے اُنہیں ایک اور کمرے میں پہنچا دیا۔ اور جب کمرے کا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلے تو طارق اور پشکر چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ یہ ایک تنگ اور نیم تاریک سی گلی تھی۔ وہ گلی میں آ گئے۔ دروازے سے چند گز آگے گلی میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

''مسٹر پشکر!'' پون اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر طارق کو یہاں تک لانے کا بہت شکریہ۔ آپ راجو کے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھ جائیے۔ وہ آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا دے گا۔ میں مسٹر طارق کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں، بابا رحمان کے پاس۔''

''اُن دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر پشکر، راجو کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ گیا جبکہ طارق اور پون دوسری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ اُس تیسرے آدمی نے سنبھال لیا تھا۔

گاڑی، حرکت میں آ کر کناٹ پلیس کے مین روڈ پر آ گئی۔ ہنومان مندر سے گاڑی پارلیمنٹ سٹریٹ پر گھوم گئی اور پھر مختلف سڑکوں پر ہوتے ہوئے وہ مولانا آزاد روڈ پر نکل آئے۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک اور سڑک پر گھوم گئے۔ یہ اُونچے طبقے کا رہائشی علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے بنگلے تھے۔ پون نے ڈرائیور کو کسی قسم کی ہدایات وغیرہ نہیں دی تھیں۔ اُسے شاید اپنی منزل کا علم تھا۔ گاڑی ایک اور سڑک پر گھوم کر ایک بنگلے کے سامنے رُک گئی۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو فوراً ہی گیٹ کھل گیا اور ڈرائیور، گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔

گاڑی، کشادہ پورچ میں رُک گئی۔ پون نیچے اُتر آیا۔ طارق بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا تھا۔ وہ دونوں کشادہ برآمدے میں پہنچے ہی تھے کہ اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی

عورت نکل کر سامنے آ گئی۔ اُس عورت کا لباس دیکھ کر طارق نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس لباس پر اُس نے جس طرح چادر اوڑھ رکھی تھی، اس سے طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ مسلمان تھی۔ وہ دونوں اُس عورت کے ساتھ برآمدے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔

باہر سے یہ بنگلا شاندار تو نظر آتا ہی تھا، لیکن اندر سے بہت ہی زیادہ خوبصورت تھا۔ تمام راہداریوں اور کمروں میں وال ٹو وال کارپٹ بچھے ہوئے تھے۔ پون، طارق کو ڈرائنگ رُوم میں لے آیا۔ بہت ہی شاندار ڈرائنگ رُوم تھا۔ اُس ڈرائنگ رُوم کی آرائشی چیزوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کسی مسلمان کا گھر ہے۔ آتش دان کے اُوپر دیوار پر ایک بہت بڑے سنہری فریم میں پورے قرآن شریف والا طغرہ آویزاں تھا۔ طارق نے پون کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' پون نے کہا۔ ''اس کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ کچھ دیر بعد شاہ رُخ سے تمہاری ملاقات ہوگی، جس سے تم تفصیل سے گفتگو کر سکو گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر اُس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کھانا تیار ہے جنت بی بی.....؟''

''جی، صاحب جی! دس منٹ میں کھانا، میز پر لگ جائے گا۔'' وہ عورت باہر چلی گئی۔ طارق کا خیال تھا کہ پون اُسے یہاں کسی اور کے حوالے کر کے چلا جائے گا۔ لیکن وہ تو کھانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ کھانے کے نام پر وہ خود بھی بھوک محسوس کرنے لگا تھا۔ پون بھی باہر جا چکا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد جنت بی بی نے طارق کو اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ وہ اُس کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دُبلا پتلا سا آدمی تھا۔ کلین شیو، سر کے بال سیاہ اور بہت چھوٹے تھے جنہیں کنگھے کی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی۔ طارق اُسے دیکھ کر اُٹھ گیا۔

''بیٹھو، بیٹھو! تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ شخص ہاتھ ملاتے ہوئے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''میرا نام شاہ رُخ ہے۔ میں بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تمہیں یہاں تک پہنچنے کے سلسلے میں بہت دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ اس قسم کے کاموں میں کس قدر رازداری کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''کیا پشکر یا وہ لوگ اس راز کو فاش نہیں کر دیں گے جن کے توسط سے میں جیل سے باہر آیا ہوں؟'' طارق نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ نجانے اُسے یہ احساس کیوں

ہو رہا تھا کہ اُس شخص کو وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ لیکن اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا؟

''نہیں.....'' شاہ رُخ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''پشکر اور اُس کے ساتھیوں کا تعلق ایک ایسی تنظیم سے ہے جو انسانی حقوق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اس میں ہندوؤں کے علاوہ دوسری قومیتوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔ اگر اس تنظیم سے ہمارا رابطہ نہ ہوتا تو تمہیں جیل سے نکلوانا ناممکن ہوتا۔'' شاہ رُخ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم شاید یہ سوچ رہے ہو گے کہ ہم تمہیں بھول گئے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم، تمہیں ایک لمحے کو بھی نہیں بھولے۔ ہم نے تم سے جیل میں اس لئے رابطہ قائم نہیں کیا تھا کہ حکام کا یہ شبہ یقین میں بدل جاتا کہ تمہارا تعلق کشمیر کی لبریشن فرنٹ سے ہے اور تم کسی خفیہ مشن پر دہلی آئے ہو۔ اسی لئے ہم لوگ، تم سے دُور ہی رہے۔ لیکن پھر صورتِ حال دیکھتے ہوئے ہم نے تم دونوں کو جیل سے نکلوانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سلیم کی موت کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ اُسے ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔''

''سلیم ایک بہادر نوجوان تھا۔'' طارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جیل میں اُس پر جس قدر تشدد کیا گیا، اُس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ لیکن اُس نے زبان نہیں کھولی۔'' طارق نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سلیم کے ذکر پر اُس کی بھوک مر گئی تھی۔ شاہ رُخ نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ماحول پر چند لمحوں کے لئے افسردگی سی طاری رہی۔ پھر وہ موضوع بدل کر گفتگو کرنے لگے۔

''آؤ! ڈرائنگ رُوم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' شاہ رُخ کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔ اسی وقت جنت بی بی ڈائننگ رُوم میں داخل ہوئی۔ ''جنت بی بی! ہم لوگ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے لئے کافی بھجوا دو!''

''جی بہت اچھا!'' جنت بی بی نے جواب دیا۔

شاہ رُخ نے جب جنت بی بی کو کافی کے لئے کہا تو طارق نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔ اُسے فوراً ہی یاد آ گیا کہ اس سے پہلے شاہ رُخ کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟

''مسٹر پون یہاں آنے کے بعد کھانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ لیکن وہ کھانے پر نہیں آئے؟'' طارق نے ڈرائنگ رُوم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اُسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا تھا۔ اس لئے واپس چلا گیا۔ میرا بڑا بے تکلف دوست ہے

اور اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔'' شاہ رُخ نے جواب دیا۔

''لیکن میرے خیال میں وہ واپس نہیں گیا، اس وقت بھی گھر میں موجود ہے۔ بعض لوگ دھوکہ کھا سکتے ہیں، لیکن میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔'' طارق، اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''اوہ.....!'' شاہ رُخ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ''تم واقعی ذہین آدمی ہو۔ ویسے کچھ دیر بعد میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا۔''

''یہ دُہری شخصیت..... کیا اس کا مطلب بتائیں گے؟'' طارق نے کہا۔

''ہم، ہندوستان میں ایک کاز کے لئے کام کر رہے ہیں۔'' شاہ رُخ نے جواب دیا۔ ''اور ہم نے اپنی زندگیاں اس کاز کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ یہاں میرے کئی رُوپ ہیں۔ ڈلہوزی ہاؤس کا مالک پون، ہندو ہے۔ گرے ہاؤنڈ بس سروس اور ریلو کیب کمپنی کا مالک اوتار سنگھ، سکھ ہے۔ جبکہ کشمیر فوڈ انڈسٹریز کا مالک لیاقت حسین، مسلمان ہے۔ اس کے علاوہ میرے اور بھی کئی رُوپ ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا۔ میرا اصل رُوپ یہی ہے، شاہ رُخ..... جو اِس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ ایک وطن پرست کشمیری مجاہد..... جو یہاں رہ کر اپنی سرزمین کی آزادی کی جدوجہد میں اپنا رول ادا کر رہا ہے۔ لیکن..... تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ حالانکہ میرے تمام میک اَپ ایسے ہیں کہ مجھے میرے آدمی بھی نہیں پہچان سکتے۔ صرف دو تین افراد ایسے ہیں، جو میری مختلف شخصیات سے واقف ہیں۔ ایک جنت بی بی، دوسرا شیر دل۔ جو ہمیں گاڑی پر یہاں چھوڑنے آیا تھا۔ تیسرا جیون، جو پشکر کے ساتھ گیا تھا۔ اُس کا اصل نام مراد علی ہے۔ ایک دو اور آدمی ہیں جو میرے مختلف بہروپ سے واقف ہیں۔ لیکن تم نے فوراً ہی کیسے پہچان لیا؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ پون نے یہاں آتے ہی بڑی بے تکلفی سے جنت بی بی کو مخاطب کرتے ہوئے کھانا لگانے کو کہا تھا۔ لیکن وہ کھانے کی میز پر نہیں آیا۔ پھر آپ نے جنت بی بی کو کافی لانے کو کہا تو میں نے فوراً ہی پہچان لیا کہ پون اور شاہ رُخ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ڈلہوزی ہاؤس میں پون نے بھی انٹرکام پر کسی سے کافی لانے کو کہا تھا۔ دونوں مرتبہ کافی کا لفظ ایک مخصوص انداز میں ادا ہوا تھا۔ اور یہ لفظ ہی آپ کی شناخت بن گیا۔'' طارق نے کہا۔

''میری اِس غلطی کی نشاندہی کا شکریہ! آئندہ میں خیال رکھوں گا۔'' شاہ رُخ نے کہا اور جنت بی بی کی طرف دیکھنے لگا جو کافی لے کر اندر آ رہی تھی۔

جنت بی بی، کافی میز پر رکھ کر چلی گئی۔ کافی کی چسکیوں کے ساتھ وہ کشمیر کی موجودہ صورتحال

گفتگو کرنے لگے۔ چار سال جیل میں رہنے کے دوران طارق اگرچہ چارلس سوبھراج کے پاس آنے والے اخبارات کے ذریعے صورتحال سے واقفیت حاصل کرتا رہا تھا۔ لیکن بھارتی اخبارات، حالات کا صرف ایک رُخ پیش کرتے تھے۔ وہ کشمیری حریت پسندوں کو غدار، لٹیرے، دہشت گرد اور ڈاکو ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ہندو اخبارات کے ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں نے آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ یہ تو دیکھ لیتے تھے کہ کشمیری مجاہدین کے ہاتھوں دو بھارتی فوجی ہلاک ہو گئے تھے۔ لیکن یہ اُنہیں کبھی نظر نہیں آتا تھا کہ بھارتی لٹیروں نے بے گناہ کشمیریوں کے کتنے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا تھا؟ کتنے بے گناہ اور معصوم کشمیریوں کو زندہ جلا دیا تھا یا اُنہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اور اب شاہ رُخ سے طارق کو جو حالات معلوم ہو رہے تھے، اُنہیں سن کر اُس کا خون کھولتا جا رہا تھا۔ ابھی دو دن پہلے ہی سرینگر سے چند میل دُور سوپور کے نواح میں بھارتی بھیڑیوں نے کشمیری مسلمانوں کی ایک پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اُس بستی والوں کا قصور صرف یہ تھا کہ اُنہوں نے دو نوعمر کشمیری مجاہدین کو بھارتی فوجیوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پچاس افراد کی آبادی پر مشتمل اس آبادی میں صرف دو آدمی بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اُن بھارتی وحشیوں نے شیر خوار معصوم بچوں تک کو اُٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا تھا۔

رات، نصف سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن طارق اور شاہ رُخ کو باتوں میں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں رہا تھا۔ بالآخر طارق نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ ''چار سال پہلے مجھے اور سلیم کو ایک اہم مشن پر بھیجا گیا تھا۔ لیکن اُس مشن کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ پھر حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا، جو آپ کے بھی علم میں ہے۔ اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا پروگرام ہے؟''

''پروگرام وہی ہے۔ بس! تھوڑی سی تبدیلی آئی ہے۔'' شاہ رُخ نے جواب دیا۔ ''ایک دو دن بعد تمہیں منصوبے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ اس دوران تم گھوم پھر کر دہلی کے گلی کوچوں سے واقفیت حاصل کرو گے۔ صبح دل شیر یہاں آ جائے گا۔ وہ تمہارے ساتھ رہے گا اور تمہیں تمام علاقوں کے بارے میں بتا دے گا۔ اب تم آرام کرو۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ آؤ! میں تمہیں، تمہارا کمرہ دکھاؤں۔''

شاہ رُخ کے ساتھ طارق بھی اُٹھ گیا۔ شاہ رُخ اُسے راہداری کے آخر میں ایک بیڈ رُوم میں لے آیا۔ اس کمرے میں آرام دہ بستر کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''اس الماری میں مختلف کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں۔ تمہارے سائز کے بھی ہوں گے۔'' شاہ

رُخ نے دیوار کے ساتھ ایستادہ ایک الماری کی طرف اِشارہ کیا۔

شاہ رُخ کے جانے کے بعد طارق نے سب سے پہلے داڑھی، مونچھ اور سر پر سجی ہوئی وِگ سے نجات حاصل کی، پھر الماری میں سے شلوار قمیص نکال کر پہنی اور بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بستر پر لیٹا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر نجانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

☆

دہلی کی تاریخ نہ صرف بہت قدیم ہے، اس شہر نے عروج و زوال کی لاتعداد داستانوں کو جنم بھی دیا ہے۔ ان میں جدال و قتال کی لہو رنگ داستانیں بھی ہیں اور عشق و محبت کی شیریں کہانیاں بھی۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری یا چوتھی صدی قبل مسیح میں مہابھارت کے پانڈے برادران نے جمنا کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی بسائی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ بستی ٹھیک اسی جگہ بسائی گئی تھی جہاں آج پرانا قلعہ کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ آٹھویں یا نویں صدی عیسوی میں اس بستی پر راجپوت سرداروں کا قبضہ ہو گیا اور اُسے دہلی کا نام دیا گیا۔ اُس بستی کے گرد پتھروں کی ایک مضبوط فصیل تعمیر کی گئی جسے آج لال کوٹ کہا جاتا ہے۔ بارہویں صدی میں راجستھان کے چوہان سردار، اس بستی پر قابض ہو گئے۔ پرتھوی راج چوہان سوئم نے شہر کو مزید وسعت دی اور بہت سا علاقہ شامل کر کے اس کے گرد ایک اور حفاظتی فصیل تعمیر کر دی۔ یہ علاقہ آج قلعہ رائے پتھورا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن پرتھوی راج اس شہر پر زیادہ عرصے تک قابض نہ رہ سکا۔ 1192-93ء میں وسطِ ایشیا کے شہر غور سے تعلق رکھنے والے ایک ترک سردار محمد بن حسام عرف محمد غور نے دہلی پر قبضہ کر کے پرتھوی راج کو قتل کر دیا۔ پرتھوی راج کی موت کے ساتھ ہی ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور اسلام کی پہلی کرن، جہالت کے اندھیروں میں شگاف ڈالتی ہوئی نظر آئی۔ اس دور کو دہلی کا وہ دور کہا جا سکتا ہے، جب صحیح معنوں میں اُس شہر کی ترقی کا آغاز ہوا۔ اُسی دور میں اُردو زبان نے جنم لیا اور اُس کی نشوونما شروع ہوئی۔ 1290ء میں خلجی سلطنت معرضِ وجود میں آئی۔ علاؤ الدین خلجی نے دہلی کی اصل آبادی کے شمال مشرق میں ایک اور بستی بسائی جسے آج بھی سری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ خلجیوں کے بعد تغلق خاندان کا دور شروع ہوا۔ اس سلطنت کے بانی غیاث الدین تغلق نے لال کوٹ کے جنوب میں پانچ میل کے فاصلے پر ایک تیسری بستی بسائی جسے تغلق آباد کا نام دیا گیا۔ اس کے جانشین محمد تغلق نے جنوبی شہر کو اپنا پایہ سلطنت بنایا۔ لیکن جلد ہی اُسے واپس آنا پڑا اور اُس نے سری بستی اور قلعہ رائے پتھورا کے درمیان ایک چوتھا شہر آباد کیا جسے جہاں پناہ کا نام دیا گیا۔ تغلق خاندان کے تیسرے حکمران فیروز شاہ نے جمنا کے کنارے ٹیلوں پر اپنے نام سے (فیروز آباد) ایک پانچواں شہر بسایا۔ یہ علاقہ آج

بھی کوٹلہ فیروز شاہ کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

1414ء میں سید خاندان نے سلطنت دہلی پر قبضہ کر لیا اور 1451ء میں لودھی خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ سید اور لودھی سلاطین کے دور میں دہلی کی تعمیر و ترقی پر زیادہ کام نہیں ہو سکا۔ 1526ء مغل فاتح بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑی۔

بابر نے آگرہ کو دارالسلطنت بنایا اور دہلی کی تعمیر و ترقی پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ لیکن اس کے بعد ہمایوں نے دین پناہ کے نام سے فیروز آباد کے مغرب میں جمنا کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا۔ اس سے دہلی کو مزید وسعت ملی۔ ہمایوں کے بعد اکبر نے اپنے دادا کی طرح آگرہ میں بیٹھ کر حکومت کی۔ لیکن اُس کے پوتے شاہجہان نے دہلی کو ترجیح دی اور فیروز آباد کے شمال میں شاہجہان آباد کے نام سے ایک اور شہر آباد کیا۔ لال قلعہ بھی اسی علاقے میں تعمیر کرایا گیا۔ شاہجہان آباد 1857ء تک مغلوں کا دارالحکومت رہا۔ لیکن درحقیقت 1707ء کے بعد ہندوستان پر مغلوں کی گرفت میں کمزوری آنا شروع ہو گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی۔ مغل حکمرانی برائے نام ہی تھی۔ 1857ء میں مغلوں نے اپنی طاقت منوانے کی آخری کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ آخری مغل شہنشاہ کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور دارالحکومت، کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد پچاس سال تک دہلی کی حیثیت ہندوستان کے ایک عام شہر کی سی رہی۔ لیکن 1911ء میں برٹش گورنمنٹ نے اپنا دارالحکومت دوبارہ کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا۔ اور اس طرح دہلی کی مرکزی حیثیت ایک بار پھر بحال ہو گئی۔

دل شیر ایک بہت اچھا گائیڈ ثابت ہوا تھا۔ وہ طارق کو شہر کے مختلف علاقوں میں گھمانے پھرانے کے ساتھ ہر علاقے کے تاریخی پس منظر سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ شہر کا کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جو اُس نے طارق کو نہ دکھایا ہو۔

دل شیر کا تعلق بھی ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ اُس کا باپ برسوں پہلے کشمیر سے آ کر دہلی میں آباد ہوا تھا۔ اور جب آزادی پاکستان کی تحریک چلی تو ہندوستان میں بسنے والے لاکھوں دیگر مسلمانوں کی طرح دل شیر کے باپ نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کشمیری مسلمانوں کا خیال تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گا تو کشمیر کی جنت نظیر وادی کو بھی غاصب ہندوؤں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ معاہدے کی رُو سے مشرقی پنجاب کے بہت سے علاقے تو پاکستان میں شامل ہونا تھے۔ لیکن ہندوؤں نے انگریزوں سے ساز باز کر کے نہ صرف وہ علاقے نئی مملکت پاکستان کے حوالے نہیں کیے، بلکہ کشمیر پر بھی اپنا قبضہ رکھا۔

دل شیر کا باپ قیام پاکستان کے بعد بھی دہلی ہی میں مقیم رہا۔ 1958ء میں دہلی میں
کشمیری مسلمانوں نے آزادی کشمیر کے حق میں مظاہرہ کیا۔ مظاہرہ، پُرامن تھا جس پر پولیس
پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر گولی چلا دی۔ پولیس کی اس وحشیانہ کارروائی میں کئی مسلمان مظاہ
شہید ہو گئے جن میں دل شیر کا باپ بھی شامل تھا۔ دل شیر کی عمر اُس وقت صرف دو سال تھی
شیر کا باپ، شاہ رُخ کے باپ کا ملازم تھا۔ دل شیر کو شاہ رُخ کے باپ نے پالا۔ چند سال
دل شیر کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ دل شیر، شاہ رُخ کے ساتھ اُس کے گھر میں پرورش پاتا رہا

دل شیر جب جوان ہوا تو باپ کی طرح وہ بھی کشمیری مسلمانوں کی خفیہ تحریک میں شامل
گیا۔ شاہ رُخ دہلی میں کشمیریوں کی اس خفیہ تحریک کا سربراہ تھا۔ لیکن چند لوگوں کے سوا کوئی
اُس کی اس حیثیت سے واقف نہیں تھا۔ شاہ رُخ کو دولت اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی
اُس کا کاروبار پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ شاہ رُخ نے اپنی ذہانت سے اُس کاروبار
مزید وسعت دی تھی۔ اُس کی دولت کا بیشتر حصہ ہندوستان میں کشمیریوں کی اس خفیہ تحریک
خرچ ہو رہا تھا۔

دل شیر اور مراد علی، شاہ رُخ کے دست راست تھے۔ اُن کے حلیے بظاہر غنڈوں جیسے تھے
اُنہوں نے نام بھی ہندوؤں جیسے اپنا رکھے تھے۔ لیکن وہ اپنی اس حیثیت سے فائدہ بھی اُ
رہے تھے۔

وہ تیسرا دن تھا۔ دل شیر اور طارق، آریہ سماج روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے چائے
رہے تھے۔ اُن کے سامنے کی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی چائے پینے کے دوران اخبار کا مطالعہ
رہا تھا۔ وہ شخص جب چائے ختم کر کے اُٹھا تو اخبار، میز پر ہی چھوڑ گیا۔ طارق نے اپنی جگہ
اُٹھ کر اخبار اُٹھا لیا۔ وہ شام کو شائع ہونے والا ایک انگریزی اخبار تھا۔

اخبار کے پہلے صفحے کے عین وسط میں مادھوری کی تصویر تھی۔ اُس کے ساتھ ہی دو کالمی سر
تھی۔ ''مفرور قیدی کو پناہ دینے والی ہندو عورت کو گرفتار کر لیا گیا۔'' طارق پوری خبر پڑھتا
گیا۔ خبر کے مطابق مادھوری کی گرفتاری، شنکر نامی اُس ہندو نوجوان کی اطلاع پر عمل میں آئی
جسے بقول اُس کے مادھوری بہلا پھسلا کر تاریک پارک میں لے گئی تھی اور پارک کے تاریک
گوشے میں جیل سے بھاگے ہوئے قیدی اور اُس کے ساتھی نے اُس کے کپڑے اُتروا لئے
اور مادھوری کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ شنکر نے آج صبح جب اخبار میں یہ پڑھا کہ جیٹھا
نامی ایک شخص نے بریلی میں اپنے سیٹھ کو قتل کر دیا تھا اور دو لاکھ روپے کی رقم لے کر بھاگ
تھا۔ مزید یہ کہ پولیس نے جیٹھا نند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے دہلی

جیٹھا نند کی پتنی مادھوری سے بھی پوچھ گچھ کی تھی۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد شنکر نے مقامی پولیس سے
رابطہ قائم کیا اور پولیس کے ساتھ مادھوری کے گھر جا کر اُسے شناخت کر لیا پولیس کی پوچھ گچھ کے
بعد مادھوری نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ جیل سے بھاگا ہوا ایک قیدی اور اُس کا ایک ساتھی، ایک
رات اور ایک دن اُس کے گھر میں چھپے رہے تھے لیکن اُنہوں نے اُسے جان سے مار دینے کی
دھمکی دی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ کسی کو اُن کے بارے میں بتانے کی جرات نہیں کر سکی۔ مادھوری
نے پولیس کو طارق کا وہ حلیہ بھی بتایا تھا، جس میں وہ اُس روز اُس کے گھر سے نکلا تھا۔ اخبار کی
اطلاع کے مطابق پولیس، مادھوری سے مزید تفتیش کر رہی ہے۔

طارق نے اخبار میز پر رکھ دیا۔ مادھوری نے اُس کا فرنچ کٹ داڑھی والا حلیہ بتایا تھا۔ جبکہ
شاہ رُخ کے پاس آنے کے بعد اُس نے وہ حلیہ بدل دیا تھا۔ اس وقت وہ ایک نئے حلیے میں
تھا۔ گردن تک لمبے بال، قلمیں رُخساروں تک پھیلی ہوئیں اور بھاری مونچھیں۔ اس حلیے میں
اُسے طارق کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے، اب اُٹھنا چاہئے۔'' دل شیر نے کہا۔

''ہاں..... چلو!'' طارق نے فوراً ہی کرسی چھوڑ دی۔

دل شیر نے کاؤنٹر پر پہنچ کر بل ادا کیا اور دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ وہ اس وقت
دریا گنج کے علاقے میں تھے اور اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ طارق کچھ تھکن سی
محسوس کر رہا تھا۔ وہ واپس جانا چاہتا تھا لیکن دل شیر اُسے لے کر دہلی دروازے کی طرف بڑھتا
گیا۔ اور پھر نوبت خانہ سے ہوتے ہوئے وہ چھتا بازار پہنچ گئے۔ یہ ایک تنگ سا بازار تھا جس پر
چھت پڑی ہوئی تھی اور جو کسی سرنگ کی طرح دُور تک چلا گیا تھا۔ یہاں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔
حقیقتاً کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ دل شیر ایک چھوٹے سے چائے خانے کے سامنے رُک گیا۔
یہ دُکان زیادہ بڑی نہیں تھی۔ صرف چار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ دروازے کے باہر موٹے موٹے
حروف میں کشمیری چائے لکھا ہوا تھا۔ دل شیر، طارق کو اِشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔
تمام میزوں پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی اور دو سکھ بھی نظر آ
رہے تھے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے چھوٹے قد کا
ایک بھاری بھرکم آدمی کھڑا تھا۔ اُس کا سر، انڈے کے چھلکے کی طرح صاف تھا۔ شیو بھی تازہ ہی
بنی ہوئی تھی۔ البتہ بڑی بڑی مونچھیں اُس کے پورے چہرے پر چھائی ہوئی تھیں۔ دل شیر کو دیکھ
کر وہ شخص چونک سا گیا۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پا لیا۔ دل شیر
چند لمحے سرگوشیوں میں اُس سے باتیں کرتا رہا، پھر طارق کو اِشارہ کرتے ہوئے چائے خانے

سے باہر آ گیا۔

دل شیر یا طارق کو یہ اندازہ بالکل نہیں ہو سکا تھا کہ چائے خانے سے نکلنے کے بعد ایک آدمی اُن کے پیچھے لگ چکا تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر نوبت خانہ دہلی دروازے سے ہوئے ہندو مارگ پر آ گئے۔ وہ آدمی بدستور اُن کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کا قدرے بھاری بھرکم آدمی تھا جس نے براؤن رنگ کی پتلون اور سفید شرٹ پر کالے رنگ کا کوٹ رکھا تھا اور مفلر اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ اُس کا نصف چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے اور وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے محض سیر و تفریح کے لئے گھر سے نکلا ہو۔

نہرو مارگ پر آنے کے بعد ہی طارق نے اُس شخص کو دیکھا تھا۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اس شخص کو اُس نے چھتا بازار میں کشمیری چائے خانے کے سامنے بھی دیکھا تھا۔ اور اب یہ اُسے اپنے پیچھے دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ممکن ہے، یہ محض اتفاق ہو اور اُس شخص کو بھی اسی طرف آنا ہو۔ لیکن جب وہ ایک اور سڑک پر مُڑے تو وہ شخص اس وقت بھی اُن کے پیچھے تھا۔

''ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔'' طارق نے دل شیر کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

''میں بھی اُس شخص کو دیکھ چکا ہوں۔ خاموشی سے چلتے رہو۔ اس شخص کو یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ ہم، تعاقب سے آگاہ ہو چکے ہیں۔'' دل شیر نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

وہ شارٹ کٹ کرتے ہوئے میر درد روڈ پر آ گئے۔ یہاں رہائشی بنگلے تھے۔ کشادہ گلیاں تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی۔ دل شیر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں پیچھے آنے والے شخص سے نمٹا جا سکے۔ لیکن ابھی تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔ بالآخر وہ کوٹلہ روڈ پر پہنچ گئے۔ چھتا بازار سے یہاں تک وہ کئی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اور وہ شخص بڑی مستقل مزاجی سے اُن کا تعاقب کر رہا تھا۔

وہ دونوں کوٹلہ روڈ کی ایک گلی میں گھوم گئے۔ یہاں بھی بنگلے تھے۔ دل شیر نے طارق کو اشارہ کیا، اور وہ دونوں بڑی پھرتی سے ایک بنگلے کے سامنے ایک باڑ کے پیچھے کود گئے۔ چند سیکنڈ بعد وہ شخص بھی گلی کا موڑ گھوم کر اس طرف آ گیا۔ اور اُسی باڑ کے سامنے رُک کر اطراف میں دیکھنے لگا۔ اُسے شاید اُن دونوں کے اس طرح غائب ہو جانے پر حیرت ہو رہی تھی۔

اپنے عقب میں جھاڑیوں کی سرسراہٹ سن کر وہ شخص تیزی سے پیچھے مُڑا۔ لیکن اُسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ طارق اور دل شیر نے باڑ کی آڑ سے نکل کر بیک وقت اُس پر چھلانگ لگائی۔

طارق نے ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرا بغل میں ڈال دیا۔ جبکہ دل شیر نے اُسے ٹانگوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور وہ تیزی سے دوبارہ باڑ کے پیچھے چلے گئے۔

''اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں۔ لیکن اگر گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو گردن مروڑ دُوں گا۔'' طارق نے اُس شخص پر جھک کر سرگوشی کی۔ اُس شخص نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے پر خوف کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔

''تم کون ہو..... اور ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' طارق نے پوچھا۔

''مم..... میں نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو؟ لیکن.....''

''اگر ہمیں جانتے نہیں تو ہمارا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟'' طارق کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

''میرا نام گلاب دین ہے۔ لوگ عام طور پر مجھے گلو کے نام سے پکارتے ہیں۔''

''یہ تو ہو گیا تمہارا تعارف..... لیکن تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' طارق بولا۔

''تت..... تم لوگ کون ہو؟ میرا مطلب ہے، مسلمان یا.....''

''الحمدللہ، ہم مسلمان ہیں۔'' دل شیر بولا۔

''خدایا! تیرا شکر ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔'' گلو بولا۔

''اسی طرح وقت ضائع کرتے رہو گے یا کوئی مطلب کی بات بھی بتاؤ گے؟'' طارق بولا۔

''مم..... میں بتاتا ہوں۔ لیکن.....'' گلو ہکلایا۔

''لیکن کیا؟ جلدی بولو!'' طارق غرایا۔

''یہ جگہ، باتوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی نے ہمیں یہاں چھپے ہوئے دیکھ لیا تو شک کرے گا۔ ہم کسی اور جگہ بیٹھ کر یا سڑک پر چلتے ہوئے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔''

''تاکہ تمہارے ساتھی آسانی سے ہمیں گھیر لیں۔'' دل شیر نے اُسے گھورا۔

''میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اگر..... اگر تم لوگ کشمیری ہو تو مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ یقین کرو! میں نے کسی غلط نیت سے تمہارا تعاقب نہیں کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے.....'' طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہم، تم پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی دھوکہ ہوا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔ مگر اس سے پہلے ہم تمہارے بارے میں اپنی تسلی کر لینا چاہتے ہیں کہ تم واقعی گلاب دین ہو یا گلاب سنگھ؟''

''کک..... کیا مطلب؟'' گلو کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

طارق نے دل شیر کو اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ گلو کچھ سمجھ سکتا، دل شیر نے گلو کو جکڑ لیا
طارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کی پتلون اُتار دی..... گلو مچل رہا تھا
اُن دونوں نے اُسے اُس وقت تک نہیں چھوڑا، جب تک اپنی تسلی نہ کر لی۔ وہ واقعی مسلمان تھ

''ٹھیک ہے.....!'' طارق نے اُسے چھوڑ دیا۔ ''ہمارے ساتھ چلتے رہو۔ ہم راستے
باتیں کریں گے۔ لیکن ایک بار پھر یہ بات سوچ لو! کہ اگر بھاگنے یا کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش
تو ہمارے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے۔''

گلاب دین اُٹھ گیا۔ اُس نے اپنی پتلون درست کی اور اُن کے ساتھ باڑ کے پیچھے سے
آیا۔ اُسی وقت ساتھ والے بنگلے سے ایک کار نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اُس میں اگلی سیٹ پر ڈرا
کے ساتھ ایک آدمی اور پچھلی سیٹ پر دو حسین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے اُن تینوں
طرف دیکھا، لیکن زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ لوگ اُس گلی سے نکل کر دوبارہ کوٹلہ روڈ پر آ گئے
ٹہلنے والے انداز میں چلنے گلے۔ گلاب دین، درمیان میں تھا۔ طارق اُس کے دائیں طرف
دل شیر بائیں طرف تھا۔

''ہاں..... اب بتاؤ! تم کون ہو؟ اور ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' طارق نے کہا۔

''میرا تعلق ایک ایسے مسلمان گھرانے سے ہے، جو برسوں پہلے سیالکوٹ سے یہاں آ
آباد ہوا تھا۔ میں یہیں پر پیدا ہوا اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ چند سال پہلے میرا باپ علی گڑھ
نسلی فسادات میں مارا گیا۔ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی گئی ہے۔
سے زندگی کا حق چھین لیا گیا ہے۔ اُن کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جا رہا ہے۔

''ان حقائق سے تو پوری دنیا واقف ہے۔ تم مطلب کی بات کرو!'' دل شیر نے اُسے ٹوک
دیا۔

''میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا جس کا مالک ہندو تھا۔'' گلاب دین نے کہنا شر
کیا۔ ''یہ ایک تجارتی کمپنی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے اچانک ہی یہاں غیر ملکیوں کی آمد و رف
شروع ہو گئی۔ تقریباً دو مہینے پہلے مجھے اور کمپنی کے دو اور مسلمان ملازمین کو کوئی وجہ بتائے
نوکری سے نکال دیا گیا۔ کمپنی کا ایک ہندو ملازم پرکاش میرا بچپن کا دوست ہے۔ مجھے ملازم
اُسی نے رکھوایا تھا۔ وہ اب بھی اکثر مجھ سے ملتا رہتا ہے۔ چند روز پہلے اُس نے بتایا کہ اُ
کمپنی کے دو دیگر افراد کو جن میں کملا نامی ایک لڑکی بھی شامل ہے، ایک غیر ملکی سفارت خا
دیا گیا ہے۔ اب وہ لوگ وہیں کام کرتے ہیں۔''

''اوہ.....! لیکن ہمارا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' گلاب دین نے کہا۔ ''پرکاش اور اُس کے ساتھیوں کو اسرائیلی سفارتخانے بھیجا گیا ہے۔ وہ ملازم بظاہر کمپنی کے ہیں، لیکن کام اسرائیلی سفارتخانے میں کرتے ہیں۔ پرکاش مجھے دوست سمجھ کر بعض اوقات ایسی باتیں بھی بتا دیتا ہے، جو اُسے نہیں بتانی چاہئیں۔''

''مثلاً..... کیسی باتیں؟'' طارق نے پوچھا۔

''کئی روز پہلے اُس نے بتایا تھا کہ کمپنی، ہندو نوجوانوں کو ایک خاص قسم کی ٹریننگ کے لئے اسرائیل بھیج رہی ہے۔ ان ہندو نوجوانوں کا انتخاب اسرائیلی سفارتخانے کے افسران کرتے ہیں اور اُنہیں بھیجتی کمپنی ہے۔ تاکہ شبہ نہ ہو۔''

''کس قسم کی ٹریننگ.....؟'' اس مرتبہ دل شیر نے پوچھا۔

''تمہارے دوست پرکاش کو کیسے پتہ چلا کہ ان ہندو نوجوانوں کو ٹریننگ کے لئے بھیجا جا رہا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''پرکاش پہلے تو یہی سمجھا تھا کہ ان ہندو نوجوانوں کو ملازمت کے لئے باہر بھیجا جا رہا ہے۔ اُس نے کمپنی کے ڈائریکٹر سے اپنے لئے بات کی، تب ڈائریکٹر نے اُسے بتایا کہ اُن نوجوانوں کو اسرائیل بھیجنے کا اصل مقصد کیا ہے۔ کمپنی کا ڈائریکٹر، پرکاش کا دُور کا رشتے دار بھی ہے اس لئے اُس نے پرکاش کو سمجھا بجھا کر اُسے منع کر دیا۔''

''اوہ.....!'' طارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''لیکن پرکاش تمہیں یہ سب کچھ کیوں بتا دیتا ہے؟''

''وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ اور دوست سمجھ کر ہی ایسی باتیں بتا دیتا ہے۔ ابھی تین دن پہلے اُس نے ایک ایسی بات بتائی تھی جسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس روز سے میں کشمیری چائے خانے کے آس پاس منڈلانے لگا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ اس چائے خانے کے مالک کا اُن کشمیری مجاہدین سے گہرا تعلق ہے، جو دہلی میں خفیہ طور پر کام کر رہے ہیں۔ مجھے کشمیری مجاہدین کی تلاش تھی۔ آج جب تم لوگ مجھے نظر آئے تو مجھے شبہ ہوا کہ تمہارا تعلق مجاہدین کی اُس تنظیم سے ہو گا۔''

''لیکن کشمیری مجاہدین کا اسرائیلی سفارتخانے سے کیا تعلق؟'' طارق نے پوچھا۔

''تین دن پہلے پرکاش نے بتایا تھا کہ جن ہندو نوجوانوں کو تخریب کاری، دہشت گردی اور چھاپہ مار جنگ کی تربیت دی جا رہی ہے، اُنہیں کشمیر بھیجا جائے گا۔ اُنہوں نے دہلی میں بھی ایک ایسا ہی تربیتی کیمپ قائم کیا ہے جہاں عنقریب ٹریننگ شروع ہونے والی ہے۔ جن نوجوانوں کو

ٹریننگ دی جائے گی، اُن کا انتخاب کرلیا گیا ہے۔ ٹریننگ دینے کے لئے اسرائیلی ماہرین بھی چند روز میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''اوہ.....'' طارق بری طرح چونک گیا۔ اُس نے دل شیر کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ عجیب سے تھے۔

''اگر ہم تمہیں یہ بتائیں کہ ہم مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں اور ہمارا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔ اور ہم بھی کشمیری مجاہدین کی تلاش میں ہی چائے خانے تک گئے تھے تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا؟'' اس مرتبہ دل شیر نے پوچھا۔

''میں اسے ایک مذاق ہی سمجھوں گا۔'' گلاب دین نے جواب دیا۔ ''تم لوگوں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہی نہیں، یقین ہو چکا ہے کہ تمہارا تعلق کشمیر سے ہے۔ اور اگر تمہارا تعلق انٹیلی جنس سے بھی ہے تو کیا کرلو گے؟ زیادہ سے زیادہ مجھے جان سے مار دو گے۔ لیکن مجھے کسی مقصد کے لئے جان دیتے ہوئے خوشی ہوگی۔''

طارق نے دل شیر کی طرف دیکھا۔ اُس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ لوگ اسی طرح ٹہلتے ہوئے کناٹ پلیس کی طرف نکل آئے تھے۔

''کیا تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو.....؟'' دل شیر نے کہا۔

''کہاں.....؟'' گلاب دین نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہم، تمہیں اپنے ایک دوست سے ملوانا چاہتے ہیں۔ اگر تم اپنی زبانی اُسے یہ سب کچھ بتاؤ گے تو ہوسکتا ہے، تمہیں کچھ انعام بھی مل جائے۔''

''میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔'' گلاب دین نے کہا۔ ''لیکن مجھے کسی انعام کا لالچ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میں اس لئے کر رہا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق بھی کشمیر سے ہے جو پہلے سیالکوٹ آ کر آباد ہوئے، پھر دہلی چلے آئے۔ اگر میری زندگی میرے آبائی وطن کے کام آسکے تو میرے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی؟''

''گڈ..... میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ ہم، تمہارا پورا پورا خیال رکھیں گے۔'' دل شیر نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے اور کناٹ پلیس کی عمومی رونق ختم ہو رہی تھی۔ ریسٹورنٹ وغیرہ کھلے تھے۔

''تم لوگ سامنے والے ریسٹورنٹ میں بیٹھو۔ میں چند منٹ میں آتا ہوں۔'' دل شیر کہتا ہوا، ایک طرف نکل گیا۔

طارق، گلاب دین کے ساتھ ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گیا۔ اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ

دل شیر کہاں گیا ہوگا؟ ڈلہوزی ہاؤس وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ وہ لوگ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل چل کر آئے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک وہ بری طرح تھکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن گلاب دین کی باتیں سن کر اُس کی ساری تھکن دُور ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنے رگ و پے میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

طارق نے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہی چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔ اور اب گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ گلاب دین کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کشمیر میں مجاہدین کے ہاتھوں بھارتی فوجیوں کی بری طرح پٹائی ہو رہی تھی۔ اور اب بھارتی حکمرانوں نے یہودیوں سے گٹھ جوڑ کرلیا تھا۔ تاکہ اُن سے چھاپہ مار ٹریننگ حاصل کر کے وادی میں زیادہ سے زیادہ تباہی مچا سکیں۔

تقریباً بیس منٹ بعد ایک کار، ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رُکی۔ سٹیئرنگ کے سامنے دل شیر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کار میں بیٹھے ہی بیٹھے طارق کو اشارہ کیا، جو گلاب دین کے ساتھ دروازے کے ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ طارق نے اُٹھ کر کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور گلاب دین کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکل کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دل شیر نے گاڑی فوراً ہی آگے بڑھا دی۔

''طارق.....!'' پارلیمنٹ سٹریٹ پر آتے ہی دل شیر نے کہا۔ ''گلاب وین کا مفلر لے کر اس کی آنکھوں پر باندھ دو۔''

''کک..... کیوں.....؟'' گلاب دین ہکلایا۔

''ہم نے تمہاری باتوں پر یقین کرلیا ہے گلاب دین! لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' گلاب دین نے کہا اور گلے میں پڑا ہوا مفلر اُتار کر طارق کی طرف بڑھا دیا۔ طارق نے مفلر اُس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

پارلیمنٹ سٹریٹ سنسان پڑی تھی۔ کبھی کبھار کوئی اِکا دُکا گاڑی نظر آ جاتی تھی۔ گاڑی کچھ دیر سیدھی سڑک پر دوڑتی رہی اور بالآخر مولانا آزاد روڈ پر مُڑ گئی۔ کناٹ پلیس سے مولانا آزاد روڈ تک کئی سڑکیں، دائیں بائیں مُڑتی تھیں۔ گلاب دین اگر اس علاقے سے واقف تھا بھی تو اُسے کوئی اندازہ نہیں رہا ہوگا کہ گاڑی کس سڑک پر مُڑی تھی؟ گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی بالآخر شاہ رُخ کے بنگلے میں داخل ہو کر رُک گئی۔ طارق، گلاب دین کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُتر آیا۔ اُس کی آنکھوں سے پٹی اس وقت تک نہیں کھولی گئی تھی، جب تک وہ ایک کمرے میں نہ پہنچ گئے۔ شاہ رُخ پہلے ہی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تمام کھڑکیوں پر دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے۔ پٹی کھلنے کے بعد کچھ دیر تک گلاب دین، آنکھیں ملتا رہا، پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

''یہ ہمارا دوست شاہ رُخ ہے۔'' دل شیر نے کہا۔ ''تم نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے، وہ ذرا تفصیل سے انہیں بھی بتا دو۔ ممکن ہے، یہ اس بات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔''

گلاب دین نے ایک مرتبہ پھر وہ تمام باتیں دُہرا دیں، جو اُنہیں بتا چکا تھا۔

''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ درست ہے۔ اور یہ کشمیریوں کے خلاف کوئی چال نہیں ہے؟'' شاہ رُخ نے اُس کی بات سننے کے بعد کہا۔

''آپ میرے بارے میں جس طرح چاہیں، تصدیق کر سکتے ہیں۔'' گلاب دین نے کہا۔

''تم رہتے کہاں ہو.....؟'' شاہ رُخ نے پوچھا۔

''آریہ سماج روڈ پر..... میرے ساتھ، میری ماں رہتی ہے۔'' گلاب دین نے کہا۔

''گھر کا پتہ بتاؤ.....!'' شاہ رُخ نے کہا اور گلاب دین نے بتا دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' شاہ رُخ نے کہا۔ تم اس وقت تک یہیں رہو گے، جب تک تمہارے بارے میں تصدیق نہیں ہو جاتی۔''

''لیکن میری ماں..... وہ پریشان ہو گی۔'' گلاب دین پریشان ہو کر بولا۔

''کچھ دیر بعد تمہاری ماں کو یہ پیغام پہنچ جائے گا کہ تم ایک دو روز کے لئے اچانک شہر سے باہر چلے گئے ہو۔ تمہارا دوست پرکاش کہاں ملتا ہے؟''

''وہ تقریباً روزانہ ہی شام کو میرے گھر آتا ہے۔ کبھی میں اُس کے گھر چلا جاتا ہوں۔ اُس کا گھر بھی میرے گھر سے زیادہ دُور نہیں ہے۔'' گلاب نے بتایا۔

''ٹھیک ہے.....!'' شاہ رُخ نے کہا۔ اور پھر طارق کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''گلاب دین آج رات تمہارے کمرے میں رہے گا۔ اب تم دونوں اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں دل شیر سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

طارق اور گلاب دین اُس کمرے سے نکل آئے۔ اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد دل شیر بھی شاہ رُخ کے کمرے سے نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

☆

دل شیر کو آریہ سماج روڈ پر گلاب دین کا مکان تلاش کرنے میں خاصی دُشواری پیش آئی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ رات گیارہ بجے سے اُوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ سردی کی وجہ سے سڑک تقریباً سنسان تھی۔ ایک پان والے کی دُکان سے متعلقہ گلی کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ تقریباً نصف میل آگے نکل آیا تھا۔ بہرحال! اس گلی میں پہنچ کر وہ ایک بار پھر اُلجھ گیا۔ یہ گلی بالکل سنسان تھی۔ بعض مکانوں کے سامنے کم واٹ کے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی اونگھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دل شیر کی گاڑی کی رفتار بہت ہلکی تھی۔ اور وہ گلی میں دائیں بائیں مکانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گلی میں کوئی ذی رُوح نظر نہیں آ رہا تھا جس سے کچھ پوچھ لیا جاتا۔

اچانک ایک دروازہ کھلا دیکھ کر دل شیر نے گاڑی روک لیا اور نیچے اُتر آیا۔ وہ کریانے کی ایک چھوٹی سی دُکان تھی جو مکان کی بیٹھک ہی میں بنائی گئی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی، میلی سی چادر اوڑھے بیٹھا تھا اور حقہ پی رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ اُس کی کھوپڑی پر ایک لمبی سی چٹیا نظر آ رہی تھی۔

''ایک پتہ پوچھنا ہے شریمان جی! شاید آپ میری کچھ مدد کر سکیں۔'' دل شیر نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کہاں کا پتہ ہے..... کس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''اسی گلی کا پتہ ہے۔'' دل شیر نے کہا اور مکان نمبر بتاتے ہوئے بولا۔ ''گلاب دین نام ہے۔ عام طور پر اُسے گلو کہا جاتا ہے۔''

''ارے..... گلو کا پوچھ رہے ہو؟'' بوڑھا بولا۔ ''دائیں طرف کا تیسرا مکان ہے۔ وہ اُوپر والی منزل پر رہتا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ گھر پر نہیں ہے۔ اُس کی ماں دو مرتبہ آ کر پوچھ چکی ہے۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ہو گا۔ اندر داخل ہو کر زینے پر چلے جانا۔''

''شکریہ شریمان جی!'' دل شیر دُکان سے باہر آ گیا۔ دائیں طرف کا تیسرا دو منزلہ مکان بہت خستہ نظر آ رہا تھا۔ آگے کو نکلی ہوئی بالکونی کے اُوپر لکڑی کے نقش و نگار والی بالکونی سی بنی ہوئی تھی۔ بالکونی میں تاریکی تھی۔ لیکن دل شیر کو احساس ہوا جیسے وہاں کوئی موجود ہو۔ وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی تھی۔

دل شیر نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک بڑھیا سامنے آ گئی۔ اُس کے چہرے پر افسردگی سی تھی۔

''کیا تم گلاب دین کی ماں ہو.....؟'' دل شیر نے کہا۔

''ہاں..... میں گلابو کی ماں ہوں۔ کہاں ہے وہ؟ خیریت سے تو ہے نا.....؟'' عورت نے کہا۔ اُس کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔ ''جب سے نوکری چھوٹی ہے، مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ رات کو دیر سے گھر آنے لگا ہے۔ اور میں اُس کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہوں۔ مگر وہ ہے کہاں؟ خیریت تو ہے نا.....؟''

''ہاں..... وہ بالکل خیریت سے ہے۔ اور اُسے نوکری مل گئی ہے۔'' دل شیر نے جواب دیا۔

''اُسے نوکری مل گئی ہے.....؟ خدایا! تیرا شکر ہے۔ مگر وہ خود کہاں ہے؟'' عورت نے پوچھا۔

''دراصل اُسے نوکری ہی کے سلسلے میں فوری طور پر شہر سے باہر جانا پڑا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں اطلاع کر دُوں۔ مگر مجھے بھی فیکٹری سے نکلتے ہوئے دیر ہو گئی۔

''اُسے فیکٹری میں نوکری ملی ہے؟''

''ہاں..... کمپنی کا کچھ سامان امرتسر بھیجنا تھا۔ لیکن جس شخص کو ساتھ جانا تھا، وہ نہیں آیا۔ اس لئے مالک نے گلاب دین کو بھیج دیا۔ دو تین دن لگیں گے اُسے۔ اُس نے تمہارے لئے یہ روپے دیئے تھے۔ فیکٹری کے مالک سے کچھ رقم اُسے ایڈوانس مل گئی تھی۔'' دل شیر نے کہتے ہوئے جیب سے دو سو روپے نکال کر بڑھیا کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''بیٹھ بیٹا! میں تیرے لئے چائے بناتی ہوں۔ سردی ہو رہی ہے۔ تجھے بڑی تکلیف ہوئی ہو گی یہاں تک آتے ہوئے۔'' بڑھیا کہتی ہوئی اندرونی دروازے میں چلی گئی۔

دل شیر، چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بڑھیا چائے بنا کر لے آئی۔ دل شیر، چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بڑھیا سے گلاب دین کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ گلاب دین نے اُنہیں جو بھی بتایا تھا، بڑھیا کی باتوں سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ یہ خاندان تقسیم ہند سے بھی برسوں پہلے سیالکوٹ سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ اور اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق دراصل کشمیر سے تھا۔

''گلاب دین کے دوست کا کیا حال ہے؟ کیا نام بتایا تھا اُس نے.....'' دل شیر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''ارے، وہ پرکاش!'' بڑھیا بولی۔ ''وہ بھی شام سے دو مرتبہ آ چکا ہے۔ بہت یاری ہے

دونوں میں۔ پرکاش اُس کے لئے بہت پریشان رہتا ہے۔ اُسے جب گلابو کی نوکری کا پتہ چلے گا تو بہت خوش ہو گا۔''

''کہاں رہتا ہے پرکاش؟'' دل شیر نے پوچھا۔

''اسی گلی میں..... رائے صاحب کا بیٹا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ گلو کے باپ کے مرنے کے بعد اگر رائے صاحب ہمیں سہارا نہ دیتے تو نجانے ہمارا کیا ہوتا؟''

''اس دنیا میں ابھی اچھے لوگ موجود ہیں۔'' دل شیر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! اب میں چلتا ہوں۔ اگر گلاب دین کو واپسی میں دو تین دن لگ جائیں تو آپ پریشان نہ ہوں۔''

دل شیر مکان سے باہر آ گیا۔ اپنی گاڑی میں واپس جاتے ہوئے وہ گلاب دین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس نے اب تک جو کچھ بھی کہا تھا، اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔

☆

یہ اس سنے تیسرے دن کی بات ہے۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ ایک مکان کے تھڑے پر چار پانچ بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں چوسر کی بازی چل رہی تھی۔ کچھ نوجوان لڑکے اُن کے پاس کھڑے دلچسپی سے اُن کا کھیل دیکھ رہے تھے۔

گلی کے موڑ پر ایک رکشہ رُکا اور ایک خوبصورت لڑکی نیچے اُتری۔ اُس نے رکشے والے کو پیسے دیئے اور فر کا ہینڈ بیگ سنبھالے گلی میں داخل ہوئی۔ لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال رہی ہو گی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اُس نے نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ لمبے قد اور گوری چٹی رنگت پر یہ نیلی ساڑھی خوب جچ رہی تھی۔ لڑکی کے پیروں میں ہائی ہیل کے سینڈل تھے۔ گلی کے اینٹوں کے فرش پر اُس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ کی آواز دُور تک سنائی دے رہی تھی۔ جب وہ تھڑے کے قریب سے گزری تو چوسر کی بازی دیکھنے والے نوجوان مُڑ مُڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ لڑکی ایک لمحے کو اُس دُکان کے سامنے رُکی جو مکان کی بیٹھک میں بنی ہوئی تھی۔ دُکان پر اس وقت دو عورتیں اور تین چار بچے کھڑے تھے۔ وہ لڑکی پھر آگے بڑھ گئی اور تیسرے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی۔ یہ گلاب دین والا مکان تھا۔

گلاب دین کی بوڑھی ماں اس وقت دروازے کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھی ایک تھال میں چاول چن رہی تھی۔ اس جوان اور خوبصورت لڑکی کو اندر آتے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

''یہ گلاب دین کا مکان ہے نا.....؟'' لڑکی نے بڑھیا کو سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

''ہاں بیٹی! تم کون ہو؟ آؤ..... بیٹھو۔'' بڑھیا نے پیڑھی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''میں فیکٹری یں مالک کی سیکرٹری ہوں۔ آج امرتسر سے گلاب دین کا فون آیا تھا۔ میں اُس کا پیغام دینے آئی ہوں۔ اُسے آپ کی بہت فکر ہے۔'' لڑکی نے قریب ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اُسے میری فکر نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی؟ بہت خیال رکھتا ہے میرا۔ کیا پیغام دیا ہے اُس نے..... کب واپس آئے گا؟'' بڑھیا نے کہا۔

''شاید پرسوں آجائے۔ کہہ رہا تھا، اماں کو بتا دینا۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی پیغام آپ تک پہنچا دُوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''بہت اچھا کیا بیٹی! تم فیکٹری میں کیا کام کرتی ہو؟''

''میں مالک کی سیکرٹری ہوں۔ گلاب دین کا ٹیلی فون میں نے ہی سنا تھا۔'' لڑکی نے کہا۔

''لائیے! میں چاول چن دُوں۔'' اُس نے بڑھیا کے ہاتھ سے تھال لے لیا۔

''تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا بیٹی.....؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''میرا نام حنا ہے ماں جی!'' لڑکی نے بتایا۔

حنا، بڑھیا کے گھر کام کرتی رہی۔ تقریباً سات بجے کے قریب ایک نوجوان اندر آیا۔ اُس کی عمر پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کالی پینٹ اور سفید شرٹ پر اُس نے وی گلے والی جرسی پہن رکھی تھی۔ وہ خاصا خوبرو اور سمارٹ تھا۔ بڑھیا کو جس طرح بے تکلفی سے اُس نے ماں جی کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یا تو بڑھیا کا قریبی رشتے دار ہے یا کوئی بے تکلف پڑوسی۔

وہ پرکاش تھا۔ گلاب دین کا دوست..... وہ بات تو بڑھیا سے کر رہا تھا۔ لیکن اُس کی نظریں بار بار حنا کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ بڑھیا نے جب بتایا کہ حنا اُسی فیکٹری میں کام کرتی ہے، جہاں گلابو کو نوکری ملی ہے تو وہ حنا سے باتیں کرنے لگا۔

مختصر سی گفتگو کے بعد ہی اُن میں اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ پرکاش سے باتیں کرتے ہوئے حنا، بار بار اُس کی طرف جھک جاتی۔ ایسا کرتے ہوئے ساڑھی اُس کے سینے پر سے ڈھلک جاتی اور پرکاش کی نظریں بہکنے لگتیں.....

''حنا بیٹی! کھانا تیار ہو گیا ہے۔ کہو تو نکال لاؤں؟'' بڑھیا نے باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماں جی! کھانا تو میں گھر جا کر ہی کھاؤں گی۔ اور اب میں چلوں گی۔ میری ماں جی

بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔'' حنا نے جواب دیا۔

''اگر میں تمہیں کھانے کی دعوت دُوں تو اسی طرح ٹال دو گی؟'' پرکاش نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''آزما کر دیکھ لو۔'' حنا مسکرائی۔

''تو پھر چلیں.....؟'' پرکاش بولا۔

''میں تیار ہوں۔'' حنا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''تم بڑی سڑک کے موڑ پر پہنچ کر میرا انتظار کرو۔ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔''

''میرے ساتھ چلتے ہوئے ڈرتے ہو.....؟''

''یہ بات نہیں ہے.....'' پرکاش بولا۔ ''گلی محلے کا معاملہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کے لوگوں کو میرے بارے میں باتیں بنانے کا موقع ملے۔ تم چلو! میں بھی آ رہا ہوں۔''

حنا، بڑھیا سے رُخصت ہو کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ مکان سے باہر نکلی تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ بچے، گلی سے غائب ہو چکے تھے۔ البتہ تھڑے پر بوڑھوں کی چوسر کی بازی اب بھی چل رہی تھی۔ وہ سٹریٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں ہی اپنی بازی جاری رکھے ہوئے تھے۔ حنا، گلی سے نکل کر آریہ سماج روڈ کے موڑ پر پہنچ کر رُک گئی۔ سڑک پر گزرنے والے اس طرح اُس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے نظروں ہی نظروں میں اُسے کھا جائیں گے۔ ایک کار والے نے اُسے لفٹ کی پیش کش بھی کی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد پرکاش پہنچ گیا۔ وہ حنا کے ساتھ کچھ دُور تک پیدل چلتا رہا، پھر ایک ٹیکسی روک لی۔

''کہاں چلیں.....؟'' اُس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے حنا سے پوچھا۔

''کناٹ پیلس۔'' حنا نے جواب دیا۔ پرکاش نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو کناٹ پیلس چلنے کو کہا۔

ٹیکسی، کناٹ پیلس پر ڈلہوزی ہاؤس کے سامنے رُکی۔ وہ دونوں نیچے اُترے۔ جب وہ ڈلہوزی ہاؤس کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے تو حنا نے پرکاش کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اور پھر کرسٹل رُوم میں داخل ہونے کے بعد تو وہ پرکاش کے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔ اُس کے لمس سے پرکاش کے دل و دماغ میں سنسنی کی لہریں سی کوند رہی تھیں۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کوئی عورت اُس کے اتنے قریب آئی تھی۔ اُن کی ملاقات کو ابھی دو تین گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور اُن کے درمیان فاصلے بڑی تیزی سے گھٹ رہے تھے۔

ڈلہوزی ہاؤس کے کرسٹل رُوم میں نیم عریاں لباس والی ایک خوبصورت ویٹریس نے

دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اُنہیں خوش آمدید کہا۔ حنا متجس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ڈلہوزی ہاؤس جیسی جگہوں پر تل رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ کرائم ہاؤس کی کسی میز پر کوئی بھی سیٹ خالی نہیں تھی۔

''بڑی مایوسی ہوئی ہے یہاں آ کر۔'' پرکاش کے لہجے میں واقعی مایوسی تھی۔ ''یہاں تو بیٹھنے تک کو جگہ نہیں ہے۔ ہالیڈے اِن نہ چلیں؟ چند قدم کے فاصلے پر تو ہے۔''

''میرا خیال ہے، یہ خوبصورت ویٹریس ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔'' حنا نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ یہ بھی کسی کو چاہتی ہو گی۔ اسے معلوم ہوگا کہ کسی ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے۔''

''کیوں نہیں لیڈی......؟'' ویٹریس بھی مسکرا دی۔ ''ایک ایگزیکٹو رُوم خالی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو......''

''اوہ...... کیوں نہیں؟'' حنا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھا اور پرکاش نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرکاش کو دراصل کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی جہاں وہ حنا کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ سکے اور کوئی مداخلت کرنے والا نہ ہو۔ وہ ہر قیمت پر حنا کے حسن و شباب سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا، حنا جیسی خوبصورت لڑکی اتفاق سے اُسے مل گئی تھی اور بڑی آسانی سے اُس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی تھی۔

ویٹریس اُنہیں بار کاؤنٹر کے ساتھ والے راہداری نما راستے میں لے گئی۔ اس راہداری میں چلتے ہوئے بالآخر وہ چند سیڑھیاں اُتر کر ایک کشادہ کمرے میں پہنچ گئے۔ دبیز قالین، خوبصورت، آرام دہ صوفے بچھے ہوئے تھے۔ درمیان میں شیشے کے ٹاپ والی ایک کافی ٹیبل تھی جس پر گلدان رکھا ہوا تھا۔

صوفے کے بالکل سامنے والی تصویر نیم عریاں لباس میں ایک ایسی لڑکی کی تھی جو پوری طرح منہ کھولے ہنس رہی تھی۔ اُس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک گدھا کھڑا تھا اور لڑکی اُس گدھے کو دیکھ کر ہی ہنس رہی تھی۔ تصویر ایک پارک میں کھینچی گئی تھی اور وہاں اس لڑکی اور گدھے کے سوا اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیواروں پر لگی ہوئی یہ تصویریں دیکھ کر پرکاش دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ حنا کے ساتھ وہ اسی قسم کا ماحول چاہتا تھا۔

''آپ آرڈر نوٹ کرا دیجئے سر!'' ویٹریس نے شیشے کی ٹاپ والی کافی ٹیبل پر گلدان کے نیچے قریب پلاسٹک کور والے مینو کی طرف اشارہ کیا۔

''مینو کو کیا کرنا ہے...... شیمپین کی بوتل اور روسٹڈ چکن دے جاؤ۔ اس کے علاوہ ہمیں اور کچھ نہیں چاہئے۔'' پرکاش نے کہا۔

''یس سر......!'' ویٹریس کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اُس نے جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اُس کے آرڈر کی تعمیل کر دی گئی۔ ویٹریس نے مطلوبہ چیزیں ٹیبل پر سجائیں اور مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔ پرکاش نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور صوفے پر حنا کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے بوتل کھول کر دونوں گلاسوں میں شراب اُنڈیلی اور ایک گلاس حنا کی طرف بڑھا دیا۔

''مم...... میں...... میں تو شراب نہیں پیتی۔'' حنا، بوکھلا سی گئی۔

''آج تو تمہیں پینی پڑے گی میری خاطر۔'' پرکاش نے ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ حنا کی ساڑھی کا پلو ڈھلک گیا۔

''پہلے تم پیو!'' حنا نے کہتے ہوئے شراب کا گلاس اُٹھا لیا۔ ''میرے ہاتھ سے۔'' اُس نے گلاس، پرکاش کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پرکاش اُس کی قربت میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ غٹا غٹ شراب پینے لگا۔ حنا نے گلاس اس وقت تک اُس کے ہونٹوں سے نہیں ہٹایا جب تک خالی نہ ہو گیا۔ حنا نے دوسرا گلاس اُٹھا لیا۔

''یہ بھی پی لو میری خاطر...... اور یہ بھی میرے ہاتھ سے۔'' حنا مسکرائی۔

''تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی سکتا ہوں۔'' پرکاش نے دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا۔

وہ عادی شراب نوش نہیں تھا۔ دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر کبھی کبھار پی لیا کرتا تھا، وہ بھی صرف دو گھونٹ۔ لیکن اس وقت شیمپین کے دو گلاس حلق میں اُنڈیلنے کے بعد اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رگ و پے میں آگ سی بھر گئی ہو۔ اُس کا دماغ جھنجھنا اُٹھا تھا۔ حنا نے گلاس میں مزید شراب اُنڈیل لی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گلاس اُٹھاتی، پرکاش نے اُسے دبوچ لیا۔

پرکاش اُس کے کپڑے نوچنے کی کوشش کر رہا تھا اور حنا اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ابھی نہیں......'' حنا نے اُسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''اتنی بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔ میں، تمہارے پاس ہوں۔ اور ابھی ساری رات پڑی ہے۔''

''تمہیں دیکھ کر کس کافر سے صبر ہوتا ہے......؟'' پرکاش نے یہ کہتے ہوئے اُسے اپنی طرف

''لو...... یہ ایک گلاس اور پی لو میرے ہاتھ سے۔'' حنا نے گلاس اُٹھا لیا۔ پرکاش اس مرتبہ

بھی انکار نہ کر سکا اور غٹا غٹ پورا گلاس حلق میں اُنڈیل گیا۔ اب شراب اُس کے دماغ
انداز ہونے لگی تھی۔ اُس نے حنا کے ہاتھ سے گلاس لے کر دُور پھینک دیا اور اُسے اپ
طرف کھینچنے لگا۔ اس کھینچا تانی میں اُسے اس بات کا ہوش نہ رہا تھا کہ حنا کے علاوہ کس
طرف توجہ دے سکتا۔ اُس کے ہوش و حواس تو شراب و شباب نے سلب کر لئے تھے۔
حقیقت سے بے خبر تھا کہ سامنے والی دیوار پر آویزاں تصویر میں جو نیم عریاں لڑکی قریب
ہوئے گدھے کو دیکھ کر پوری طرح منہ کھولے ہنس رہی تھی، اُس کے کھلے ہوئے منہ کی
چھوٹا سا سوراخ پیدا ہو گیا تھا اور اُس سوراخ میں سے ایک مووی کیمرے کا لینس جھا
تھا۔

حنا نے اس مرتبہ گلاس کا تکلف نہیں کیا۔ اُس نے بوتل اُٹھالی۔ ''لو...... تھوڑی
لو...... چند گھونٹ...... میری خاطر! اس طرح کیا خاک مزہ آئے گا؟ میں بھاگ تو نہیں
لو...... پیو!''

شراب کی بوتل، پرکاش کے ہونٹوں سے لگ گئی۔ سیال آگ کے چند اور گھونٹ
رگوں میں لاوا سا بھرتے چلے گئے۔ اب شراب پوری طرح اُس کے دماغ پر اثر انداز
تھی۔ حواس بالکل ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

''سنا ہے تم آج کل اسرائیلی سفارتخانے میں کام کر رہے ہو......؟'' حنا نے کہا۔

''ہاں...... وہ یہودی بہت دولت مند ہیں۔ کمپنی سے تین گنا زیادہ تنخواہ دے رہے
کمپنی سے بھی تنخواہ ملتی ہے۔ عیش ہو رہے ہیں۔'' پرکاش نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں
دیا۔

''تم اُس کے لئے کیا کام کرتے ہو جو وہ اتنی تنخواہ دیتے ہیں......؟'' حنا بولی۔

''کام......'' پرکاش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''وہ ہمارے ہندو لڑکوں کو دہشت گردی
مار جنگ کی ٹریننگ کے لئے اسرائیل بھیج رہے ہیں۔ دہلی میں بھی اُنہوں نے اس قسم
دینے کا ایک کیمپ قائم کیا ہے۔ ٹریننگ دینے والے اسرائیلی ماہرین پرسوں رات کو
دہلی پہنچ رہے ہیں۔''

''دہلی میں یہ کیمپ کہاں قائم کیا گیا ہے......؟'' حنا نے پوچھا۔

''تم...... تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہو......؟'' پرکاش نے لڑکھڑاتی ہوئی
پوچھا۔

''میں بھی چھاپہ مار جنگ کی ٹریننگ لینا چاہتی ہوں۔'' حنا نے جواب دیا۔

''اوہ...... اچھا! تمہیں، میں ٹریننگ دُوں گا۔ آؤ...... دُور کیوں ہٹ رہی ہو؟ تمہارا یہ شریر
خوبصورت ہے......''

''دہلی میں ٹریننگ کیمپ کس جگہ قائم کیا گیا ہے......؟'' حنا نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

''جم...... جمنا کے کنارے......'' پرکاش بولا۔ ''لیکن لعنت بھیجو کیمپ پر۔ تم میرے
آؤ...... نا......''

''اسرائیلی ماہرین پرسوں رات کس فلائٹ سے آ رہے ہیں؟'' حنا نے پوچھا۔

''م...... میں نہیں جانتا۔ تم...... تم...... دُور کیوں......''

''لو...... تھوڑی سی اور پیو!'' حنا نے بوتل اُٹھا کر اُس کے منہ سے لگا دی۔

پرکاش نے جھٹکے سے بوتل منہ سے ہٹائی اور حنا سے لپٹ گیا۔ حنا بڑی مشکل سے اپنے آپ
اُس کے چنگل سے چھڑا سکی تھی۔ اُس نے دھکا دیا تو پرکاش قالین پر گر گیا۔ اب اُس میں
اُٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ شراب کی زیادتی نے اُس کے حواس بالکل مختل کر دیئے تھے۔ اُس کے
اعصاب بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے تھے اور دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ حنا نے اُس کی
طرف دیکھا، اپنا حلیہ درست کیا اور اُٹھ کر دروازے کا لاک کھول دیا۔ اس کے صرف پانچ سیکنڈ
بعد دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ طارق اور دل شیر تھے۔ طارق عجیب سی نظروں
سے حنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حنا اُس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

''ان انسان نما بھیڑیوں کے چنگل سے وطن کی آزادی کے لئے میری سینکڑوں بہنیں عزت
و ناموس سے محروم ہو چکی ہیں۔ مجھے اس عظیم مقصد کے لئے اپنی جان بھی دینی پڑی تو گریز نہیں
کروں گی۔''

''تم واقعی عظیم ہو حنا......!'' طارق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

حنا، کمرے سے نکل گئی۔ طارق اور دل شیر نے قالین پر پڑے ہوئے پرکاش کو اُٹھایا اور وہ
بھی کمرے سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ پرکاش کو اُٹھائے ڈلہوزی ہاؤس کی عقبی تاریک گلی
میں نکل آئے۔ اُنہوں نے پرکاش کو دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا
اور دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سٹیئرنگ کے سامنے دل شیر تھا۔ اُس نے انجن سٹارٹ کیا اور
کار ایک جھٹکے سے حرکت میں آ کر تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔

☆

پرکاش کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ قریب ہی اُس کے ماں باپ کھڑے
تھے۔ اُس کی چھوٹی بہن پونم بھی ایک طرف اُداس کھڑی تھی۔ پونم کی عمر اکیس سال تھی اور وہ بے

حد حسین تھی۔ چند ماہ بعد اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد پر
آنکھیں مچ مچا کے اپنے اطراف میں دیکھا۔ اُسے ہر چیز دُھند میں لپٹی ہوئی سی محسو
تھی۔ سر اِس طرح بھاری ہو رہا تھا، جیسے منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ وہ آنکھیں بند کر
ہاتھوں سے کنپٹیاں مسلنے لگا۔ جب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو چھائی ہوئی دُھند چھٹتی ہو
ہونے لگی۔ وہ چہرے جو چند لمحے پہلے دبیز دُھند میں لپٹے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ وا
لگے اور پھر اپنے سامنے باپ کا چہرہ دیکھ کر وہ جیسے پوری طرح ہوش میں آ گیا اور ایک جھ
اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پپ...... پتا جی...... آ...... پ......'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔ وہ اپنے باپ سے بے حد ڈر
اور اُن کے سامنے کبھی شراب تو کیا، سگریٹ تک نہیں پیا تھا۔

''ہوش آ گیا صاحبزادے کو......؟'' اُس کے باپ کے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔ ''شرم
آتی تمہیں باپ کی عزت اس طرح گندی نالیوں میں رلاتے ہوئے۔''

''مم...... معاف کر دیجئے پتا جی......'' پرکاش ہکلایا۔ ''دوستوں نے زبردستی پلا
مگر...... مجھے یہاں کون لایا تھا؟ میں تو......''

''لاتا کون......'' رائے صاحب پھر غرائے۔ ''تمہارے وہ نابنجار دوست ہی چھوڑ
گے۔ دروازے کے سامنے گندی نالی میں پڑے ہوئے تھے۔ اگر محلے کا کوئی آدمی تمہ
طرح نالی میں پڑے ہوئے دیکھ لیتا تو میری کیا عزت رہ جاتی؟ تمہیں شرم آنی چاہئے۔
بعد تمہاری بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ اگر اس کے سسرال والوں کو تمہاری ان حرکتو
چل گیا تو......'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئے، پھر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
اپنے لاڈلے کو سمجھاؤ۔ آئندہ اگر اس نے شراب کو ہاتھ لگایا تو میں اسے گھر سے نکال دوں

''معاف کر دیجئے پتا جی! غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ وہ میرے دوستوں نے

''جہنم میں گئے تمہارے دوست......'' رائے صاحب نے دھاڑتے ہوئے اُس
کاٹ دی۔ ''آئندہ میں اس قسم کی کوئی حرکت برداشت نہیں کروں گا۔'' رائے صاحب
ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

ماں دیر تک پرکاش کو سمجھاتی رہی اور پرکاش، سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا۔ او
جب ماں اور پونم بھی کمرے سے چلی گئیں تو اُس نے سر اُٹھا کر سامنے دیوار پر لگے ہو
کی طرف دیکھا۔ سوا تین بج رہے تھے۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔
رات کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ حنا کے ساتھ ڈلہوزی ہاؤس گیا تھا۔ اور پھر اُسے وہ

یاد آ گیا جو ڈلہوزی ہاؤس کے بند کمرے میں ہوا تھا۔ اُس نے خوب شراب پی تھی اور شاید شراب پی کر ہی حواس کھو بیٹھا تھا۔ لیکن اُسے یاد نہیں تھا کہ وہ گھر کیسے پہنچا؟ ممکن ہے، حنا اُسے گھر کے دروازے پر چھوڑ گئی ہو اور وہ نالی میں گر پڑا ہو۔ جہاں سے اُس کے گھر والوں نے اُسے اُٹھایا ہو۔

وہ ایک بار پھر حنا کے تصور میں کھو گیا۔ رات کو ایک کمرے میں بند ہونے کے باوجود وہ ناکام رہا تھا۔

رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی۔ پرکاش اپنی چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا۔ رات کے باقی حصے میں وہ ایک لمحے کو بھی آنکھ نہیں جھپک سکا تھا۔ اُس کے ذہن میں بار بار حنا کا تصور اُبھر رہا تھا۔ وہ حنا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور اتنی جلدی اُس سے بے تکلف کیوں ہو گئی تھی؟ گلاب دین کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ اُس فیکٹری کے مالک کی سیکرٹری ہے جہاں گلاب دین کو نوکری ملی تھی۔ اور وہ گلاب دین کا پیغام لے کر آئی تھی۔ لیکن گلاب دین کی ماں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے کس فیکٹری میں نوکری ملی تھی؟ نہ ہی اُس نے حنا سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں کام کرتی ہے؟

صبح کی روشنی طلوع ہوتے ہی پرکاش بستر سے نکل آیا۔ اُس کا سر ابھی تک بوجھل ہو رہا تھا۔ رات بھر جاگنے سے کسلمندی بھی تھی۔ وہ بستر سے نکلتے ہی باتھ رُوم میں گھس گیا۔ سردی کے باوجود اُس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جس سے اُسے خاصا سکون ملا۔ وہ باتھ رُوم سے نکلا ہی تھا کہ پونم چائے کا کپ لے آئی۔ وہ روانہ تقریباً اسی وقت اُٹھا کرتا تھا اور پونم ہی اُس کے لئے بیڈ ٹی لے کر آیا کرتی تھی۔

چائے پینے کے بعد پرکاش نے لباس تبدیل کیا اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ اُس کا رُخ گلاب دین کے گھر کی طرف تھا۔ جب وہ گلاب دین کے گھر پہنچا تو اُس کی ماں ناشتہ کرنے کے بعد باورچی خانے میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔

''ارے پرکاش...... تم؟ اتنی صبح! خیریت تو ہے؟'' ماں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''گلاب دین کہاں ہے ماں جی......؟'' پرکاش نے پوچھا۔

''وہ تو کمپنی کے کام سے امرتسر گیا ہوا ہے۔ کل شام کو حنا یہی تو بتانے آئی تھی کہ وہ دو تین دن بعد واپس آئے گا۔'' ماں نے جواب دیا۔

''گلاب دین کو کس فیکٹری میں نوکری ملی ہے؟ اور حنا کون ہے؟'' پرکاش نے پوچھا۔

''یہ تو اُس نے نہیں بتایا۔ لیکن حنا، فیکٹری کے مالک کی سیکٹری ہے۔'' ماں نے کہا۔

''لیکن کون سی فیکٹری..... کیا حنا نے بھی نہیں بتایا؟''

''نہیں بیٹا! اُس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ لیکن بات کیا ہے؟ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟ رات کو سوئے نہیں کیا؟'' ماں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں ماں جی! رات کو نیند نہیں آ سکی۔ میں شام کو آؤں گا۔'' پرکاش کہتے ہوئے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر اُس نے ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ دفتر میں وہ دن بھر پریشان رہا۔ وہ بار بار گلاب دین اور حنا کے بارے میں سوچتا رہا۔ گلاب دین کو کس فیکٹری میں ملازمت ملی تھی؟ حنا کون تھی؟ وہ رات کو اُسے نشے میں مدہوش چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی؟

پانچ بجے وہ دفتر سے نکل کر سیدھا گھر آیا۔ چھ بجے کے لگ بھگ وہ گلاب دین کے گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ پونم نے کمرے میں داخل ہو کر بتایا کہ اُس کے کسی دوست کا فون آیا ہے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھک میں آ گیا، جہاں ٹیلی فون رکھا رہتا تھا۔ بیٹھک میں اُس وقت والد صاحب اور اُن کے دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ فون کا ریسیور میز پر الگ رکھا ہوا تھا۔ پرکاش نے آگے بڑھ کر ریسیور اُٹھا لیا۔

''ہیلو.....! پرکاش بول رہا ہوں۔''

''پرکاش.....! میں گلاب دین بول رہا ہوں۔ میرے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ کل شام جس لڑکی سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی، وہ اس وقت آریہ سماج اور لنک روڈ کے موڑ پر تمہارا منتظر ہے۔ اُس کے ساتھ آ جاؤ!''

''تم کہاں سے بول رہے.....؟''

''فون پر بات نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف سے پرکاش کی بات کاٹ دی گئی۔ ''یہاں آؤ گے تو تفصیل سے بتاؤں گا کہ معاملہ کیا ہے۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو۔''

پرکاش نے کچھ کہنا چاہا، لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ گئی۔ اُس نے ریسیور رکھتے ہوئے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے نکل آیا۔ صرف ایک منٹ بعد وہ دروازے سے مکان سے باہر نکل رہا تھا۔ گلی سے نکل کر وہ آریہ سماج روڈ پر پہنچ گیا اور تیز تیز اُٹھاتا ہوا لنک روڈ کی طرف چلنے لگا۔

لنک روڈ کے موڑ پر پہنچ کر وہ رُک گیا اور متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

اُسے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ حنا کے خیال سے اُس کے دماغ میں ایک بار پھر سنسنی سی ہونے لگی تھی۔ اُسے صبح ہی سے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا اور گلاب دین کے فون نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ گلاب دین کو نہ تو کسی فیکٹری میں نوکری ملی تھی اور نہ ہی وہ امرتسر گیا ہوا تھا۔ بلکہ اسی شہر میں موجود تھا۔ لیکن وہ کہاں تھا؟ اور کس مصیبت میں پھنسا ہوا تھا؟ اور یہ کہ وہ خود کس طرح اُس کی مدد کر سکتا تھا؟ پرکاش سڑک پر کھڑا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک پرانی سی کار اُس کے قریب آ رُکی۔ سٹیئرنگ کے سامنے لمبی داڑھی والا ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

''آ جاؤ پرکاش!''

پرکاش یہ سریلی آواز سن کر چونک گیا۔ اُس نے جھک کر دیکھا، کار کی پچھلی سیٹ پر حنا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور کار حرکت میں آ گئی۔ کار کچھ دیر تک لنک روڈ تک دوڑتی رہی، پھر شنکر روڈ پر مُڑ گئی اور وہاں سے ایک اور روڈ پر گھوم گئی۔ سیکرٹریٹ کے عقب میں واقع یہ علاقہ سرِ شام ہی ویران ہو جاتا تھا۔

''ڈیئر پرکاش! تمہیں آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑے گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔'' حنا نے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کون ہو..... اور میرا دوست گلاب دین کہاں ہے؟'' پرکاش نے پوچھا۔

''ہم تمہیں، تمہارے دوست کے پاس ہی لے جا رہے ہیں۔ اور میرے بارے میں بھی تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ لیکن پہلے آنکھوں پر یہ پٹی.....'' حنا نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی اور پرکاش کی طرف جھک کر اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے لگی۔ پرکاش نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

کار اب اُس علاقے میں پہنچ چکی تھی، جہاں مختلف ممالک کے سفارت خانے اور سفارت کاروں کے وسیع و عریض بنگلے واقع تھے۔ اور پھر کلب روڈ اور تغلق روڈ سے گزرتی ہوئی مولانا آزاد روڈ پر آ گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ایک بنگلے میں داخل ہو کر رُک گئی۔

پرکاش کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ اور فرش بھی برہنہ تھا۔ سامنے ہی ایک کرسی پر گلاب دین بندھا پڑا تھا۔ اُس کے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا اور بائیں آنکھ بھی سوجی ہوئی تھی۔ آنکھ کے نیچے رخسار پر نیلا سا دھبہ پڑا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کی پٹائی کی گئی تھی۔ ایک دیوار کے قریب میز پر رنگین ٹیلی ویژن اور وی سی پی رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں دو آدمی اور بھی تھے جن

میں ایک تو دُبلا پتلا سا تھا، اور دوسرا لمبے قد کا بھاری بھرکم آدمی جس کے گل مچھوں کو دیکھ کر ہی پرخوف سا طاری ہو رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے.....؟'' پرکاش نے حنا کی طرف دیکھا۔ ''تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟ میرے دوست کو اس طرح باندھ کر کیوں رکھا گیا ہے..... کون ہو تم لوگ.....؟''

''ان باتوں کا جواب میں دُوں گا مسٹر پرکاش!'' دُبلے پتلے آدمی نے کہا۔ ''تمہیں اس کی کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ ہم کون ہیں۔ البتہ تم ہمارے چند سوالوں کا جواب ضرور دو۔ انکار کی صورت میں ہم تمہارے ساتھ جو کچھ کریں گے، تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکو گے۔''

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' پرکاش نے اُسے گھورا۔

''تم آج کل اسرائیلی سفارت خانے میں کام کر رہے ہو۔ تمہاری کمپنی بھی ایک معاملے میں اُس سفارتخانے سے تعاون کر رہی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق اسرائیل کے کچھ فوجی ماہرین کل رات دہلی آ رہے ہیں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کس فلائٹ سے یہاں پہنچیں گے.....؟''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ اور نہ ہی اسرائیلی سفارتخانے سے میرا کوئی تعلق ہے۔ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' پرکاش نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''جھوٹ تمہارے لئے نقصان دہ ہوگا مسٹر پرکاش!'' دُبلے پتلے آدمی نے کہا۔ وہ شاید ٹھیک تھا۔

''پرکاش! کچھ مت بتانا انہیں۔ یہ غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی بہت مارا ہے۔ لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ یہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کمپنی، ہندو نوجوانوں کو بھرتی کر کے اسرائیل کیوں بھیج رہی ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے کمپنی کی ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ مگر یہ لوگ نہیں مانتے۔'' گلاب دین نے کہا۔

''یہ درست ہے کہ گلاب دین کو کمپنی کی ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ لیکن تم لوگ کیا جاننا چاہتے ہو.....''

''ایک منٹ مسٹر پرکاش!'' شاہ رُخ نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''مزید کچھ کہنے سے پہلے یہ فلم دیکھ لو! یہ فلم تمہیں سچ بولنے پر مجبور کر دے گی۔'' شاہ رُخ نے گل مچھوں والے کو اِشارہ کیا۔ وہ دل شیر تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پہلے ٹی وی آن کیا اور پھر وی سی پی کا سوئچ دبا دیا۔ حنا کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

ٹی وی سکرین پر لہریں سی ناچنے لگیں۔ اور پھر جوسین، سکرین پر نظر آیا، اُسے دیکھ کر

لرز اُٹھا۔ گزشتہ رات ڈلہوزی ہاؤس کے پرائیویٹ رُوم میں جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ سب کچھ ٹی وی سکرین پر نظر آ رہا تھا۔ فلم اس مہارت سے بنائی گئی تھی کہ حنا کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن پرکاش کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اُن دونوں کی گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی تھی۔ پرکاش نے گزشتہ رات نشے میں جو کچھ بتایا تھا، اب اُسے سن کر اُس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

شاہ رُخ نے ٹی وی بند کر دیا اور پرکاش کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ فلم تمہارے باپ، تمہاری بہن کے سسرال والوں اور اسرائیلی سفارت خانے کو بھیج دی جائے تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہوگا۔ گزشتہ رات تم یہ اعتراف کر چکے ہو کہ بہت کچھ جانتے ہو۔ اس لئے اس سلسلے میں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے تعاون کیا تو تمہیں اور تمہارے دوست کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

''کیا جاننا چاہتے ہو.....؟'' پرکاش کے حلق سے مُردہ سی آواز نکلی۔ اُسے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ فلم اسرائیلی سفارت خانے کو بھیج دی گئی تو یہودی اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ دوسری طرف اُس کے خاندان کی عزت اور بہن کی زندگی کا سوال تھا۔ وہ اُن کے شکنجے میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ اُن سے تعاون کیا جائے۔

''اسرائیلی فوجی ماہرین کل کس فلائٹ سے آ رہے ہیں.....؟'' شاہ رُخ نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''ٹریننگ کیمپ جمنا کے کنارے کس جگہ قائم کیا گیا ہے.....؟''

''یہ بھی نہیں معلوم۔'' پرکاش نے جواب دیا۔

''لیکن معلوم کر سکتے ہو۔'' شاہ رُخ نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''کل دوپہر تک یہ معلومات ہم تک پہنچ جانی چاہئیں۔ کل دوپہر لنچ کے وقفے میں تم سفارت خانے کی عمارت سے باہر آؤ گے۔ ہمارا آدمی خود ہی تم سے رابطہ قائم کرے گا۔ اور اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو نہ صرف یہ فلم متعلقہ لوگوں تک پہنچا دی جائے گی، بلکہ اگلی مرتبہ جب تمہیں یہاں لایا جائے گا تو اس کرسی پر تمہیں اپنی بہن بندھی ہوئی نظر آئے گی۔''

پرکاش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاہ رُخ کے اشارے پر گلاب دین کو کھول دیا گیا اور اُن دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔

☆

وہ مراد علی تھا، جو بھکاری کے بھیس میں اسرائیلی سفارتخانے والی سڑک پر ایک درخت کے

نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہندو ہی لگ رہا تھا۔ اُس کے سامنے ایک میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی جس پر پانچ، دس پچیس اور پچاس پیسے والے چند سکے بکھرے ہوئے تھے۔ سفارت خانے کی عمارت تقریباً پچھتر گز دُور سڑک کے دوسری طرف تھی۔ اور جس طرف علی مراد بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے سفارت خانے کا گیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ مرادعلی کے بائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر پیپل کے درختوں کے جھنڈ کے نیچے ایک ہوٹل بھی بنا ہوا تھا۔ اس قسم کے سائبان ہوٹل ایسے علاقوں میں عام طور پر نظر آتے ہیں جہاں دفاتر وغیرہ ہوں۔ دفاتر کے نچلے درجے کے ملازمین کو ان ہوٹلوں سے سستا کھانا مل جاتا ہے۔ یہ بھی ایک سائبان ہوٹل تھا۔ لیکن دوسرے ہوٹلوں کی نسبت قدرے صاف ستھرا تھا۔ یہاں چارپائیوں اور بنچوں کی بجائے سٹیل کی فولڈنگ میزیں اور کرسیاں تھی۔ اُس سڑک پر دو سفارت خانے اور بھی تھے جن کی وجہ سے اس سائبان ہوٹل میں لوگوں کی آمد و رفت بھی خوب تھی۔ اس وقت اگرچہ ہوٹل میں صرف تین چار گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن علی مراد جانتا تھا کہ پندرہ منٹ بعد جب دفاتر میں لنچ کا وقفہ ہوگا تو یہاں بیٹھنے کو بھی جگہ نہیں ہوگی۔

وہ پیپل کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ اُس کی نظریں اسرائیلی سفارت خانے کے گیٹ پر مرکوز تھیں جہاں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ٹھیک ایک بجے لنچ کا وقفہ ہوگیا اور اس کے چند منٹ بعد لوگ باہر آنے لگے۔ اُن میں وہ لوگ بھی تھے جو ویزے یا کسی اور کام کے سلسلے میں آئے تھے، اور نچلے درجے کے ملازمین بھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سائبان ہوٹل کی تمام میزیں بھر گئیں۔ مرادعلی اب بھی اسرائیلی سفارت خانے کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پرکاش، سفارتخانے کے گیٹ سے باہر نکلا۔ اُس کا رُخ سائبان ہوٹل کی طرف تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور وہ محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو مرادعلی نے اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات واضح طور پر دیکھ لئے تھے۔

پرکاش، مرادعلی کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات بڑھ گئے تھے۔ اُس نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور جیب سے پچاس پیسے کا ایک سکہ نکال کر مراد علی کے سامنے پھیلی ہوئی چادر پر پھینک دیا۔ مرادعلی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا نیم وا آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے پچاس پیسے کے سکے کے ساتھ کاغذ کی ایک چھوٹی سی گولی بھی چادر پر گرتے ہوئے دیکھی تھی۔ وہ گولی، لڑھکتی ہوئی اُس کے پیر کے قریب آ کر رُک گئی۔ مرادعلی نے غیر محسوس انداز میں پیر کو حرکت دے کر

گولی کو دبا لیا۔

پرکاش آگے بڑھ گیا۔ سائبان ہوٹل میں کسی میز پر جگہ نہیں تھی۔ اُس نے کھڑے کھڑے چائے پی اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا سفارت خانے واپس چلا گیا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے مرادعلی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ مرادعلی اب بھی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ اس دوران اُس نے بڑی خوبصورتی سے کاغذ کی وہ گولی اُٹھا کر جیب میں ڈال لی تھی۔

دفتروں میں لنچ کا وقفہ ختم ہو چکا تھا۔ سائبان ہوٹل بھی خالی تھا۔ مرادعلی نے چادر پر بکھرے ہوئے پیسے سمیٹ کر جیب میں ڈالے، چادر جھاڑ کر کندھے پر ڈال لی اور کشکول اُٹھا کر سائبان ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر اُس نے چائے پی اور پیسے دیئے بغیر جے رام جی کی صدا لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد مرادعلی، موتی باغ پہنچ چکا تھا۔ وہاں ایک جگہ اُس نے اپنا حلیہ تبدیل کیا۔ جب وہ دوبارہ سڑک پر آیا تو اُس کی شخصیت بالکل بدل چکی تھی۔ کچھ دُور جا کر اُس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سردار پٹیل روڈ پر پہنچ گیا۔ وہاں سے دوسری ٹیکسی کے ذریعے مندر مارگ پر لکشمی نارائن مندر کے سامنے اُترا۔ اور پھر تیسری ٹیکسی کے ذریعے مولانا آزاد روڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ٹیکسیوں میں اتنے طویل چکر اُس نے اِس لئے کاٹے تھے کہ وہ اندازہ لگا لینا چاہتا تھا کہ اُس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا؟ آخر میں مطمئن ہونے کے بعد وہ مولانا آزاد روڈ کی طرف گیا تھا۔ جب وہ شاہ رُخ کے بنگلے پر پہنچا تو اس وقت ساڑھے تین بج رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اُسے یہاں تک آنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگا تھا۔

طارق اور شاہ رُخ بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ مرادعلی جب اُن کے سامنے پہنچا تو اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے جیب سے کاغذ کی وہ چھوٹی سی گولی نکال کر شاہ رُخ کے حوالے کر دی جو پرکاش نے پچاس پیسے کے سکے کے ساتھ چادر پر پھینکی تھی۔ شاہ رُخ نے گولی کھول کر کاغذ کو سیدھا کیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ کاغذ پر صرف دو لائنیں لکھی ہوئی تھیں۔

A.L.35 رات گیارہ چالیس۔ صفدر جنگ۔

جمنا کے کنارے۔ صحیح لوکیشن کا پتہ نہیں چل سکا۔

''اسرائیلی فوجی ماہرین آج رات گیارہ چالیس پر اسرائیلی ایئر لائن ال آل کی فلائٹ A.L.35 سے دہلی پہنچ رہے ہیں۔ اُن کا طیارہ صفدر جنگ ایئرپورٹ پر لینڈ کرے گا۔'' شاہ

رُخ نے بتایا۔

''صفدر جنگ۔'' مراد علی بولا۔ ''لیکن تمام انٹرنیشنل پروازیں تو پالم ایئر پورٹ پر آتی ہیں۔ صفدر جنگ ایئر پورٹ پر تو.....''

''کھوپڑی استعمال کرو مراد علی!'' شاہ رُخ نے اُسے ٹوک دیا۔ ''ایسا یقیناً رازداری کے خیال سے کیا گیا ہے۔''

''اور ٹریننگ کیمپ؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کیمپ، جمنا کے کنارے کسی جگہ قائم کیا گیا ہے۔ پرکاش، کیمپ کی لوکیشن کا پتہ نہیں چلا سکا۔'' شاہ رُخ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''مراد علی! تم فون پر دل شیر کو بتا دو کہ وہ سات بجے یہاں پہنچ جائے۔ ہم نو بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے آپس میں کچھ باتیں طے کر لینا ضروری ہے۔''

''جانا کہاں ہے.....؟'' مراد علی نے پوچھا۔

''صفدر جنگ ایئر پورٹ.....'' شاہ رُخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم، اسرائیلی ایئر لائن کے اُس طیارے کو لینڈ کرنے سے پہلے ہی تباہ کر دیں گے.....''

''اُنہوں نے ایئر پورٹ اور اس کے آس پاس بڑے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ.....''

''ہمیں ایئر پورٹ جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم دل شیر کو فون کر کے آؤ! اس کے بعد ہم پروگرام طے کریں گے۔'' شاہ رُخ نے کہا۔

دل شیر کو فون پر اطلاع دے دی گئی کہ وہ ٹھیک سات بجے کوٹھی پر پہنچ جائے۔ وہ تینوں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے تھے۔ گفتگو موجودہ صورتحال پر ہی ہو رہی تھی۔

''ہندوؤں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا ہے، وہ بے حد خطرناک ہے۔'' شاہ رُخ کہہ رہا تھا۔ ''متعصب ہندو نوجوانوں کی تخریب کاری، دہشت گردی اور چھاپہ مار جنگ کی جو ٹریننگ دی جا رہی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ وادی کشمیر میں زیادہ سے زیادہ تباہی پھیلائی جائے۔ آزادی کا نعرہ لگانے والوں کا گلا گھونٹ کر اُن کی آواز دبا دی جائے۔ وادی میں اس قدر بربریت پھیلائی جائے کہ کشمیری سر نہ اُٹھا سکیں۔ لیکن ہندو یہ نہیں جانتے کہ مسلمان کبھی باطل کے سامنے نہیں جھکا۔ ایک مسلمان کی گردن کٹتی ہے تو دس اور سامنے آ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو دہشت گردی اور چھاپہ مار جنگ کی تربیت کے لئے اسرائیل بھیجا جا رہا ہے، اُن کے بارے میں تو ہم فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اتنا تو کر سکتے ہیں کہ یہاں جن لوگوں کو ٹریننگ

دی جا رہی ہے یا دی جانے والی ہے، اُنہیں وقتی طور پر روک دیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری اس کارروائی سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اتنا ضرور ہو گا کہ ہم ان کے منصوبے میں تاخیر پیدا کر دیں گے۔''

''تمہارا کیا منصوبہ ہے.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میرا منصوبہ یہ ہے کہ ہم اُن کا ٹریننگ کیمپ تباہ کر دیں گے۔'' شاہ رُخ بولا۔

''میں نے کچھ اسلحہ جمع کر رکھا ہے جو ہمارے منصوبے کی تکمیل کے لئے مددگار ثابت ہو گا۔ سب سے پہلے ہم آج رات اسرائیلی ایئر لائن کے اُس طیارے کو تباہ کر دیں گے جو جنگی ماہرین کو لے کر آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہماری اس کارروائی سے اُن کا منصوبہ ختم نہیں ہو گا۔ لیکن وقتی طور پر اس میں رخنہ ضرور آ جائے گا۔ ہم اگر ایک گروپ کو ختم کر دیں گے تو اُس کی جگہ دوسرا گروپ آ جائے گا۔ ہم اپنا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رکھیں گے، جب تک ہمارے دم میں دم رہے گا۔ سب سے پہلے ہمیں آج رات اُس طیارے کو تباہ کرنے کی پلاننگ کرنی ہے۔ ہم اپنی یہ کارروائی ایئر پورٹ سے دُور رہ کر کریں گے۔ نقشہ دیکھو گے تو میری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔'' شاہ رُخ نے میز پر دہلی کا نقشہ بچھا دیا۔ اُس نقشے میں دہلی کی تمام اہم سڑکوں، عمارتوں اور تاریخی مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ''یہ صفدر جنگ ایئر پورٹ ہے۔'' اُس نے پنسل کی نوک سے نقشے پر ایئر پورٹ کی نشاندہی کی۔ ''یہ تغلق روڈ ہے جو صفدر جنگ کے ایئر پورٹ کے قریب سے گزرتی ہوئی رنگ روڈ سے جا ملتی ہے۔ یہ لودھی روڈ ہے جو ایئر پورٹ سے ہمایوں کے مقبرے کی طرف چلی گئی ہے۔ یہاں ایک طرف علی گنج ہے اور دوسری طرف صفدر جنگ ایئر پورٹ۔ اور یہ بائیں طرف تغلق روڈ کے بالکل ساتھ صفدر جنگ کا مقبرہ اور اس سے آگے ریس کورس ہے۔ صفدر جنگ کا مقبرہ ایئر پورٹ کے بالکل سامنے ہے۔ یہاں سے ایئر پورٹ پر کسی بھی جہاز کو میزائل سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف مہارت اور نشانے کی ہے۔ اور طارق! میرا خیال ہے، تمہیں میزائل فائر کرنے کی ٹریننگ بھی دی گئی ہے۔'' شاہ رُخ نے خاموش ہو کر طارق کی طرف دیکھا۔

''میں سٹنگر میزائل بھی چلانا جانتا ہوں۔'' طارق نے کہا۔

''گڈ.....'' شاہ رُخ مسکرایا۔ ''آج رات تم سٹنگر میزائل فائر کر کے اپنی مہارت کا مظاہرہ کرو گے۔''

''سٹنگر میزائل.....؟'' طارق نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''یہاں سٹنگر میزائل کیسے آ گیا.....؟''

''کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔'' شاہ رُخ مسکرایا۔''ہمارے پاس سٹنگو میزائل اتنی تو
میں موجود ہیں کہ دہلی جیسے شہر کو تباہ کیا جاسکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ سکیورٹی کے غیر معمولی انتظامات کئے گئے ہوں گے۔ کیا صفدر جنگ
مقبرہ اُن کی نگاہوں میں نہیں ہوگا؟''

''سکیورٹی کے انتظامات ضرور ہوں گے۔ لیکن صرف ایئر پورٹ کی حد تک۔ میں نہیں سمجھ
کہ اُنہوں نے ایئر پورٹ کی حدود سے باہر بھی توجہ دی ہوگی۔ لیکن بہرحال! ہمیں رسک تو لی
ہی پڑے گا۔''

''واپسی کے بارے میں کیا سوچا ہے......؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف
دیکھا۔

''یہ طے کرنا ابھی باقی ہے۔'' شاہ رُخ نے کہا۔''بہرحال! دل شیر آ جائے تو اُس کی
موجودگی میں سارا پروگرام طے کرلیا جائے گا۔''

اُس وقت چھ بجنے والے تھے۔ یہ لوگ اپنے طور پر روانگی کی تیاری کر چکے تھے۔ دل شیر کا
انتظار تھا۔ تاکہ اُسے بھی بریفنگ کر دی جائے۔ اس وقت جنت بی بی کمرے میں آئی تو شاہ رُخ
نے اُسے چائے کے لئے کہہ دیا۔

ٹھیک سات بجے دل شیر پہنچ گیا۔ وہ لوگ ایک بار پھر میز کے گرد جمع ہو گئے۔ میز پر نقشہ پھیلا
ہوا تھا۔ شاہ رُخ نے سارا منصوبہ ایک بار پھر دُہرایا، پھر بولا۔''ہم لوگ تین گاڑیوں میں یہاں
سے الگ الگ روانہ ہوں گے۔ پہلی گاڑی ٹھیک نو بجے کے بعد یہاں سے نکلے گی۔ اس میں
طارق اور دل شیر ہوں گے۔ یہ گاڑی جنوبی سیکرٹریٹ کے قریب سے گزر کر سردار پٹیل روڈ پر
ہوتی ہوئی موتی باغ کی طرف جائے گی۔ وہاں سے رنگ روڈ کا راستہ اختیار کرتے ہوئے علی گنج
اور وہاں سے صفدر جنگ کے مقبرے پر پہنچے گی۔ دوسری گاڑی، پہلی گاڑی کے ٹھیک پانچ منٹ
بعد روانہ ہوگی۔ اُس میں مراد علی ہوگا۔ یہ گاڑی نیشنل آرٹ گیلری کے قریب سے کارن والز روڈ
اور پرتھوی راج روڈ سے ہوتی ہوئی مقبرے کا رُخ کرے گی۔ تیسری گاڑی میں، میں ہوں گا۔
میں دوسری گاڑی کے ٹھیک پانچ منٹ بعد یعنی نو بج کر دس منٹ پر یہاں سے روانہ ہوں گا۔ میں
ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ اور لودھی روڈ سے ہوتا ہوا صفدر جنگ کے مقبرے پر پہنچوں گا۔ یہ بات
ذہن میں رہے کہ مقبرے والی سڑک پر مُڑتے ہی گاڑیوں کی تمام بتیاں بجھا دی جائیں گی۔
مقبرے پر پہنچنے کے بعد ایک دوسرے سے رابطہ کرنے کے لئے بلی کی آواز کا سگنل استعمال کیا
جائے گا۔ سب سے پہلے میں سگنل دُوں گا۔ اس کے بعد دوسرے۔''

شاہ رُخ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''کارروائی مکمل کرنے
کے بعد ہماری واپسی کا راستہ بھی مختلف ہوگا۔ پارٹی نمبر ایک، یعنی طارق اور دل شیر، پوائنٹ
تھری پر جائیں گے۔ پارٹی نمبر دو، علی مراد پوائنٹ نمبر ون پر اور پارٹی نمبر تین یعنی میں پوائنٹ ٹو
پر جاؤں گا۔ اور اب......'' شاہ رُخ نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن شریف میز پر رکھ دیا۔''ہم
سب اللہ کے اس پاک کلام پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں گے کہ اگر ہم میں کوئی پکڑا گیا تو ہم جان
دے دیں گے، لیکن اپنے کسی ساتھی یا ٹھکانے کا نام پتہ نہیں بتائیں گے۔''

سب نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ اور اس طرح یہ میٹنگ ختم ہوگئی۔ آٹھ بجے
جنت بی بی نے کھانا لگا دیا۔ اگرچہ یہ کھانے کا وقت تھا لیکن کسی کا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔
سب ایک آدھ لقمہ لے کر ہی رہ گئے۔ طارق اپنے آپ میں سنسنی کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس
کر رہا تھا۔ کشمیر میں اگرچہ وہ مجاہدین کے ساتھ مل کر بھارتی فوجیوں کے خلاف چھوٹی چھوٹی
چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لیتا رہا تھا۔ لیکن ہندوؤں کی اپنی سرزمین پر کسی بڑی کارروائی میں
وہ پہلی بار حصہ لے رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو اُسے ناقابل تصور اذیتیں
دے دے کر ہلاک کیا جائے گا۔ لیکن وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ اگر موت کا خوف ہوتا تو
مجاہدین کی تنظیم میں شامل نہ ہوتا۔ وہ سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلا تھا۔

آٹھ بج کر پچپن منٹ پر اُنہوں نے اپنی اپنی گھڑیاں ملائیں اور ٹھیک نو بجے طارق اور دل
شیر کی گاڑی، کوٹھی سے نکل گئی۔ طارق، پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور دل شیر نے سٹیئرنگ سنبھال
رکھا تھا۔ گاڑی مقررہ راستوں سے ہوتی ہوئی جیسے ہی صفدر جنگ کے مقبرے کی طرف جانے
والی سڑک پر مُڑی، دل شیر نے گاڑی کی تمام بتیاں بجھا دیں۔

اُس نے گاڑی اندر لے جا کر ایک شکستہ دیوار کے پیچھے کھڑی کر دی۔ وہ دونوں اُتر کر اُس
سے تقریباً بیس گز دُور ایک اور دیوار کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ مقبرے میں تاریکی اور سناٹا طاری
تھا۔ ایک عجیب سی ہیبت ناکی تھی جو چاروں طرف بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔

چند منٹ بعد گاڑی کی آواز سن کر وہ محتاط ہو گئے۔ گاڑی تاریکی میں کہیں رُکی اور سناٹے
میں قدموں کی مدھم سی آواز سنائی دینے لگی جو بالآخر ایک جگہ رُک گئی۔ اور اس کے بعد پھر سناٹا
طاری ہوگیا۔ اس کے چند منٹ بعد تیسری گاڑی بھی مقبرے کی حدود میں کسی جگہ آ کر رُکی،
قدموں کی آواز اُبھری اور سناٹا...... اچانک اُس سناٹے میں بلی کی آواز سنائی دی۔ تیسری آواز
پر دل شیر نے بھی منہ سے بلی کی آواز نکلی اور طارق کو اشارہ کرتا ہوا پہلی آواز کی سمت چل دیا۔
اور پھر تیسری جگہ سے بلی کی آواز سنائی دی۔

چند منٹ بعد تینوں پارٹیاں ایک جگہ جمع ہو چکی تھیں۔ شاہ رُخ کے پیروں کے قریب لکڑی کا ایک لمبا سا بکس رکھا ہوا تھا۔ اُنہوں نے بکس اُٹھایا اور مقبرے میں داخل ہو گئے۔ مقبرے کے اندر شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر وہ گنبد پر پہنچ گئے۔ گنبد کے ساتھ صرف تین فٹ چوڑی کارنس بنی ہوئی تھی۔ اُس کارنس تک پہنچنے کے لئے تنگ سا دروازہ تھا۔ لکڑی کا بکس، دروازے میں ہی رکھ دیا گیا۔

''تم دونوں نیچے جاؤ..... ہوشیار رہنا۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو بلی کی آواز کا سگنل دے دینا۔'' شاہ رُخ نے دل شیر اور مراد علی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کیا بلی کی آواز کا سگنل یہاں تک سنائی دے جائے گا.....؟'' دل شیر نے پوچھا۔

''سناٹے میں معمولی سی آواز بھی دُور تک سنی جا سکتی ہے۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ وہ دونوں سنبھل کر تاریکی میں شکستہ سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔

''وہ سامنے صفدر جنگ ایئر پورٹ کی روشنیاں ہیں۔ لیکن رن وے کی بتیاں ابھی بجھی ہوئی ہیں۔ غالباً طیارے کی آمد سے چند منٹ پہلے جلائی جائیں گی۔ ہوا کا رُخ مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ اس ایئر پورٹ پر لینڈنگ، مشرق کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اُس طرف سے.....'' اُس نے ہاتھ سے اِشارہ کیا۔ ''اب تم اپنے لئے جگہ کا انتخاب کر لو۔ یہ تین فٹ چوڑی کارنس ٹھیک رہے گی یا اس دروازے میں بیٹھ کر فائر ہو سکے گا؟''

طارق، مشاقانہ نگاہوں سے ایئر پورٹ اور پھر مشرق کی طرف دیکھنے لگا۔ صورتحال کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اُس نے دروازے والی دیوار کے ساتھ کی جگہ کو ترجیح دی۔ شاہ رُخ نے لکڑی کا بکس کھول دیا۔ اُس میں ایک سٹنگر میزائل اور راکٹ لانچر تھا۔ راکٹ لانچر دو حصوں میں تھا جسے جوڑ کر فٹ کیا جا سکتا تھا۔ اُس لانچر کو ایک آدمی کندھے پر رکھ کر میزائل فائر کر سکتا تھا۔ شاہ رُخ نے میزائل نکال کر بڑی آہستگی سے ایک طرف رکھ دیا اور اندھیرے ہی میں ٹٹول کر اُس کے فیوز وغیرہ چیک کرنے لگا۔ اُس کی اُنگلیاں بڑی مہارت سے کام کر رہی تھیں۔ طارق نے لانچر کے دونوں حصے بکس میں سے نکال لئے اور اُنہیں آپس میں جوڑنے لگا۔

گیارہ بج گئے..... وقت بڑی سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لوگ بلندی پر کھلی ہوا میں تھے اور سردی کے باوجود طارق کو اپنی بنیان، پسینے میں بھیگی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

طیارے کو گیارہ لیس پر آنا تھا۔ اب صرف چند منٹ رہ گئے تھے اور وہ دونوں مشرق کی طرف دیکھ رہے تھے..... اچانک بہت دُور تاریک آسمان پر دو روشنیاں نیچے جھکتی ہوئی نظر

آئیں.....

''ہوشیار..... طیارہ آ رہا ہے۔'' شاہ رُخ نے اُن جھکتی ہوئی متحرک روشنیوں کو دیکھ کر سرگوشی کی۔

طارق نے میزائل کو پہلے ہی سے لانچر میں لگا رکھا تھا۔ اُس نے راکٹ لانچر کو اُٹھا کر کندھے پر رکھا، دونوں پیر مضبوطی سے جمائے اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے لانچر کا رُخ جھکتی ہوئی روشنیوں کی طرف تھا۔ روشنیاں، متحرک تھیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ لانچر کا زاویہ بھی تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

طیارہ بالآخر مقبرے کے قریب پہنچ گیا۔ اب وہ بالکل نیچے آ گیا تھا۔ شاہ رُخ کی نظریں بھی طیارے پر مرکوز تھیں۔ طیارہ اب لینڈنگ کے لئے رن وے پر جھک رہا تھا۔

''فائر.....!'' شاہ رُخ دانت بھینچ کر چیخا۔

طیارہ زد میں تھا۔ طارق نے میزائل فائر کر دیا..... اُسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر پشت پر دیوار کا سہارا نہ ہوتا تو یقیناً وہ گر پڑتا۔

روشنی کی ایک لکیر بجلی کے کوندے کی طرح طیارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میزائل، ٹھیک نشانے پر پہنچا تھا۔ سٹنگر میزائل جیسے ہی طیارے کو لگا، پہلے ایک دھماکہ ہوا، پھر آگ کا ایک بہت بڑا گولہ فضا میں نمودار ہوا اور پھیلتا چلا گیا۔ طیارے کے جلتے ہوئے حصے تاریک فضا میں چاروں طرف بکھر رہے تھے..... لگتا تھا جیسے آتش بازی کا انار پھوٹ پڑا ہو۔

''چلو..... بھاگو! راکٹ لانچر کو یہیں چھوڑ دو۔ ہری اَپ.....'' شاہ رُخ چیخا۔

طارق نے راکٹ لانچر وہیں چھوڑ دیا اور شاہ رُخ کے ساتھ گنبد کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اُس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ، دیوار سے ٹکائے شاہ رُخ کے پیچھے تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔

''اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ کر جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اس علاقے سے نکل چلو!'' شاہ رُخ نے مقبرے کی عمارت سے باہر آتے ہی چیخ کر کہا اور اپنی کار کی طرف دوڑ گیا۔

طارق، دل شیر کے ساتھ اپنی کار کی طرف دوڑا۔ تینوں کاریں مقبرے کی حدود سے نکل کر طوفانی رفتار سے مین روڈ کی طرف دوڑنے لگیں۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی اُن کے راستے مختلف ہو گئے۔ شاہ رُخ کی کار تغلق روڈ کی طرف، مراد علی کی کار پرتھوی راج روڈ کی طرف نکل گئی اور دل شیر نے اپنی کار لودھی روڈ کی طرف موڑ دی تھی۔

ہمایوں کے مقبرے کے قریب سے دل شیر نے گاڑی رنگ روڈ پر بائیں طرف موڑ دی اور

جمنا کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے وہ کوٹلہ فیروز شاہ کی طرف بھاگ نکلے۔

کوٹلہ فیروز شاہ کی ایک تنگ سی گلی میں کار روک کر وہ نیچے اُتر آئے اور کچھ دُور تک چلتے رہے۔ پھر ایک مکان کے سامنے رُک گئے۔ دل شیر نے جیب سے چابی نکال کر تا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے دل شیر نے دیوار ٹٹول کر سوئچ دیا۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی دونوں اُچھل پڑے...... طارق کو یوں لگا تھا جیسے اُس اُچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ اُسے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُن کے سامنے ادھیڑ عمر عورت، پستول تانے کھڑی تھی اور پستول کا رُخ ان ہی کی طرف تھا۔

☆

عورت کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اُس نے پستول سے اُنہیں آگے بڑھنے کا کیا اور ساتھ ہی خود بھی گھومتی چلی گئی۔ وہ بہت محتاط نظر آ رہی تھی۔ وہ اُنہیں ہانکتی ہوئی اند کمرے میں لے آئی۔ طارق اور دل شیر نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف اور غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے سے الگ ہٹنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں بیک پستول کی زد پر نہ رہیں۔ اُس عورت نے بھی شاید اُن کی اس حرکت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ مخصو انداز میں پستول کو حرکت دیتے ہوئے بلی کی طرح غرائی۔

''اے...... ! ایک دوسرے کے قریب رہو۔ درمیانی فاصلہ زیادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ارے...... یہ کیا؟'' طارق اُس عورت کے پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔ اُس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ آنکھوں میں وحشت سی اُبھر آئی تھی۔

عورت نے جلدی سے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ طارق کو اُسی لمحے کا انتظار تھا۔ وہ کسی طا سپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلا اور عورت کے اُوپر جا گرا۔ اُس کا ایک ہاتھ، عورت کے پستول والے ہاتھ پر پڑا تھا۔ پستول اُس عورت کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ اور طا عورت کو ساتھ لیتا ہوا سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ گئی۔ طارق نے عورت کو پوری طرح گرفت میں لے لیا گیا۔ اُس کا ایک ہاتھ عورت کے پر پہنچ چکا تھا۔ عورت کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

''ارے...... ارے...... چھوڑو مجھے...... یہ...... کیا کر رہے ہو......؟''

طارق، عورت کی بدلی ہوئی آواز سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ عورت کے گلے پر اُس گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دوسری طرف دل شیر نے لپک کر عورت کا پستول اُٹھا لیا تھا۔

''ارے...... ! یہ پستول تو نقلی ہے۔'' اُس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''تو میں کون سی اصلی ہوں......؟'' عورت کے منہ سے آواز نکلی۔

''دل تو چاہتا ہے کہ واقعی تمہارا گلا گھونٹ دُوں'' طارق نے کہتے ہوئے عورت کے نرخرے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ پھر اُسے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ اب وہ حنا کی آواز پہچان گیا تھا۔ ''یہ بہت خطرناک مذاق تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی تمہیں گولی ہی مار دیتا تو......؟'' وہ اُٹھ کر حنا کو گھورنے لگا۔

''تو میں مر جاتی۔'' حنا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا گلا سہلا رہی تھی۔ ''بہت سخت ہیں تمہارے ہاتھ۔ میرا تو سانس گھٹنے لگا تھا۔''

''یہ کیا مذاق تھا......؟'' اس مرتبہ دل شیر نے اُسے گھورا۔

''میں دراصل! شام کو اس بھیس میں گلاب دین سے ملنے گئی تھی۔ تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ پرکاش کو اس پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟ شاہ رُخ نے کہا تھا کہ میں واپس پوائنٹ تھری پر جاؤں۔ اُس نے مجھے یہ بالکل نہیں بتایا تھا کہ تم لوگ بھی یہاں آؤ گے۔ بہر حال! میں گلاب دین کے گھر بیٹھی اُس سے باتیں کر رہی تھی کہ پرکاش بھی آ گیا۔ وہ خاصا پریشان اور سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ اُسے گلاب دین پر ہونے والے تشدد کا بھی افسوس تھا۔ اس ڈرامے میں اصلیت کا رنگ بھرنے کے لئے شاہ رُخ نے گلاب دین پر کچھ زیادہ ہی طبع آزمائی کر ڈالی تھی۔ اُس کا چہرہ ابھی تک سوجا ہوا ہے۔ بہر حال! پرکاش کو گلاب دین پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔ وہ مجھے گلاب دین کا دوست سمجھ رہا تھا۔ وہ ہم دونوں کو کھانا کھلانے کے لئے ہوٹل لے گیا جہاں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ میں ابھی چند منٹ پہلے ہی یہاں پہنچی ہوں۔ اپنا یہ حلیہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ بیرونی دروازے کے تالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔'' حنا نے کہتے ہوئے سر پر سے وگ اُتار دی۔ وگ کے ساتھ ہی اُس کے چہرے پر سے ایک باریک سی جھلی بھی اُترتی چلی گئی۔ اب اُس کا اصلی چہرہ اُن کے سامنے تھا۔

''یہ پستول تم نے کہاں سے لیا تھا......؟'' دل شیر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نقلی پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم جانتے ہو، اس مکان میں ایک فیملی رہائش پذیر ہے۔ جن میں دو بچے بھی شامل ہیں۔ اُس فیملی کو شاہ رُخ نے غالباً ایک دو روز کے لئے کہیں اور بھیج دیا ہے۔ یہ پستول کسی بچے کا ہو گا جو دوسرے کمرے میں کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ باہر کے دروازے پر آواز سن کر میں نے اسے اُٹھا لیا۔ یہ پستول دیکھنے میں بالکل اصلی لگتا ہے۔ ویسے میں تم لوگوں کو مبارکباد دینا بھول ہی گئی۔ پونے

بارہ بجے کے قریب جب ہم ہوٹل سے نکل رہے تھے تو ہم نے آسمان پر پھلجھڑیاں سی پھوٹتی دیکھی تھیں۔ دھماکہ بھی سنائی دیا تھا۔'' حنا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں تمہیں اس مشن کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔''

''شکریہ.....'' دل شیر بولا۔ ''کیا تمہیں معلوم تھا کہ ہم آج رات کیا کرنے والے ہیں؟''

''ہاں.....لیکن شاہ رُخ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم لوگ یہاں آؤ گے۔'' حنا بولی۔

''کیا یہاں چائے وغیرہ کا سامان ہوگا؟ بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔'' دل شیر نے کہا۔

''ہونا تو چاہئے..... میں دیکھتی ہوں۔'' حنا کہتی ہوئی پچھلے دروازے سے کچن میں داخل ہو گئی۔ اُس کی واپسی میں پندرہ منٹ لگے۔ وہ چائے بنا لائی تھی۔ اُس نے ایک ایک کپ دونوں کو دے دیا اور ایک خود لے لیا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ صورتحال پر گفتگو کرنے لگے۔

رات دو بجے کے لگ بھگ حنا، اونگھنے لگی تو طارق اور دل شیر بھی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ دل شیر تو صوفے پر لیٹ گیا کر سو گیا۔ لیکن طارق، کرسی پر بیٹھا اپنی آج کی اس کارروائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا، جو اُسے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

☆

صبح ناشتہ کر کے وہ اُس مکان سے نکل گئے۔ حنا وہیں رہ گئی تھی۔ اُن کی گاڑی گلی میں اُسی جگہ موجود تھی جہاں رات کو کھڑی کی تھی۔ البتہ گلی کے چند ننگ دھڑنگ بچے گاڑی پر چڑھے ہوئے تھے۔ اُنہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر بچے بھاگ گئے۔ دل شیر نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور دونوں اندر بیٹھ گئے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ شاہ رُخ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ شاہ رُخ، ڈرائنگ رُوم میں ٹہل رہا تھا۔ ایک صوفے پر مراد علی بھی بیٹھا ہوا تھا اور کافی ٹیبل پر انگریزی کا ایک اخبار رکھا ہوا تھا۔

''مشن کی کامیابی پر ہم دونوں کی طرف سے مبارک ہو شاہ رُخ!'' دل شیر نے ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوتے ہی کہا۔

''ہماری یہ کارروائی تو کامیاب رہی۔ لیکن مشن مکمل طور پر ناکام رہا۔'' شاہ رُخ نے کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' طارق نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''تم لوگوں نے ابھی تک شاید اخبار نہیں دیکھا۔'' شاہ رُخ نے میز پر پڑے ہوئے اخبار کی طرف اِشارہ کیا۔ ''گزشتہ رات طارق نے جس جہاز کو میزائل کا نشانہ بنایا تھا، وہ اسرائیلی طیارہ نہیں تھا بلکہ انڈین ایئر لائن کا ایک کارگو جہاز تھا جسے پالم ایئر پورٹ کی بجائے صفدر جنگ ایئر پورٹ پر اُترنے کے لئے کہا گیا تھا۔ طیارے کی تباہی میں کریو کے چار آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔''

''اور وہ اسرائیلی طیارہ.....؟'' طارق نے سوال کیا۔

''اپنے مقررہ وقت پر پالم ایئر پورٹ پر اُتر گیا۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ ''اخبار کی اطلاع کے مطابق ایک غیر ملکی طیارے سے بعض اہم شخصیات دہلی آنے والی تھیں۔ رازداری کے خیال سے اُن کا طیارہ صفدر جنگ ایئر پورٹ پر اُتارا جانے والا تھا۔ لیکن عین وقت پر طیارے کے پائلٹ کو پالم انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ٹھیک اُسی وقت کلکتہ سے انڈین ایئر لائن کی ایک کارگو فلائٹ بھی پہنچ رہی تھی۔ اُس کارگو طیارے کو صفدر جنگ ایئر پورٹ پر

اُترنے کے لئے کہا گیا۔ اُس طیارے کے لینڈ کرنے سے ایک منٹ پہلے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور فضا ہی میں طیارے کے پرخچے اُڑ گئے۔ یہ راز بھی کھل چکا ہے کہ اس طیارے کو میزائل سے تباہ کیا گیا ہے۔ حکام کو صفدر جنگ کے مقبرے کی چھت سے راکٹ لانچر بھی مل گیا ہے اور اب اُن تخریب کاروں کو تلاش کیا جا رہا ہے، جنہوں نے طیارے کو تباہ کیا ہے۔''

طارق نے میز پر سے اخبار اُٹھا لیا۔ وہ ہندوستان ٹائمز تھا۔ پہلے صفحہ کی ہیڈ لائن، انڈین ایئر لائن کے طیارے کی تباہی سے متعلق تھی۔ طیارے کے بکھرے ہوئے ملبہ کی چند تصویریں بھی تھیں۔ طارق، خبر پڑھتا چلا گیا۔ خبر کا متن وہی تھا جس کا خلاصہ شاہ رُخ بیان کر چکا تھا۔ اُس نے اخبار میز پر ڈال دیا۔ اُس کے چہرے پر مایوسی اُبھر آئی۔

''پریشان نہ ہو میرے دوست.....!'' شاہ رُخ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کارکردگی بڑی شاندار تھی۔ ہماری اس ناکامی نے بھی بھارتی حکام کو تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیا ہے۔ وہ لوگ سمجھ چکے ہیں کہ ہم بھی غافل نہیں ہیں۔ اس مرتبہ ہمیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی ہے۔ لیکن اب جو کارروائی کی جائے گی، اس میں ناکامی نہیں ہوگی۔ تم لوگ ایک دو روز تک انڈر گراؤنڈ رہو گے۔ بہتر ہوگا کہ اس کوٹھی تک ہی محدود رہو۔ انٹیلی جنس اور پولیس، تخریب کاروں کی تلاش میں ہے۔ کئی مشتبہ افراد کو حراست میں لیا جا چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں آ جائے۔''

''پرکاش نے ہمارے ساتھ دھوکہ تو نہیں کیا.....؟'' طارق نے کہا۔

''نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتا۔'' شاہ رُخ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ہمارے ساتھ دھوکہ کر کے وہ اپنے آپ کو تباہ کرنا نہیں چاہے گا۔ اُس نے اسرائیلی طیارے کی آمد کے بارے میں ہمیں جو اطلاع فراہم کی تھی، وہ بالکل درست تھی۔ یہ تو اخبار میں بھی لکھا گیا ہے کہ اہم غیر ملکی شخصیات کے طیارے کا رُخ عین لمحات میں پالم انٹرنیشنل ایئر پورٹ کی طرف موڑا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم پرکاش کو کوئی الزام نہیں دے سکتے۔''

''لیکن میرے خیال میں اُس پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔'' طارق بولا۔

''اُس پر نگاہ رکھنے کے لئے گلاب دین موجود ہے۔'' شاہ رُخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گلاب دین، پرکاش کا قابل اعتماد دوست ہے۔ وہ گلاب دین کو بھی مظلوم سمجھتا ہے۔ اُس کے خیال میں گلاب دین بھی اُسی کی وجہ سے پھنسا تھا۔ وہ اپنی کوئی بات، گلاب دین سے نہیں چھپاتا۔ اُس کی طرف سے ہمیں زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں۔ ہمیں گلاب دین سے ہر بات معلوم ہوتی رہے گی۔'' شاہ رُخ نے خاموش ہو کر گھڑی دیکھی، پھر بولا۔ ''تم لوگ اب آرام

کرو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ واپسی کے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔''

شاہ رُخ باہر چلا گیا۔ وہ تینوں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شاہ رُخ جب واپس پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ صرف طارق جاگ رہا تھا۔

''کیا بات ہے..... نیند نہیں آ رہی؟'' شاہ رُخ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یونہی، کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''میں، تمہاری اس بے چینی کی وجہ سمجھ رہا ہوں۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ ''آج مجھے اُس مقام کا بھی پتہ چل گیا ہے، جہاں دہشت گردی اور چھاپہ مار جنگ کی تربیت کے لئے کیمپ قائم کیا جا رہا ہے۔ پرسوں صبح اس کیمپ میں باقاعدہ ٹریننگ شروع ہو رہی ہے۔ ہم پرسوں صبح صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اسی رات اپنی کارروائی کریں گے۔''

''یہ کیمپ کہاں لگایا جا رہا ہے.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''دریائے جمنا کے دوسرے کنارے۔'' شاہ رُخ نے جواب دیا۔ ''میری اطلاع کے مطابق کھیتوں کے درمیان کئی ایکڑ رقبے کو کیمپ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ چاروں طرف خاردار تاریں لگائی گئی ہیں اور بڑے سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ کسی عام آدمی کو اُس طرف جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

''گڈ.....'' طارق بولا۔ ''میں اپنی کل کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں۔ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا۔''

''اب تم سو جاؤ!'' شاہ رُخ نے کہا۔ ''بمبئی سے میرے کچھ دوست آئے ہوئے ہیں۔ اُن کی فیملیاں بھی ساتھ ہیں۔ صبح تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام بنا ہے۔ تم لوگ بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ پکنک ہو جائے گی۔''

شاہ رُخ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ طارق اُس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک جاگتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔

صبح آٹھ بجے وہ لوگ گھروں سے نکل گئے۔ مراد علی اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ البتہ راستے میں ایک جگہ سے حنا کو ساتھ لے لیا گیا۔ حنا کو لینے کے بعد وہ سیدھے ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ پر واقع اوبیرائے ہوٹل پہنچے جہاں شاہ رُخ کے دوست ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ دو خاندان تھے۔ جن میں تین مرد، پانچ عورتیں اور چار بچے شامل تھے۔ دو عورتیں، شاہ رُخ کے ادھیڑ عمر دوستوں کی بیویاں تھیں، باقی تین جوان لڑکیاں تھیں۔

رمیش اگروال اور دیتو رام، شاہ رُخ کے دوست تھے۔ اُن کا شمار بمبئی کے معززین میں ہوتا

تھا۔ شاہ رُخ سے اُن کے دیرینہ کاروباری تعلقات تھے۔ کل وہ لوگ اپنے کنبوں کو لے کر
آئے تھے اور اُن سے ملاقات کے بعد ہی شاہ رُخ نے تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام بنایا تو
شاہ رُخ نے گزشتہ رات ہی کوسٹر وین کا انتظام کر لیا تھا۔ وہ کوسٹر بھی پہنچ چکی تھی۔ شاہ رُخ
اپنی کار ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دی اور سب لوگ، کوسٹر میں بیٹھ گئے۔

اُن کا یہ ٹور نظام الدین اولیاء کے مزار سے شروع ہوا اور پھر نیشنل آرٹ گیلری، لودھی
مقبرہ، پارلیمنٹ ہاؤس، لکشمی نارائن مندر، جامعہ مسجد، لال قلعہ اور انڈیا گیٹ سے ہوتے ہوئے
وہ جمنا کے کنارے پرانے قلعہ پہنچ گئے۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ یہاں ایک گائیڈ
مل گیا جو اُنہیں پرانے قلعے کی سیر کے دوران مختلف مقامات کے بارے میں بتاتا رہا۔ قلعے کا
زیادہ تر حصہ کھنڈروں میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

آخر میں وہ قلعے کے اُس حصے میں آ گئے جو دریا کے رُخ پر تھا۔ قلعے میں داخلے کا اصل راستہ
دراصل اسی طرف سے تھا۔ وہ لوگ فصیلوں پر گھومتے رہے۔ فصیل سے جمنا اور اُس کے دوسری
طرف کا علاقہ دُور دُور تک صاف نظر آ رہا تھا۔

''جمنا کے اُس پار کچھ سرگرمیاں نظر آ رہی ہیں۔ اُس علاقے کو غور سے دیکھ لو! وہی ٹریننگ
کیمپ ہے۔'' شاہ رُخ نے طارق کے کان میں سرگوشی کی اور دوسری طرف نکل گیا۔

طارق، فصیل پر ٹہلتے ہوئے جمنا کے اُس پار دیکھتا رہا۔ وسیع و عریض کیمپ اُس کے سامنے
تھا..... اور وہ ایک بار پھر اپنے آپ میں عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔

جب وہ پرانا قلعہ سے باہر نکلے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے اور
بعض دوسری تاریخی عمارتوں کی سیر کا پروگرام بھی آج ہی کی فہرست میں تھا۔ لیکن شام ہو جانے
کی وجہ سے یہ پروگرام کل پر اُٹھا دیا گیا۔ اور یہ لوگ ہوٹل واپس روانہ ہو گئے۔

مہمانوں کو ہوٹل چھوڑنے کے بعد شاہ رُخ، طارق وغیرہ کو لے کر اپنی کوٹھی پر واپس آ گیا۔
اس وقت تک سات بج گئے تھے۔ شاہ رُخ بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔
اور پھر ساڑھے سات بجے جب گلاب دین کوٹھی میں داخل ہوا تو اُسے دیکھ کر شاہ رُخ کے
چہرے پر طمانیت سی دوڑ گئی۔

''آؤ گلاب دین! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کیا رپورٹ ہے.....؟'' شاہ رُخ نے
ڈرائنگ رُوم میں اُس کا استقبال کیا۔ اس وقت ڈرائنگ رُوم میں طارق اور دل شیر وغیرہ بھی
موجود تھے۔

''کیمپ میں تین سو آدمی ہیں۔ اُنہیں انڈین آرمی کے سپیشل گروپ سے منتخب کیا گیا ہے۔

گوریلا جنگ کے ماہر ہیں۔ لیکن اسرائیلی ماہرین اُنہیں خصوصی تربیت دیں گے۔ ان سب کی
رہائش بھی ٹریننگ کے اختتام تک کیمپ کے خیموں میں رہے گی۔ اسرائیلی ماہرین کی تعداد پندرہ
ہے۔ اُن میں سے چھ، کیمپ میں رہیں گے، باقی نو کی رہائش کا انتظام شہر کے فائیو سٹار ہوٹلوں
میں کیا گیا ہے۔ کیمپ میں رہنے والے اسرائیلی ماہرین کے لئے بھی خیمے ہی لگائے گئے ہیں۔
اس وقت کیمپ میں تقریباً ساڑھے تین سو آدمی موجود ہیں۔ تین سو ٹریننگ حاصل کرنے والے
اور باقی کا تعلق مختلف انتظامی امور سے ہے۔ صبح چھ بجے ٹریننگ کا باقاعدہ آغاز ہو گا۔'' گلاب
دین نے تفصیل سے بتایا۔

''پرکاش کو تم پر شبہ تو نہیں ہوا.....؟'' شاہ رُخ نے پوچھا۔

''نہیں.....'' گلاب دین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بلکہ وہ مجھ پر پہلے سے زیادہ اعتماد کرنے لگا
ہے۔ یہ ساری باتیں اُس نے مجھے خود بتائی تھیں۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔
دراصل! کیمپ سے متعلق تمام اعداد و شمار آج ہی اسرائیلی سفارت خانے کو بھیجے گئے ہیں۔ اور وہ
فائل، پرکاش کے ہاتھوں سے ہی گزری تھی۔ جس سے اُسے یہ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ مجھے تو وہ
اب بھی مظلوم ہی سمجھتا ہے۔''

''گڈ.....!'' شاہ رُخ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''کچھ اور.....؟''

''کیمپ کے چاروں طرف بڑے سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ چوبیس گھنٹے گشت کا
نظام بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ کسی کو اُس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' گلاب دین نے
بتایا۔

''ہم نے جو منصوبہ بنایا ہے، اس کے مطابق ہمیں کیمپ میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں
ہو گی۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ اُن کے تمام حفاظتی انتظامات انشاء اللہ دھرے کے دھرے رہ جائیں
گے۔''

''پروگرام کیا ہے.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''پروگرام.....!'' شاہ رُخ باری باری اُن سب کی طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''ہم رات دس
بجے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ جب مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ کیمپ، جمنا کے دوسرے
کنارے پر لگایا گیا ہے تو اُسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا تھا۔ اُسی خیال کے تحت
میں نے کل دن میں دو تین مقامات کا جائزہ لیا تھا۔ پرانا قلعہ وہ جگہ ہے، جو ہمارے مقصد کے
لئے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ جمنا کے دوسرے کنارے ٹریننگ کیمپ، پرانا قلعہ
کے بالکل سامنے ہے۔ قلعے کی فصیل سے بڑی آسانی سے کیمپ پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ تم لوگوں کو

مہمانوں کے ساتھ میں اس لئے لے گیا تھا کہ تم لوگ وہاں کا اچھی طرح جائزہ لے لو۔''

''بہت خوب.....!'' طارق بولا۔ ''قلعے کی فصیل حملے کے لئے بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچا کیسے جائے گا.....؟ میرا مطلب ہے محافظ وغیرہ.....''

''رات کے وقت وہاں بھوتوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ کوئی ذی ہوش انسان رات کے اندھیرے میں اُس طرف جانے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ ہم قلعے میں داخل ہونے کے لئے وہ راستہ استعمال کریں گے جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔'' شاہ رُخ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر اُنہیں منصوبے کی تفصیلات سمجھانے لگا۔ اُس نے ایک بار پھر نقشہ میز پر پھیلا لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''طارق! تم گلاب دین کے ساتھ ٹھیک آٹھ بجے وین پر یہاں سے نکلو گے اور ہمایوں کے مقبرے کے قریب سے ہوتے ہوئے اس جگہ گھاٹ پر پہنچو گے۔'' اُس نے ایک جگہ اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ گھاٹ بہت عرصے سے ویران پڑا ہے۔ یہاں مراد علی، کشتی پر تم لوگوں کا منتظر ہوگا۔ تم لوگ وین کا سامان کشتی پر لاد کر قلعے کی طرف جاؤ گے۔ قلعے کے گیٹ سے تقریباً پچاس گز آگے فصیل میں شگاف ہے۔ دریا کے کنارے گنجان سورختوں کی وجہ سے یہ شگاف عام لوگوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہے۔ تم لوگ فصیل کے اس شگاف کے راستے قلعے میں داخل ہوگے۔ شگاف کے دوسری طرف میں اور دل شیر تمہارے منتظر ہوں گے۔ وہاں سے ہم فصیل پر پہنچیں گے اور اس کے بعد ہماری کارروائی شروع ہوگی۔ سب لوگ سمجھ گئے.....؟''

سب نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے طارق اور گلاب دین، سیاہ رنگ کی ایک وین میں کوٹھی سے نکل گئے۔ وین کے شیشے بھی سیاہ تھے اور اُس کی نمبر پلیٹ بمبئی کی تھی جو جعلی تھی۔ وین کے پچھلے حصے میں لکڑی کے چار لمبوترے بکس رکھے ہوئے تھے۔ اُن پر پرانا سا ترپال پڑا ہوا تھا۔ سٹیئرنگ کے سامنے گلاب دین بیٹھا ہوا تھا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ ہندو غاصبوں کے خلاف اس گروپ کا ساتھ دے رہا تھا۔ اُس نے شاہ رُخ کو اگرچہ بہت سی معلومات فراہم کی تھیں۔ لیکن کسی عملی کارروائی میں وہ پہلی مرتبہ حصہ لے رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن خاصی تیز تھی۔ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں، پسینے سے تر ہو رہی تھیں۔ وہ بار بار ہتھیلیاں اپنے کپڑوں پر رگڑ رہا تھا۔

وین، مولانا آزاد روڈ سے نکل کر شاہجہاں روڈ کو قطع کرتی ہوئی گولف کورس کے اُوپر سے چکر کاٹ کر ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ پر پہنچ گئی۔ اور وہاں سے ہمایوں کے مقبرے کی طرف مُڑ گئی۔ مقبرے سے آگے نکل جانے کے بعد وہ اُس کچے راستے پر مُڑ گئی جو، جمنا کی طرف چلا گیا تھا۔

اُس سڑک پر آتے ہی گلاب دین نے وین کی تمام بتیاں بجھا دی تھیں۔ تاریکی اور کچا راستہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت محتاط ہو کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

آگے اُونچی جھاڑیاں اور درخت شروع ہو گئے تھے۔ گلاب دین اب مزید محتاط ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں میں تقریباً دو فرلانگ کا راستہ طے کرنے کے بعد اُس نے ایک جگہ وین روک لی اور طارق کو وہیں رُکنے کا اشارہ کر کے وین سے اُتر کر جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ طارق، وین سے اُتر کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تاریکی میں حشرات الارض کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔

تقریباً دس منٹ بعد دو سائے جھاڑیوں سے نکل کر وین کے قریب پہنچ گئے۔ بلی کی آواز سن کر طارق بھی اُن کے قریب آ گیا۔ وہ گلاب دین اور مراد علی تھے۔ وہ لوگ وین کے پچھلے حصے میں سے ایک ایک بکس اُٹھا کر جھاڑیوں میں گھستے چلے گئے۔ تقریباً پچاس گز آگے جھاڑیوں کے اختتام پر وہ گھاٹ تھا، جہاں کشتی کھڑی تھی۔ تینوں بکس ایک کشتی میں رکھ دیئے گئے۔ چوتھے بکس کے لئے گلاب دین کو ایک اور چکر لگانا پڑا۔

اُن کے کشتی میں سوار ہوتے ہی مراد علی نے چپو سنبھال لئے اور آہستہ آہستہ کشتی کھینے لگا۔ پانی میں چپوؤں کی آواز سناٹے میں دُور تک پھیل رہی تھی۔ مراد علی، کشتی کو کنارے کے قریب رکھے ہوئے تھا، تاکہ درختوں کی تاریکی کی آڑ رہے۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ قلعے کے گیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ قلعے کا گیٹ قدرے بلندی پر تھا۔ لیکن اُس کے عین سامنے دریا کے کنارے درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ کشتی درختوں کے سائے میں ہولے ہولے بہتی رہی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مراد علی نے کشتی کا رُخ کنارے کی طرف موڑ دیا۔ کشتی کا اگلا حصہ درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں میں گھستا چلا گیا۔

یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ مراد علی نے کشتی کی رسّی ایک درخت کی شاخ سے باندھ دی اور وہ تینوں پانی میں اُتر آئے۔ اُنہوں نے ایک ایک بکس اُٹھا لیا۔ چوتھے بکس کے لئے گلاب دین کو ایک بار پھر چکر لگانا پڑا۔

قلعے کی فصیل، دریا کے کنارے سے تقریباً بیس فٹ دُور تھی۔ اور وہاں تک قدآدم جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جھاڑیوں میں اُلجھتے ہوئے قلعے کی فصیل تک پہنچ گئے۔ دوسری طرف پہنچنے میں اُنہیں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی جہاں دل شیر اور شاہ رُخ اُن کے منتظر تھے۔

قلعے کی فصیل پر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو امتدادِ زمانہ سے ٹوٹ چکی تھیں

لیکن ان کے ذریعے فصیل تک پہنچا جا سکتا تھا۔ وہ فصیل پر ایک جگہ رُک گئے۔ فصیل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اُوپر سے نیچے کی طرف لمبے لمبے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ سوراخ تھے جہاں سے پرانے زمانے میں قلعے کے سپاہی، دُشمنوں پر تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ ایک جگہ فصیل کا اُوپر کا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ طارق وہاں کھڑا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ جمنا کے اُس پار روشنیوں کا قدرے پھیلا ہوا ایک جھنڈ سا نظر آ رہا تھا۔ یہ ٹریننگ کیمپ کی روشنیاں تھیں.....

شاہ رُخ اور طارق نے لکڑی کے بکس کھول لئے اور اُن میں سے راکٹ لانچر نکال کر جوڑنے لگے۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ چاروں لانچروں میں سٹنگر فٹ کر چکے تھے۔ اس وقت دس بجنے والے تھے۔ شاہ رُخ، طارق، مراد علی اور دل شیر نے ایک ایک راکٹ لانچر اُٹھا کر اپنے اپنے کندھوں پر لاد لیا اور ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اُن کے فوکس سیٹ کرنے لگے۔ گلاب دین اُن سے کچھ فاصلہ پر کھڑا قلعے کی ویرانی کو گھور رہا تھا۔

''ایوری باڈی ریڈی.....؟'' شاہ رُخ نے کہا۔ اُس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

''یس.....!'' طارق نے اپنے باقی ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے میں فائر کروں گا۔ اس کے فوراً بعد ہی تم لوگ بھی میزائل داغ دو گے۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ اور پھر ایک منٹ بعد فضا، دھماکے کی آواز سے گونج اُٹھی۔

لانچر سے نکلا ہوا میزائل، روشنی کی لکیر چھوڑتا ہوا دریائے جمنا عبور کر کے ٹریننگ کیمپ کے عین وسط میں گرا..... اس کے فوراً ہی بعد وقفے وقفے سے تین اور میزائل فائر ہوئے..... یہ تینوں میزائل، کیمپ میں مختلف جگہوں پر گرے۔ دھماکوں کے ساتھ ہی کیمپ میں مختلف جگہوں سے آگ کے شعلے اُٹھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

اُنہوں نے راکٹ لانچر، فصیل پر پھینک دیئے اور فصیل سے اُترنے کے لئے شکستہ سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ وہ فصیل کے شگاف کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی..... سناٹے میں یہ آواز، دھماکے پیدا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ طارق اور اُس کے ساتھیوں نے جیبوں سے پستول نکال لئے۔ لیکن وہ رُکے نہیں۔

''رُک جاؤ..... ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔'' دائیں طرف ایک بھاری آواز سن کر اُن کے قدم رُک گئے۔

طارق کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ پولیس والے تھے جنہوں نے اُن پر رائفلیں تان رکھی تھیں۔ طارق کے ساتھیوں نے پولیس والوں پر بیک وقت فائر کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے شگاف کی طرف چھلانگیں لگا دیں۔ سب سے پہلے گلاب دین، اُس کے پیچھے شاہ رخ، پھر شیر دل اور اُس کے بعد طارق نے چھلانگ لگائی۔ مراد علی سب سے پیچھے تھا۔ پولیس والوں نے بھی فائر کھول دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں مراد علی کی چیخ کی آواز گونج اُٹھی۔ اُس کا جسم چھلنی ہو گیا تھا۔ وہ طارق سے ایک گز پیچھے گرا۔ طارق نے مُڑ کر اُسے پکڑنا چاہا۔ مگر پولیس والے زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔

''بھاگ جاؤ..... تم بھاگ جاؤ!'' مراد علی چیخا۔

طارق نے شگاف میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ٹانگ میں انگارے بھر گئے ہوں۔ وہ فصیل کے دوسری طرف ڈھلان پر خاردار جھاڑیوں میں لڑھکتا چلا گیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو کندھے پر ایک اور گولی لگی۔ وہ چیختا ہوا جھاڑیوں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....

☆

وہ ڈھلان پر خاردار جھاڑیوں میں لڑھکتا ہوا، دریا کے کنارے پر پہنچ کر جھاڑیوں میں اٹک گیا۔ اُس کا سر ڈھلان کی نچلی طرف تھا اور پیر اُوپر۔ اُس کا ایک پیر، جھاڑیوں میں پھنس گیا تھا اور نیچے سر دریا کے پانی کو چھو رہا تھا۔ کنارے کی جھاڑیوں کے ملنے سے پانی میں لہریں سی اُٹھیں اور اُس کا سر پوری طرح پانی میں ڈوب گیا۔ کندھے پر گولی لگنے سے طارق کے ذہن پر تاریکی سی چھا گئی تھی۔ لیکن سر، یخ بستہ پانی میں ڈوبنے سے اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے سر اُوپر اُٹھایا۔ اور اُس کے ذہن پر چھائی ہوئی دُھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ پچھلے چند سیکنڈ نے اُس کا ذہن بری طرح ماؤف کر دیا تھا اور وہ تاریکی میں گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ دفعتہً ایک زوردار دھماکہ ہوا..... وہ رائفل کے فائر کی آواز تھی۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ یہ گولی قلعے کی فصیل کی طرف سے چلائی گئی تھی۔ اُس نے آہستگی سے گردن گھما کر دیکھا۔ تاریکی اور جھاڑیوں میں کچھ دکھائی تو نہیں دیا، البتہ دوڑتے ہوئے قدموں اور باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پولیس والے چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو احکامات دے رہے تھے۔ طارق اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ اور پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے محاذ کھل گیا ہو۔ قلعے کی فصیل کی طرف سے زبردست فائرنگ کی جا رہی تھی۔ فائرنگ کا رُخ دریا میں جھاڑیوں کی طرف تھا۔ گولیاں طارق کے سر کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔ طارق نے نیچے کی طرف سرکنا چاہا۔ مگر اُس کا پیر جھاڑی میں پھنسا ہوا تھا اور وہ خود سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا دیئے اور جسم کو ذرا پیچھے کھینچ کر اپنا پیر جھاڑی سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے

کندھے پر دباؤ پڑا تو اُس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اُس نے تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہاتھوں پر مزید دباؤ ڈال کر جسم کو کچھ اور پیچھے کھینچا اور پیر کو جھٹکنے دینے لگا۔ تین چار کوششوں میں اُس کا پیر جھاڑی کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ اس کوشش میں جھاڑیوں میں تیز سرسراہٹ ہوئی تھی۔ لیکن طارق کو یقین تھا کہ فائرنگ کی آواز میں جھاڑیوں کی آواز نہیں سنی گئی ہوگی۔ وہ سیدھا ہو کر نیچے کی طرف سرکنے لگا۔

اچانک فائرنگ بند ہوگئی اور پولیس پارٹی کا انچارج چیخ چیخ کر اپنے ماتحتوں کو حکم دینے لگا۔

''تم لوگ کنارے کے ساتھ ساتھ دونوں طرف پھیل جاؤ۔ وہ لوگ انہی جھاڑیوں میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ اُنہیں بچ کر نہیں جانا چاہیئے۔''

کنارے پر دونوں طرف بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ طارق پانی کے بالکل کنارے پر تھا جہاں سرکنڈے کی جھاڑیاں تھیں۔ وہ دریا کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ کیمپ میں اب بھی کئی مقامات سے شعلے اُٹھ رہے تھے اور شور کی آوازیں بھی یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

''ہم نے دونوں طرف بیس بیس گز تک جھاڑیوں میں دیکھ لیا ہے سر! کسی کی موجودگی کے آثار نہیں ہیں۔ شاید وہ لوگ تیرتے ہوئے کہیں دُور نکل گئے ہیں۔'' یہ آواز سن کر طارق چونک گیا۔ ایک پولیس والا اپنے آفیسر کو رپورٹ دے رہا تھا۔

''اُن میں سے ایک کو کم از کم دو گولیاں لگی ہیں۔ وہ دریا میں تیر کر نہیں جا سکتا۔ اُسے میں نے اس طرف جھاڑیوں میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس جگہ جھاڑیوں میں چیک کرو! ممکن ہے، کہیں ڈُبکا پڑا ہو یا کہیں بے ہوش پڑا ہوا ہو۔'' آفیسر نے حکم دیا۔

طارق کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا اور اُس کے پورے جسم میں شدید سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس نے جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دریا میں پانی کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اُن کی نگاہوں سے چھپ سکتا تھا۔ لیکن پانی میں چھپنے کا خیال بھی احمقانہ تھا۔ دریا میں تیر کر فرار کی کوشش بھی خودکشی کے مترادف تھی۔ ... اُسے گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

جھاڑیاں ہلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی، جس کا مطلب تھا کہ پولیس والے اب جھاڑیوں میں گھس رہے تھے۔ پکڑے جانے کے خوف کی شدت سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورنے لگا۔ اچانک اُس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اُس نے سرکنڈے کی ایک شاخ توڑ لی۔ سرکنڈے کی پتلی سی شاخ کسی نلکی کی طرح اندر سے کھوکھلی تھی۔ وہ سرکنڈے کی اُس شاخ کا ایک سرا منہ میں دبا کر بڑی آہستگی سے پانی میں اُتر گیا۔ شاخ کا دوسرا سرا پانی سے باہر تھا۔ وہ پانی میں بیٹھا اُس شاخ نما نلکی کے

ذریعے سانس لیتا رہا۔ پولیس والے تقریباً پانچ منٹ تک جھاڑیوں میں گھومتے رہے، پھر واپس چلے گئے۔

''یہاں بھی کوئی نہیں ہے سر!'' اُسے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ''ممکن ہے اُسے لگنے والی گولیوں کے زخم زیادہ گہرے نہ ہوں۔ یا اُسے کوئی گولی ہی نہ لگی ہو اور وہ بھی دریا میں تیرتا ہوا دُور نکل گیا ہو۔''

''میں نے خود اُس کی چیخ کی آواز سنی تھی۔ خیر...... بسنت سنگھ! تم یہیں رُکو! اور لکشمی نارائن! تم پولیس سٹیشن جا کر اطلاع کر دو کہ انسپکٹر شکلا کا کہنا ہے کہ دریا کے اس کنارے پر اُوپر سے نیچے دُور تک ناکہ بندی کر دی جائے۔ دریا کی طرف سے آنے والے ہر شخص کو روک کر سختی سے باز پرس کی جائے۔''

''یس سر......!'' یہ غالباً لکشمی نارائن کی آواز تھی۔

طارق نے بڑی آہستگی سے سر، پانی سے نکالا سرکنڈے کی نلکی منہ سے نکال کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پولیس والے، قلعے کی فصیل کے شگاف میں چلے گئے تھے۔ شگاف کے دوسری طرف مراد علی کی لاش پڑی تھی۔ طارق سوچ رہا تھا کہ اگر اُسے شناخت کر لیا گیا یا اُس کے لباس میں سے کوئی ایسی چیز مل گئی جس کے ذریعے دوسروں کا سراغ مل سکے تو وہ بچ نہیں سکیں گے۔

طارق کے لئے رات بھر یہاں بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ کوئی پولیس پارٹی مدد کے لئے بھیج دی جائے اور روشنیوں وغیرہ کے انتظام کے ساتھ یا کشتیوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر تلاش شروع کر دی جائے۔ ایسی صورت میں وہ چوہے کی طرح پکڑ لیا جائے گا۔

اُس نے تاریکی میں چاروں طرف دیکھا۔ اور پھر پانی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ کم از کم ایک پولیس والا کنارے پر موجود ہے۔ پانی کی ہلکی سی آواز بھی اُسے متوجہ کر سکتی تھی۔ اس لئے وہ بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

دریا کے کنارے پر جھاڑیوں اور درختوں کی لمبی لمبی شاخیں پانی میں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اُن کی آڑ میں آہستہ آہستہ پانی میں رینگتا رہا۔ تقریباً دس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ پانی میں جھکی ہوئی شاخوں کے جھنڈ سے جیسے ہی دوسری طرف پہنچا، اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ یہاں وہ کشتی موجود تھی جس پر وہ لوگ یہاں تک آئے تھے۔ اُسے کشتی دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ شاہ رُخ اور اُس کے ساتھی کس طرح فرار ہوئے تھے؟ یہ خیال اُس کے ذہن میں بار بار اُبھر رہا تھا۔ اُس نے سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا اور بڑی احتیاط سے درخت کی شاخ سے بندھی ہوئی کشتی کی رسّی کھولنے لگا۔

وہ کشتی میں بیٹھ کر چپو نہیں چلا سکتا تھا۔ کیونکہ چپوؤں کی آواز پولیس والوں کو فوراً ہی طرف متوجہ کر دیتی۔ وہ کشتی کو بہت آہستہ آہستہ پانی میں دھکیلنے لگا۔ اُس نے دریا میں کھلی جگہ آنے کی کوشش نہیں کی بلکہ درختوں اور جھاڑیوں کے سائے میں آگے بڑھتا رہا۔ کشتی اگرچہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن خاصی وزنی تھی۔ کندھے کے زخم کی وجہ سے بھی اُسے خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ یہ تکلیف، اذیت ناک موت کے مقابلے میں قابل برداشت تھی۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کشتی میں سوار ہو گیا اور آہستہ آہستہ اُسے کھینے لگا۔ ٹانگ اور کندھے کے زخم سے خاصا خون بہہ چکا تھا۔ اب وہ شدید کمزوری سی محسوس کرنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے آپ کو ہوش و حواس میں رکھنے ہی میں زندگی تھی۔ وہ اس مقصد کے لئے بے پناہ قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

طارق جانتا تھا کہ اگر وہ اسی طرح دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے تو راج گھاٹ پہنچ جائے گا۔ لیکن راج گھاٹ وہاں سے بہت دُور تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ زخموں کی وجہ سے اُس کے لئے وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اور پھر اگر پولیس نے ناکہ بندی کر دی تو وہ بچ نہیں سکے گا۔

تقریباً چار سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کشتی کو کنارے پر لے آیا۔ یہاں بھی جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات تھی۔ وہ کشتی سے اُتر کر درختوں میں گھس گیا۔ لیکن کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لڑکھڑانے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بار بار تاریکی چھا رہی تھی۔ وہ بار بار سر کو جھٹکتا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کسی نہ کسی طرح درختوں سے نکل کر وہ سڑک پر آ گیا۔ یہ رنگ روڈ تھا جو کوٹلہ فیروز شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اُس سڑک پر چلنے لگا۔ آگے ہر طرف روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ شہر کی روشنیاں تھیں۔ وہ سڑک پر چل رہا تھا۔ اُسے اس بات کا بھی احساس نہیں رہا تھا کہ اُسے زخمی حالت میں دیکھ کر کوئی شبہے میں پڑ سکتا ہے یا پولیس کی کسی گشتی پارٹی کی نظروں میں بھی آ سکتا ہے۔ وہ ہر خیال سے عاری سڑک پر چلتا رہا۔ اب اُس کے لئے سڑک پر قدم جما کر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے شراب کی کئی بوتلیں چڑھا رکھی ہوں۔ ٹانگ اور کندھے کا زخم اب بہت زیادہ تکلیف دینے لگا تھا۔ سردی کی وجہ سے تکلیف کا احساس دوچند ہو گیا تھا۔ کمزوری بڑھ رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دُھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا سڑک پر گر گیا۔ اُس کے ذہن پر چھائی ہوئی تاریکی، گہری ہوتی چلی گئی۔ ذہن پر مکمل

تاریکی چھانے سے پہلے آخری مرتبہ اُسے یوں لگا تھا جیسے کہیں دُور سے کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اُسے تھپکیاں سی دینے لگی اور اُس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا.....

جب اُسے ہوش آیا تو وہ ایک نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے حرکت کرنا چاہی تو منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ تب اُسے احساس ہوا کہ اُس کے جسم پر قمیص نہیں تھی اور نہ ہی وہ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اُوپر کا جسم برہنہ تھا۔ کندھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم کے نچلے حصے پر چیک دار چادر کی لنگی تھی اور بائیں ران پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تکلیف کی شدت کم کرنے کے لئے اُس نے دانت بھینچ لئے اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔

چند منٹ بعد جب تکلیف کا احساس کچھ کم ہوا تو وہ لیٹے ہی لیٹے گردن گھما کر اِردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ چھت سے لٹکا ہوا غالباً ساٹھ واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ ایک کھونٹی پر چند زنانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ایک سفید جوڑا بھی الگ ٹنگا ہوا تھا۔ دیوار کے قریب ایک بہت ہی پرانی سی ڈریسنگ ٹیبل پڑی تھی، جس کا آدھا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سستا سا میک اَپ کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ٹیبل کے سامنے لکڑی کا ایک پرانا سا سٹول بھی رکھا ہوا تھا۔

دوسری دیوار پر ایک کیلنڈر لٹکا ہوا تھا جس پر ایک خوبصورت بچے کی تصویر تھی۔ طارق جس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، وہ بھی جھلنگا سی تھی۔ اُس پر بچھا ہوا بستر بھی میلا تھا۔ اُس کمرے کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خوش حالی اس کے مکینوں کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اور کھونٹی پر ٹنگے ہوئے زنانہ ملبوسات یہ ثابت کر رہے تھے کہ یہ کمرہ کسی عورت کے استعمال میں تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر تاریکی تھی۔ یکایک طارق کو ناگوار سی بو کا احساس ہوا۔ یہ غالباً گوبر وغیرہ کی بو تھی جو کھلے ہوئے دروازے سے ہوا کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور اُسے یہاں کون لایا تھا؟ اُسے سب کچھ یاد تھا۔ وہ سڑک پر دوڑتے ہوئے گر پڑا تھا اور غالباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کون سی جگہ تھی؟ کیا وہ پولیس کی حراست میں ہے؟ اپنے اس خیال پر اُسے ہنسی آ گئی۔ پولیس اُسے اس طرح آرام سے کسی رہائشی کمرے میں نہیں رکھے گی۔

وہ ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی نظریں فرش پر جم گئیں۔ چارپائی کے قریب فرش پر ایک دری بچھی ہوئی تھی جس پر ایک تکیہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اُسے چارپائی پر پیروں کے قریب ایک کمبل بھی نظر آیا۔ یہ کمبل غالباً اُس کے اُوپر ڈالا گیا تھا۔ لیکن نیند میں اُس نے پیر مار

کر ہٹا دیا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک خوشگوار جھونکے کی طرح ایک پان سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی رنگت سانولی تھی۔ لیکن چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کو بلاشبہ غزال کی آنکھوں سے تشبیہہ دی جا سکتی تھی۔ آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیر رہے تھے۔

''تم ہوش میں آ گئے.....؟'' لڑکی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بھیڑ دیا۔ ''ارے..... رہے ہو؟ آرام سے لیٹے رہو!'' لڑکی نے آگے بڑھ کر اُسے آرام سے لٹا کر کمبل اُس پر ڈال دیا۔

''میں کہاں ہوں..... یہ کون سی جگہ ہے..... اور مجھے یہاں کون لایا تھا.....؟'' طارق نے پوچھا۔ اُس کی نظریں لڑکی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''تمہیں بابا یہاں لے کر آیا تھا۔ اُسے تم زخمی حالت میں سڑک پر پڑے ہوئے ملے تھے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تمہارا بابا کون ہے..... اور یہ کون سی جگہ ہے؟'' طارق نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ویسے اُسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ لڑکی مسلمان تھی۔ اگر ہندو ہوتی تو بابا کو بابا کی بجائے پتا کہتی۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا۔ یہ تو محض اُس کا اندازہ تھا۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ وہ کس طرح زخمی ہوا ہے؟ اور یہ کہ پولیس اُس کی تلاش میں ہے.....؟

''میرا بابا تانگہ چلاتا ہے۔ وہ گھر واپس آ رہا تھا کہ تم اُسے سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے ملے۔ پہلے تو بابا یہ سمجھا کہ تم شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر گر پڑے ہو۔ لیکن جب اُس نے تانگے سے اُتر کر تمہیں اُٹھانا چاہا تو پتہ چلا کہ تم زخمی ہو۔ وہ تمہیں تانگے میں ڈال کر گھر لے آیا۔''

''لیکن..... یہ مرہم پٹی.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کی ہے.....'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''میں سرکاری ہسپتال میں نرس ہوں۔''

''اوہ.....!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے..... اور کیا تمہارا بابا اس وقت گھر پر نہیں ہے؟''

''بابا دوسرے کمرے میں سو رہا ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''جب تمہیں یہاں لایا گیا تو تم بے ہوش تھے۔ تمہاری ڈریسنگ کرنے کے بعد میں یہیں دری بچھا کر لیٹ گئی تھی۔''

''تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ..... لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور کس طرح زخمی ہوا تھا.....؟'' طارق بولا۔

''میرے لئے تم صرف ایک زخمی ہو۔ جس کی دیکھ بھال کرنا میں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔ میرے خیال میں انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے۔ اور اس مذہب کے ناطے ہم نے تمہیں پناہ دی ہے۔''

''پناہ.....؟'' طارق چونک گیا۔

''ہاں.....!'' لڑکی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارے جسم پر یہ زخم گولیوں سے آئے ہیں۔ تمہیں یہ گولیاں تمہارے کسی ذاتی دشمن نے ماری ہوں گی یا پولیس نے۔ تم شاید قانون کو مطلوب ہو۔ لیکن.....''

''اور اس کے باوجود تم لوگوں نے مجھے پناہ دی۔ اگر قانون کے محافظوں کو میری یہاں موجودگی کا پتہ چل گیا تو میرے ساتھ تم لوگ بھی.....''

''میں جانتی ہوں۔'' لڑکی نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''بابا نے جب تمہیں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں سڑک سے اُٹھایا تو اُس نے پہلے یہی سوچا تھا کہ تمہیں کسی ہسپتال لے جائے۔ پھر اس خیال سے اُس نے تمہارے لباس کی تلاشی لی کہ اگر تمہارے گھر کا اتا پتہ مل جائے تو تمہارے گھر والوں کو بھی تمہارے بارے میں اطلاع دے دے۔ لیکن جب تمہاری جیب سے رقم کے علاوہ پاکٹ سائز کی آیت الکرسی بھی نکلی تو بابا کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تم مسلمان ہو۔ اس لئے بابا تمہیں ہسپتال کی بجائے گھر لے آئے۔ شکل سے تم غنڈے، بدمعاش یا جرائم پیشہ نہیں لگتے۔ نجانے بابا کے دل میں یہ بات کیسے آئی کہ تم پولیس کے ہاتھوں زخمی ہوئے ہو۔ بابا اَن پڑھ ضرور ہے، لیکن حالات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ دو تین روز پہلے صفدر جنگ ایئر پورٹ پر ایئر انڈیا کا ایک کارگو جہاز مار گرایا گیا تھا۔ پولیس کو صفدر جنگ کے مقبرے کی چھت سے ایک راکٹ لانچر بھی ملا تھا۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اُنہیں تلاش کر رہی ہے۔ اور پھر آج ہی رات جمنا کی طرف سے زبردست دھماکے سنائی دیئے تھے۔ بابا نے تمہیں جمنا کے قریب ہی سڑک پر بے ہوش پڑے دیکھا تھا۔ اُس کا اندازہ تھا کہ تم اُن مسلمان سرفروشوں میں سے ہو جنہوں نے یہاں متعصب ہندوؤں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ اس لئے بابا تمہیں کسی ہسپتال پہنچانے کی بجائے گھر لے آیا۔ ممکن ہے، بابا کا اور میرا اندازہ غلط ہو۔''

''نہیں.....'' طارق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم لوگوں نے مجھے پناہ دی؟''

''انسانیت کے علاوہ ہمارے درمیان مذہب کا رشتہ بھی ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''تمہاری جیب میں آیت الکرسی کو دیکھ کر ہی بابا نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ

ہندوستان کے مسلمان کس کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں؟ اُن کے ساتھ شو
سے زیادہ بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ متعصب ہندو، مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے مو
تلاش میں رہتے ہیں۔ بعض اوقات بچوں کے جھگڑے نسلی فسادات کے باعث بن جاتے
مسلمانوں کی املاک کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے، گھروں میں گھس کر اُنہیں قتل کیا جاتا ہے،
لڑکیوں اور عورتوں کو سرِ عام بے آبرو کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کا قانون بھی مظلوموں
کرنے سے آنکھ چراتا ہے۔ ہندو غنڈوں اور بلوائیوں کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔
پہلے ایک ایسے ہی ہنگامے میں میرے منگیتر کو چھرا گھونپ کر زخمی کر دیا گیا تھا۔ جب وہ
کے لئے پولیس کے پاس پہنچا تو پولیس والوں نے اُس کی بات سننے کی بجائے اُلٹا اُسی کو
کر ختم کر دیا اور اُس کی لاش سڑک پر پھینک دی۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' طارق نے کہا۔ ''تمہارا بابا کیا کرتا ہے.....؟''

''وہ تانگہ چلاتا ہے۔ میں نے میٹرک کے بعد نرسنگ میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور تین
سے ایک سرکاری ہسپتال میں کام کر رہی ہوں۔ میں نے بے شمار زخمیوں کی تیمارداری کی
اُن کے زخموں پر مرہم رکھا ہے۔ لیکن آج تمہاری تیمارداری کر کے مجھے جو روحانی خوشی ہو
ہے، اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ ویسے تم خوش قسمت ہو۔ دونوں گولیاں گوشت چیرتی ہوئی
گئی تھیں۔ کسی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری
ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں..... تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔''

''میرا نام سکینہ ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اور بابا کا نام سلمان ہے۔ بس! اب جا
والا ہوگا۔ وہ ساڑھے چھ بجے تانگہ لے کر چلا جاتا ہے۔''

''اس وقت کیا بجا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''فجر کی اذان ہو رہی ہے۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ تم اپنی جگہ سے
نہیں۔ آرام سے لیٹے رہو۔'' سکینہ کہتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

باہر صبح کا اُجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ طارق، بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ سکینہ کا باپ
کے لئے رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ اُسے سڑک پر سے اُٹھا کر نہ لاتا تو یقیناً
تک پولیس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا۔

دُور کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ طارق خاموش لیٹا یہ آواز سنتا رہا
منٹ بعد سکینہ چائے لے کر آ گئی۔ اُس نے چائے کے پیالے میز پر رکھ دیئے۔ طارق کو

دے کر اُٹھایا۔ پھر ایک پیالہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک خود لے کر سٹول پر بیٹھ گئی۔ طارق،
چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ سکینہ کی عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ
بھگ رہی ہوگی۔ رنگت سانولی ہونے کے باوجود اُس میں بے پناہ کشش تھی۔ سکینہ بھی کن
انکھیوں سے بار بار اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ تو تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''کوٹلہ فیروز شاہ میں واقع یہ جگہ احاطہ ہری چند کہلاتی ہے۔ اس احاطے میں ہمارے سوا اور
کوئی نہیں رہتا۔'' سکینہ نے جواب دیا۔

اُسی لمحے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ
دُبلا پتلا، لمبے قد کا آدمی تھا۔ چھوٹی نوکدار داڑھی اُس کے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سر
پر کالے رنگ کی دو پلی ٹوپی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اب.....؟'' اُس نے مسکرا کر طارق کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہوں.....'' طارق نے جواب دیا۔ ''میں آپ لوگوں کا شکریہ.....''

''شکریہ، میرا نہیں، سکینہ کا ادا کرو! جس نے تمہارے زخموں پر مرہم رکھا۔'' سلمان نے اُس
کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تعریف کے لائق تو وہی پاک ذات ہے جس نے تمہیں نئی
زندگی دی۔ ہم تو وسیلہ بن گئے تھے۔''

''بابا! تم نماز پڑھ لو۔ میں تمہارے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔'' سکینہ نے کہا۔

''ہاں بیٹی..... میں پہلے نماز پڑھ لوں۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تمہارے مریض
کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' سلمان کمرے سے نکل گیا۔

سکینہ بھی کمرے سے جا چکی تھی۔ طارق بستر پر لیٹا صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اُس کی
خوش قسمتی تھی کہ سلمان اُسے اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا اور اُس کی زندگی بچ گئی تھی۔ وہ شاہ رُخ
اور دوسرے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ لوگ کہاں تھے؟ بچ کر اپنے ٹھکانوں میں
پہنچ گئے تھے یا پولیس کے ہاتھ لگ گئے تھے؟ اُن کے بارے میں معلوم کرنے کا اُس کے پاس
فی الحال اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اُس کے ذہن میں مراد علی کا خیال اُبھرا۔ مراد علی کا جسم گولیوں
سے چھلنی ہو گیا تھا۔

اچانک طارق کے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔ اُس رات صفدر جنگ ایئر پورٹ پر
طیارے کو تباہ کرنے کے بعد وہ دل شیر کے ساتھ پوائنٹ ون پر گیا تھا۔ یہ مکان کوٹلہ فیروز شاہ
نامی میں واقع تھا۔ اس مکان میں حنا سے بھی اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن طارق کو بالکل اندازہ

نہیں تھا کہ وہ مکان، احاطہ ہری چند سے کتنے فاصلے پر اور کس جگہ ہوگا؟ اُس رات وہ مکان کی طرف جانے والے راستوں کی کوئی نشانی بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ ہوسکتا ہے، وہ مکان یہاں سے بالکل قریب ہو۔ لیکن وہ، وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

صبح بابا سلمان تو تانگہ لے کر چلا گیا۔ لیکن سکینہ اپنی ڈیوٹی پر نہیں گئی۔ وہ نرس تھی اور اُس کے خیال میں مریض کے پاس اُس کا رہنا بہت ضروری تھا۔ دس بجے کے قریب وہ کچھ دیر کے لئے بازار چلی گئی۔ اُسے طارق کے لئے کچھ ادویات اور انجکشن کی ضرورت تھی تاکہ اُس کے زخم صرف جلد سے جلد خشک ہوسکیں۔ بلکہ اُس کی کمزوری بھی دُور ہو جائے۔ بازار سے واپسی پر وہ اخبار بھی لے آئی تھی۔ اخبار کی شہ سرخی رات ہونے والے دھماکوں سے متعلق تھی۔ سامنے کا پورا صفحہ اور آخری صفحہ اُن دھماکوں ہی کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ جبکہ اندر کا پورا صفحہ تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق گزشتہ رات نامعلوم تخریب کاروں نے پرانے قلعے کی فصیل سے جمنا کے اُس پار واقعی فوجی کیمپ پر راکٹوں کی بارش کر دی جس سے ستائیس فوجی ہلاک اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک اسرائیلی فوجی آفیسر بھی شامل ہے جو اسرائیلی حکومت سے ایک معاہدے کے تحت بھارتی فوجیوں کے اس ٹریننگ کیمپ میں موجود تھا۔ اخبار نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسرائیل اور بھارتی حکومت کے درمیان وہ معاہدہ کس قسم کا تھا؟ اور اسرائیل سے آنے والے فوجی ماہرین کی تعداد کیا تھی؟ اخبار کے رپورٹر نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے تین روز پہلے صفدر جنگ ایئر پورٹ کی فضا میں تباہ ہونے والے بھارتی ایئر لائن کے کارگو طیارے کی تباہی کو بھی اُس فوجی کیمپ کی تباہی سے منسلک قرار دیا تھا۔ اخبار کے رپورٹر نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ انڈین ایئر لائن کا کارگو طیارہ غلطی سے تباہ کر دیا گیا تھا۔ جبکہ تخریب کاروں کا اصل نشانہ اسرائیلی ایئر لائن کا وہ طیارہ تھا، جو اُس رات گیارہ بج کر چالیس منٹ پر صفدر جنگ ایئر پورٹ پر اُترنے والا تھا۔ اُس طیارے میں بعض اسرائیلی فوجی ماہرین سوار تھے۔ عین وقت پر اُس اسرائیلی طیارے کا رُخ پالم انٹرنیشنل ایئر پورٹ کی طرف موڑ دیا گیا اور تقریباً اُسی وقت کلکتہ سے آنے والے کارگو طیارے کو صفدر جنگ ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کو کہا گیا۔ اس طرح وہ بدقسمت طیارہ، تخریب کاروں کا نشانہ بن گیا۔

اخبار کے رپورٹر نے ماہرین کی اس رائے سے آگاہ ہونے کے بعد کہ طیارے کی تباہی اور فوجی کیمپ کی تباہی میں سٹنگر میزائل استعمال کئے گئے تھے، دونوں واقعات کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں قرار دیا تھا۔ اور اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ دونوں واقعات میں پاکستانی تخریب کاروں کی ایک ہی پارٹی ملوث ہے۔

اخبار کے صفحہ اوّل پر ایک خبر یہ تھی کہ پولیس کی ایک پارٹی معمول کے گشت پر تھی کہ پرانے قلعے سے راکٹ فائر ہونے کی آواز سن کر پولیس والے اس طرف دوڑے۔ پولیس پارٹی جب فصیل کے قریب پہنچی تو کچھ لوگ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے، جس پر پولیس نے انہیں للکارا۔ اُن لوگوں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ جواب میں پولیس کو بھی فائر کھولنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں ایک تخریب کار ہلاک ہوگیا جبکہ اُس کے ساتھی جمنا کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس کے مطابق فرار ہونے والے تخریب کاروں میں سے کم از کم ایک کے جسم پر دو گولیاں لگی تھیں۔ اس خبر کے ساتھ علی مراد کی لاش کی تصویر بھی چھاپی گئی تھی۔

طارق کو مراد علی کی موت کا بے حد افسوس تھا۔ لیکن یہ اطلاع اُن کے لئے باعث اطمینان تھی کہ اُس کے دوسرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ لیکن ایک خطرہ بہرحال! موجود تھا کہ اگر مراد علی کے جاننے والوں میں سے کسی نے اُس کی تصویر شناخت کر کے پولیس سے رابطہ قائم کر لیا تو اس طرح پولیس، شاہ رُخ یا دل شیر تک پہنچ سکتی تھی۔

''آس پاس کے علاقوں میں پولیس زبردست چیکنگ کر رہی ہے۔'' سکینہ نے اُسے اخبار ایک طرف رکھتے دیکھ کر کہا۔ ''اُن کا خیال ہے کہ زخمی تخریب کار نے کسی پرائیویٹ کلینک یا ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا ہوگا یا ایسا کرنے کی کوشش کرے گا۔ پولیس پرانا قلعہ سے راج گھاٹ تک کے علاقے میں واقع تمام پرائیویٹ کلینکوں اور ڈاکٹروں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔''

''تمہارا یہ گھر بھی غالباً اسی علاقے میں آتا ہے۔ تمہیں تو کوئی خطرہ نہیں؟ تم ایک نرس بھی ہو اور مسلمان بھی۔ تم پر شبہ تو ہوسکتا ہے۔'' طارق نے کہا۔ اُس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

''اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔'' سکینہ نے بے حد جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

طارق اُس کی ہمت اور دلیری پر مسکرا دیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سکینہ ایک کمزور سی لڑکی تھی۔ وہ کسی بدترین صورتِ حال کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

''میں، دوائیں لے آئی ہوں۔'' سکینہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''لو! پہلے یہ دوا پی لو اور دو گولیاں کھا لو۔ اس کے بعد میں تمہیں انجکشن لگاؤں گی۔''

''انجکشن لگانا ضروری ہے کیا؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں..... ڈرتے ہو کیا؟'' سکینہ نے اُسے گھورا۔

''ہاں.....'' طارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''حیرت ہے.....!'' سکینہ بولی۔ ''بندوق کی دو گولیاں تمہارے جسم کو چیرتی ہوئی گزر گئیں

اور تمہیں بالکل خوف نہیں آیا۔ لیکن سوئی کی معمولی سی چبھن سے.....''

''لاؤ..... دوا لاؤ! پھر انجکشن بھی لگا دینا۔'' طارق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ دوا دینے کے بعد سکینہ نے اُسے انجکشن بھی لگا دیا۔

''یہ انجکشن اس لئے بھی ضروری ہے کہ انفیکشن نہ ہو جائے۔'' سکینہ نے استعمال شدہ سرنج ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

سکینہ اُس کے سامنے سٹول پر بیٹھی اُس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ بے حد معصوم اور بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ اُس کی باتوں سے طارق نے اب یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ کسی مشکل وقت میں وہ اپنی جان دے دے گی لیکن عزت و آبرو پر آنچ نہیں آنے دے گی۔

اُس وقت دن کے تقریباً بارہ بج رہے تھے کہ ایک آواز سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ کوئی سکینہ کے باپ سلمان کا نام لے کر آوازیں دے رہا تھا۔

''یہ رگھو ہے..... رگھومل۔ اپنے آپ کو لعل مندر کا پجاری کہتا ہے۔ لیکن ہے ایک نمبر کا شیطان۔ جوان اور حسین لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے اِسے مندر سے نکالا جا چکا ہے۔ چند مہینوں سے اسی گلی میں رہ رہا ہے۔ کبھی کبھار بابا کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تم آرام سے لیٹے رہو! میں دیکھتی ہوں، یہ اس وقت کیوں آیا ہے حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بابا اس وقت گھر پر نہیں ہوتا۔'' سکینہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس نے جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا۔

طارق کی پیشانی پر سلوٹیں سی اُبھر آئیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس پجاری کو یہاں اُس کی موجودگی کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟ اُس نے اپنی تمام تر توجہ آوازوں کی طرف مبذول کر دی۔

''کیا بات ہے پنڈت جی..... بابا اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ وہ تانگہ لے کر گیا ہوا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ رات کو واپس آتا ہے۔'' سکینہ کی آواز سنائی دی۔

''میں جانتا ہوں، تمہارا باپ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ اسی لئے تو آیا ہوں۔ آج مجھے اصل کام تو تم سے ہے۔'' پنڈت رگھومل نے جواب دیا۔ اُس کے لہجے کی مکاری محسوس کر کے طارق چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''مجھ سے کیا کام ہے پنڈت جی..... کوئی دان چاہئے؟'' سکینہ بولی۔

''دان..... ہاں!'' پنڈت کی آواز سنائی دی۔ ''تم سے دان لینے ہی تو آیا ہوں۔ اور سنو مجھے پنڈت جی مت کہو۔ میرا نام رگھو ہے۔ رگھومل۔ کیا سمجھیں؟''

''میں کچھ بھی نہیں سمجھی پنڈت جی! آج تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ دارو زیادہ تو نہیں

پی لی؟'' سکینہ نے کہا۔

''میں دارو ہی پینے آیا ہوں..... تمہارے حسن کی دارو۔ آج تو میں جی بھر کے پیاس بجھاؤں گا۔ بہت دنوں سے تم پر میری نظر تھی۔'' پنڈت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا بکتے ہو.....؟'' سکینہ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ''چلے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں شور مچا کر محلے والوں کو جمع کر لوں گی۔ تمہیں اتنے جوتے پڑیں گے کہ یاد کرو گے۔''

''لیکن تم شور نہیں مچاؤ گی سندری! جب میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ تمہارے بارے میں کیا جانتا ہوں تو تم پکے ہوئے پھل کی طرح خود بخود میری آغوش میں آ گرو گی۔ میں جانتا ہوں، تم نے گھر میں کس کو چھپا رکھا ہے۔ اور.....''

''کک..... کیا بکتے ہو.....؟'' سکینہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''شرم نہیں آتی مجھ پر الزام لگاتے ہوئے؟'' سکینہ اندر سے کانپ کر رہ گئی تھی۔

طارق، بستر پر اُچھل پڑا۔ پنڈت رگھومل یہاں اُس کی موجودگی سے آگاہ تھا اور اب سکینہ کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور سینے میں لاوا سا کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''اور..... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کون ہے۔'' پنڈت رگھومل کہہ رہا تھا۔ ''کل رات جب تمہارا باپ اُسے یہاں لے کر آیا تھا تو گلی میں سناٹا تھا۔ لیکن میں گلی کے نکڑ پر اندھیرے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مجھے دراصل! رامو درزی کی لونڈیا کا انتظار تھا۔ رات گئے اُس نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب دیر ہو گئی تو میں کٹیا سے باہر آ کر اُس کی راہ تکنے لگا۔ اتنے میں، میں نے تمہارے باپ کو تانگہ لے کر آتے دیکھا۔ اگلی سیٹ پر کوئی بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ میں حیران ہوا کہ تمہارا باپ کس کو گھر لے آیا ہے؟ تانگہ احاطے میں داخل ہونے کے بعد گیٹ بند ہو گیا تو میں گیٹ کے پاس آ کر جھانکنے لگا۔ سلمان نے آواز دے کر تمہیں بھی بلا لیا تھا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ کوئی زخمی ہے جسے تمہارا باپ گھر لے آیا ہے اور.....''

''پنڈت جی.....!'' سکینہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے پنڈت جی! چاہو تو اندر آ کر دیکھ لو۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ آؤ..... دیکھو! کمرہ بالکل خالی ہے۔''

طارق کو دوسرے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو وہ تکلیف کے باوجود بستر سے اُٹھ گیا اور دروازے کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اگر پنڈت اُس کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُسے دبوچ لے گا۔

پنڈت رگھومل، دوسرے کمرے میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس میں ایک چارپائی کے علاوہ مختصر سا سامان تھا۔

''دیکھ لیا؟ کوئی نہیں ہے یہاں۔ دوسرے کمرے میں بھی کوئی نہیں ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''میں جانتا ہوں، وہ یہیں ہے۔'' رگھومل کی آواز سنائی دی۔ ''میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ رات کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا۔ رات کو تو میں نے خیال نہیں کیا۔ مگر صبح اخبار پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی زخمی ہے جس کی تلاش پولیس کو ہے۔ دیکھو سندری.....!'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ اگر تم خاموشی سے میری پیاس بجھا دو تو میں خاموش رہوں گا۔ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اگر.....''

طارق کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف سرکنے لگا۔

''یقین کرو پنڈت جی! یہاں کوئی نہیں ہے۔ تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ تم تو میرے باپ کے برابر ہو.....''

''اگر یہاں کوئی زخمی نہیں ہے تو.....'' پنڈت نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''آج صبح تم دُکان سے دوائیں اور انجکشن کس کے لئے لائی تھیں؟''

''وہ..... وہ مجھے ہسپتال میں ایک مریض کے لئے ان دواؤں کی ضرورت تھی۔'' سکینہ نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھو! تم جھوٹ بول کر اپنے آپ کو نہیں بچا سکو گی۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ تم نے ایسے خطرناک مجرم کو پناہ دے رکھی ہے جو ایک بہت بڑی تباہی کا باعث بنا ہے تو تم سمجھ سکتی ہو کہ پولیس والے تمہارا کیا حشر کریں گے۔ آؤ! اُس کھٹیا پر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

پنڈت رگھومل اُس کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی کی طرف کھینچنے لگا۔

''چھوڑو..... میرا ہاتھ چھوڑ دو!'' سکینہ کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

''میں یہ ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا سندری! تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔'' پنڈت رگھومل اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز اُبھری۔ سکینہ نے اُس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ اسی لمحے طارق دروازے کے سامنے آ گیا۔ پنڈت رگھومل، کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اُس کا رُخ دروازے کی طرف تھا۔ طارق کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوف و دہشت کے سے تاثرات پھیل

گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا، طارق نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔

طارق، پنڈت رگھومل کو اپنے ساتھ لیتا ہوا چارپائی پر گرا۔ اُس کے دونوں ہاتھ رگھومل کے گلے پر تھے اور وہ اُس کے نرخرے پر انگوٹھوں کا دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔ رگھومل بری طرح مچل رہا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے طارق کے منہ پر چند گھونسے بھی مارے لیکن اسی لمحے سکینہ نے چارپائی کے دوسری طرف پہنچ کر رگھومل کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لئے۔ وہ دھان پان سی لڑکی تھی۔ لیکن اس وقت اُس میں بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ اُس نے رگھومل کے ہاتھ اس قدر سختی سے جکڑ رکھے تھے کہ وہ کوشش کے باوجود اُنہیں نہ چھڑا سکا۔

رگھومل کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ زبان بھی باہر نکل آئی تھی۔ وہ بری طرح ٹانگیں پٹخ رہا تھا۔ مگر طارق کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ درندگی اور سفاکی کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ طارق، رگھومل کے نرخرے پر انگوٹھے کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ رگھومل کی مدافعت بتدریج کمزور پڑتی چلی گئی۔ آخر کار اُس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

طارق اب بھی رگھومل کا گلا دبوچے ہوئے تھا۔ سکینہ نے رگھومل کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور طارق کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے ہولے سے حرکت دی۔ طارق کو جیسے ہوش آ گیا۔ اُس نے رگھومل کا گلا چھوڑ دیا اور چارپائی پر دوسری طرف اُلٹ گیا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ اُس کے کندھے پر بندھی ہوئی پٹی، خون سے تر ہو گئی۔ سکینہ کی آنکھوں سے خوف اُبھر آیا۔

''تمہارے زخم سے خون رسنے لگا ہے۔ دوسرے کمرے میں چلو! میں تمہاری پٹی تبدیل کروں۔'' وہ طارق کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''لیکن..... یہ؟'' طارق نے رگھومل کی طرف دیکھا اور سکینہ کا سہارا لے کر اُٹھنے لگا۔

''یہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی اب تم فکر مت کرو۔'' سکینہ نے اُسے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔

دوسرے کمرے تک آتے ہوئے طارق کو بے پناہ تکلف ہو رہی تھی۔ تکلیف کو دبانے کے لئے اُس نے دانت بھینچ رکھے تھے۔ سکینہ اُسے چارپائی پر چھوڑ کر باہر بھاگ گئی۔ سب سے پہلے اُس نے گیٹ سے باہر جھانکا۔ اتفاق سے اس وقت بھی گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اُس نے لکڑی کا گیٹ بند کر کے اندر سے کنڈا چڑھایا اور دوڑتی ہوئی طارق کے کمرے میں آ گئی۔ کندھے کی پٹی کھول کر اُس نے زخم چیک کیا۔ طاقت استعمال کرنے سے زخم کھل گیا تھا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے دوبارہ ڈریسنگ کر دی اور درد سے آرام اور نیند کے لئے ڈائزی پام کی ایک گولی طارق کو کھلا دی۔ طارق سے نمٹنے کے بعد سکینہ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ یہ دراصل اُس کے باپ کا کمرہ

تھا۔ چارپائی پر پنڈت رگھومل کی لاش پڑی تھی۔ اُس کی زبان اور آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اُس کی صورت پہلے ہی خوف ناک تھی۔ اور اب تو اُسے دیکھ کر ہی دہشت ہو رہی تھی۔ سکینہ نے اُسے چھو کر اطمینان کر لیا۔ لیکن اُس میں زندگی کا اب نام ونشان تک نہیں رہا تھا۔

رگھومل، بھاری تن وتوش کا مالک تھا۔ اُس کی لاش کو ٹھکانے لگانا سکینہ کے بس میں نہیں تھا۔ اور اس وقت لاش کو کمرے سے باہر نکالنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے کھینچ تان کر لاش کو چارپائی سے گرایا اور کسی نہ کسی طرح دھکیل کر چارپائی کے نیچے کر دیا۔ اُس نے بستر کی چادر اس طرح لٹکا دی تھی کہ چارپائی کے نیچے نظر نہ جا سکے۔ پھر اُس نے باہر نکل کر کمرے کے دروازے کو تالا لگا دیا اور واپس طارق کے کمرے میں آ گئی اور اُس سے باتیں کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد طارق سو گیا۔ سکینہ کچھ دیر تک کمرے میں بیٹھی رہی، پھر آنگن میں آ گئی۔

یہ گلی کے اختتام پر ایک بہت لمبا چوڑا احاطہ تھا۔ گلی سے احاطے میں داخلے کے لئے لکڑی کے تختوں کا کمزور سا گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے اندر ذرا آگے دائیں طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے سامنے مختصر سا برآمدہ بھی تھا۔ اُس کے سامنے وسیع وعریض صحن تھا جس کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے لیکن ایک کے سوا تمام کمرے کھنڈر بن چکے تھے۔ جو دو کمرے کسی حد تک سلامت تھے، اُن سے اصطبل وغیرہ کا کام لیا جاتا تھا۔ ایک کمرے میں گھوڑا بندھتا تھا اور دوسرے کمرے میں گھوڑے اور تانگے کا سامان رکھا جاتا تھا۔ اُن کمروں کے سامنے گھوڑے کی سوکھی ہوئی لید اور گھاس وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔

یہ احاطہ ہری چند تھا..... 1947ء سے پہلے یہاں کئی مسلمان گھرانے آباد تھے۔ ہر کمرے میں ایک خاندان رہائش پذیر تھا۔ یہ احاطہ دراصل تقریباً ساٹھ سال پہلے ہری چند نامی ایک ہندو سیٹھ نے بنوایا تھا اور اُسی کے نام سے موسوم تھا۔ 1945ء میں یہ احاطہ ایک مسلمان نے خرید لیا اور یہاں رہنے والے مسلمان خاندانوں کے کرائے معاف کر دیئے۔ لیکن 1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو اس علاقے میں سب سے زیادہ تباہی اسی احاطے پر نازل ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے اس احاطے کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلہ بول دیا تھا۔ مسلمانوں کا اتنا قتل عام دہلی کے کسی اور علاقے میں نہیں ہوا تھا، جتنا احاطہ ہری چند میں ہوا تھا۔ یہاں مسلمانوں کے بیس بائیس خاندان آباد تھے، جن میں سے پانچ چھ افراد ہی جانیں بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

جب ملک تقسیم ہوا تو احاطہ ہری چند کا مسلمان مالک انگلینڈ میں تھا۔ وہ کئی سال بعد واپس آیا تو پتہ چلا کہ اس احاطے پر ایک ہندو قابض ہو چکا ہے اور وہ کسی طرح بھی یہ جائیداد اُس

مسلمان مالک کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مسلمان سیٹھ کو مجبوراً عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ دہلی اور ہندوستان کے کئی شہروں میں ایسی جائیدادیں موجود تھیں جنہیں مسلمان چھوڑ گئے تھے۔ ایسی جائیدادوں کو متروکہ املاک قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن احاطہ ہری چند کا شمار متروکہ املاک میں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُس کا مالک موجود تھا اور ہندوستان کا شہری تھا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق یہ احاطہ اُس کے مسلمان مالک کے حوالے کر دیا گیا۔

احاطہ ہری چند میں کبھی زندگی کی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب ویران ہو چکا تھا۔ کمرے کھنڈر بن گئے تھے۔ اس احاطے کا مسلمان مالک یہاں پلازہ بنانا چاہتا تھا لیکن زندگی نے اُسے مہلت نہیں دی۔ اُس کے انتقال کے بعد یہ جائیداد اُس کے بیٹے کے نام منتقل ہو گئی جو شروع ہی سے لندن میں رہائش پذیر تھا۔ ہندوستان سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے یہ احاطہ اپنے باپ کے ایک پرانے خدمت گار لقمان کو سونپ دیا۔ سلمان اُس کا بیٹا تھا۔ لقمان تانگہ چلایا کرتا تھا۔ اُس نے اس احاطے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ لقمان کے بعد یہ احاطہ، سلمان کی تحویل میں آ گیا۔ باپ کا تانگہ بھی اُس نے سنبھال لیا تھا۔ وہ صرف دو چار جماعتیں ہی پڑھ سکا تھا۔ اُس کی شادی باپ کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ صرف ایک بیٹی تھی۔ بیوی کے انتقال کے بعد اُس نے بیٹی کو ماں کا پیار بھی دیا تھا اور باپ کی شفقت بھی۔ اُس نے بیٹی کو میٹرک تک تعلیم دلائی اور اُس کی خواہش کے مطابق اُسے نرسنگ میں داخلہ دلوا دیا۔

سلمان ایک شریف انسان تھا۔ گلی میں چند گھر مسلمانوں کے بھی تھے اور سلمان کی دوستی سب ہی سے تھی۔ مسلمانوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی۔ دہلی میں کئی مرتبہ ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔ گلی کے بعض ہندو نوجوانوں نے ایسے موقعوں پر سلمان کے گھر پر دھاوا بولنے کی کوشش کی تھی لیکن بزرگ سامنے آ گئے تھے۔

سکینہ دن بھر بدروح کی طرح احاطے میں گھومتی رہتی۔ اُس کا باپ صبح کا گیا، رات کو آتا تھا اور سکینہ اکثر اکیلی رہتی تھی۔ اُسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج خوف سے اُس کا دل کانپ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس کا باپ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے کبھی نہیں آئے گا۔ اس کے باوجود وہ بار بار گیٹ پر جا کر باہر جھانکتی۔ کبھی اُس کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی یہاں پنڈت رگھومل کی لاش پڑی تھی اور کبھی طارق والے کمرے میں جھانک کر دیکھتی۔ گولی کے اثر سے طارق گہری نیند سو رہا تھا۔ سکینہ نے اُسے ہلا نے جلانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کے خیال میں طارق کے لئے آرام بے حد ضروری تھا۔ اور یہ آرام اُسے نیند میں ہی مل سکتا تھا۔

سکینہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کے گھر میں ایک ہندو پنڈت کی لاش تھی۔ وہ زخمی طارق تھا جو اس وقت قانون کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ ہندو پنڈت کی لاش اور زخمی طارق، سکینہ اور اُس کے باپ کے لئے موت کے پروانے کی حیثیت رکھتے تھے۔

شام کے سائے ڈھل گئے۔ سکینہ کے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔ طارق اس وقت تک جاگ چکا تھا۔ اُس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سکینہ نے اُسے چائے بنا کر دی اور خود بھی اُس کے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

''کیا بات ہے سکینہ! تم بدحواس اور پریشان نظر آ رہی ہو.....؟'' طارق نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''وہ..... وہ پنڈت کی لاش اُس کمرے میں پڑی ہے۔ اور بابا بھی ابھی تک نہیں آیا۔'' سکینہ نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ.....!'' طارق کے ہاتھ میں چائے کی پیالی چھلک گئی۔ ''اُسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔ تمہارا بابا عام طور پر کس وقت آ جاتا ہے؟''

''میرا خیال ہے گھنٹے آدھے گھنٹے میں آنے والا ہوگا۔ لیکن مجھے عجیب سی وحشت ہو رہی ہے۔'' سکینہ بولی۔

''میرا خیال ہے کہ اُس پنڈت نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اُسے یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ اب اُس کے بارے میں کبھی کوئی نہیں جان سکے گا کہ وہ کہاں گیا؟ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا بابا آ جائے تو لاش کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچتے ہیں۔''

''تم، اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟'' سکینہ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم زخمی ہو اور باہر بھی نہیں جا سکتے۔''

''کوئی مشورہ تو دے سکتا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں..... آج بابا کہاں رہ گیا؟'' سکینہ جھنجھلاتی ہوئی اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ شام ڈھلنے کے بعد خنکی میں اگرچہ اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن سکینہ پر خوف کی سی کیفیت طاری تھی اور وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

اچانک گلی میں تانگے کی آواز سنائی دی اور سکینہ وحشیانہ انداز میں گیٹ کی طرف دوڑی۔ اُس نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ اُس کے باپ ہی کا تانگہ تھا۔ گلی کے بچے، تانگے پر چڑھے ہوئے تھے۔ کچھ سیٹوں پر بیٹھے تھے، کچھ پائیدانوں پر کھڑے تھے۔ اور دو تین لڑکے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ سکینہ، گیٹ کھولنے کی بجائے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تانگہ رُک گیا۔

''گیٹ کھولو بیٹی!'' کوچوان کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سلمان نے کہا۔

''پہلے انہیں اُتارو بابا!'' سکینہ نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر خود ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بچوں کو تانگے سے اُتارنے لگی۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ تمام بچے بھاگ گئے ہیں تو اُس نے گیٹ کھول دیا اور تانگے کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ بند کر دیا۔ سلمان تانگے کو وسیع و عریض احاطے کے آخری سرے پر لے گیا جہاں طویلا بنا ہوا تھا۔ اُس نے تانگا روکا ہی تھا کہ سکینہ دوڑتی ہوئی پہنچ گئی۔

''پریشان کیوں ہو بیٹی..... مہمان تو خیریت سے ہے نا؟'' سلمان سے تانگے سے اُترتے ہوئے پوچھا۔ یہاں تاریکی تھی۔ سکینہ کا چہرہ اگرچہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سلمان نے اُس کی حرکتوں سے اُس کی پریشانی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''مہمان تو خیریت سے ہے بابا! لیکن وہ پنڈت.....'' سکینہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''پنڈت..... کون پنڈت.....؟''

''دوپہر کو پنڈت رگھومل یہاں آیا تھا۔ اُسے یہاں طارق کی موجودگی کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ اس کی موجودگی کو راز میں رکھنے کے لئے میری..... میری عزت کا سودا کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ لیکن..... لیکن طارق نے اُسے مار ڈالا۔ اُس کی لاش وہاں پڑی ہے۔ ہمارے کمرے میں۔ یہی بات مجھے خوفزدہ کئے دے رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، اب کیا ہو گا؟'' سکینہ نے رُک رُک کر اُسے بتا دیا۔ اُس کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔

''اُس کتے کی یہ مجال.....!'' سلمان نے دانت کچکچائے۔ ''طارق نے بہت اچھا کیا۔ اُس جگہ اگر میں ہوتا تو اُس کی بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو ڈال دیتا۔'' وہ تانگے میں گھوڑے کو جتا چھوڑ کر کمرے میں آ گیا۔ اُسے دیکھ کر طارق کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ سلمان نے سب سے پہلے طارق کی خیریت دریافت کی، پھر سکینہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''کہاں ہے اُس پنڈت کی لاش؟ میں اُسے تانگے میں ڈال کر کسی ویران سڑک پر پھینک آتا ہوں۔ کتے نوچتے پھریں گے اُسے رات بھر۔''

''یہ جوش کا نہیں، ہوش کا وقت ہے بابا!'' طارق نے کہا۔ ''تم ابھی آئے ہو۔ ابھی سویرا ہے۔ تانگہ لے کر واپس جاؤ گے تو گلی کے لوگ شک کریں گے۔ تانگے میں لاش چھپانا آسان نہیں۔ ہو سکتا ہے، کسی کی نظروں میں آ جائے اور اس طرح بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔''

''تو پھر کیا، کیا جائے.....؟'' سلمان نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم دن بھر کے تھکے ہوئے ہو۔ کچھ دیر آرام کر لو! میرا خیال ہے، اگر اس پنڈت کی لاش کو

اس حویلی ہی میں کسی جگہ دبا دیا جائے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' طارق نے کہا۔

''خیال تو تمہارا ٹھیک ہے۔'' سلمان پُر سوچ لہجے میں بولا۔ ''اس احاطے میں بڑی جگہ ہے۔ پینتالیس سال پہلے یہاں درجنوں بے گناہوں کا خون بہایا گیا تھا۔ جب اس حویلی نے بے گناہوں کے خون کی ہولی دیکھی ہے تو کیا اپنی مٹی میں ایک پاپی کی لاش کو جگہ نہیں دے سکے گی؟''

''تم جا کر پہلے گھوڑے کو کھولو۔ بے چارہ جانور صبح سے تانگے میں جتا ہوا ہے۔ اس کے بعد کھانا وغیرہ کھاؤ۔ رات کا کچھ حصہ گزر جائے تو لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ سکینہ! تم جا کر کھانا بناؤ۔ آج تو تم نے بھی مجھے کھانے کو نہیں پوچھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔''

''تم دن بھر سوتے رہے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کیونکہ تمہارے لئے آرام بے حد ضروری ہے۔ اور مجھے تو بھوک ہی نہیں تھی۔ اب میں روٹی پکاتی ہوں۔'' سکینہ نے جواب دیا۔

''میرے ساتھ آؤ بیٹی!'' سلمان نے کہا۔ ''میں مہمان کے لئے کچھ پھل لایا ہوں۔ تم تانگے سے پھلوں کا تھیلا لے آؤ! میں گھوڑے کو کھول کر دانہ وغیرہ ڈالتا ہوں۔''

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد سکینہ نے پھلوں والا تھیلا لا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ چھوٹا سا باورچی خانہ برآمدے کے آخری سرے پر بنا ہوا تھا۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد وہ تینوں کھانا کھا رہے تھے۔ طارق، تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد بھی سلمان اُسی کمرے میں بیٹھا رہا۔ اُس نے اپنا کمرہ کھلوا کر پنڈت رگھومل کی لاش دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ طارق کو شہر کی صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ پولیس، پورے شہر میں دندناتی پھر رہی تھی۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ سینکڑوں مسلمانوں اور سکھوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا۔ لیکن گرفتار ہونے والوں کی زیادہ تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی اور اُن میں بھی اکثریت اُن لوگوں کی تھی، جن کا کشمیر سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔

صبح کے اخبار میں بتایا گیا تھا کہ پرانے قلعے سے فوجی کیمپ پر راکٹ برسانے والے پولیس مقابلے کے بعد اپنے ایک ساتھی کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے اور اُن کا ایک ساتھی زخمی بھی ہو گیا تھا۔ سلمان کی رپورٹ کے مطابق پولیس شہر کے تمام ڈاکٹروں سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ پولیس کی اس کارروائی کا نتیجہ کیا رہا؟ طارق، دل ہی دل میں اپنے ساتھیوں کی خیر و عافیت کی دُعائیں مانگتا رہا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سلمان، احاطے کے طویلے والے حصے میں پہنچ گیا۔ ہر طرف

[...] تھا۔ البتہ دُور کہیں سے کسی گاڑی وغیرہ کے ہارن یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز کبھی کبھار [...] دے جاتی تھی۔ سلمان اُس کمرے میں آ گیا، جس کی چھت غائب تھی۔ کمرے کے کچے [...] پر ملبے کا ڈھیر تھا۔ وہ کچھ دیر تک تاریکی میں کھڑا جائزہ لیتا رہا، پھر دیوار کے قریب ایک جگہ [...] ملبہ ہٹانے لگا۔ کچھ دیر بعد سکینہ بھی اُس کے ساتھ اس کام میں شریک ہو گئی طارق بھی لنگڑاتا [...] وہاں پہنچ گیا۔

''ارے بیٹا! تم آرام کرو...... یہ کام ہم دونوں باپ بیٹی کر لیں گے۔'' سلمان نے اُس کی [...] طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اندر بستر پر اکیلے لیٹے ہوئے وحشت ہو رہی تھی، اس لئے چلا آیا۔ میری فکر مت کرو!'' طارق نے جواب دیا۔

''یہ بڑا ہی ڈھیٹ مریض ہے بابا! تمہاری بات بالکل نہیں مانے گا۔'' سکینہ نے طارق کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

طارق نے بھی جواب دینے کی بجائے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد گڑھا تیار ہو گیا۔ طارق وہیں کھڑا رہا، سکینہ اور سلمان کمرے سے لاش نکالنے کے لئے آ گئے۔ لاش اکڑ چکی تھی، لیکن خراب نہیں ہوئی تھی۔ موسم ٹھنڈا تھا۔ اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو کمرے میں بند ہونے کی وجہ سے اُس کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔

سلمان نے پنڈت رگھومل کی لاش کو گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے سے نکالا۔ اکڑ جانے کی وجہ سے لاش کا چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔ سلمان کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سی اُبھر [...] گئیں۔ یہ پنڈت تھا۔ رام رام کی مالا جپنے والا...... یہ زندگی بھر پتھر کی مورتیوں کی آڑ میں شکار کھیلتا رہا۔ مندر میں آنے والی نجانے کتنی معصوم اور بے گناہ عورتیں اُس کی ہوس کا شکار ہوئی [...] ہوں گی؟ کتنے گھر اُجاڑے ہوں گے اُس نے؟ سلمان کے خیال میں اُس شیطان کے چیلے کا انجام تو اس سے بھی برا ہونا چاہئے تھا، جسے دیکھ کر دوسرے عبرت حاصل کرتے۔ لیکن وہ اُس کا [...] مکروہ اور بھیانک چہرہ اب دوسروں کو نہیں دکھا سکتا تھا۔ اُس نے جھک کر لاش کو کندھے پر ڈالا [...] کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے طویلے کی طرف چلنے لگا۔

لاش کو گڑھے میں ڈال کر اُس پر مٹی بھر دی گئی اور اُوپر ملبہ پھیلا دیا گیا تاکہ کسی وقت اگر کوئی [...] یہاں آ بھی جائے تو کسی قسم کا شبہ نہ کر سکے۔ پنڈت رگھومل کی لاش سے نجات حاصل کرنے کے [...] سب دوبارہ طارق والے کمرے ہی میں آ گئے۔ سلمان کا فی الحال اپنے کمرے میں جانے کو [...] نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ سکینہ کے ساتھ چارپائی کے سامنے بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ دن بھر کی

محنت کے بعد اس وقت بھی اُسے مشقت کرنا پڑی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے اونگھ گیا۔ پھر باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگی تھی۔ اور پھر طارق کی آنکھیں بھی بند ہونے لگیں.....

تین دن گزر گئے۔ طارق اخبار کے ذریعے صورتِ حال سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ بات اُس کے لئے باعث اطمینان تھی کہ نہ تو کوئی تخریب کار پکڑا گیا تھا اور نہ ہی اُن کے ساتھی کی پہچان ہو سکی تھی۔ اور نہ ہی پولیس اُن کے زخمی ساتھی کا سراغ لگا سکی تھی۔ طارق سوچتا تھا کہ شاہ رُخ وغیرہ اُس کے لئے یقیناً پریشان ہوں گے۔ سکینہ بھی تین دن سے ہسپتال نہیں آئی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کے ہاتھ چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی۔ جس میں طبیعت خراب ہونے کا عذر پیش کیا گیا تھا۔ اُس روز دوپہر کے لگ بھگ سکینہ، سودا وغیرہ لینے کے لئے جانے لگی تو طارق نے رِسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے شاہ رُخ کا فون نمبر سکینہ کو دے کر اچھی طرح سمجھا دیا کہ اُسے بات کس طرح کرنی ہو گی۔ اُس نے رحمان بابا والا کوڈ بھی سمجھا دیا تھا۔

سکینہ کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

''تمہارے تمام ساتھی خیریت سے ہیں۔'' اُس نے آتے ہی کہا۔ ''شاہ رُخ تمہارے لئے حد پریشان تھا۔ تمہارے بارے میں جان کر اُس نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اور کہا ہے جہاں ہو، دو چار دن وہیں رہو۔ فی الحال باہر آنا مناسب نہیں۔ میں نے اُسے یہ بتا دیا ہے کس جگہ پر ہو۔ اُس نے پوائنٹ ون کا پتہ دیا ہے۔ اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اُس نے جس مکان کا پتہ مجھے سمجھایا ہے، وہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ بس! تین چار گلیوں کا فاصلہ ہے۔ شاہ رُخ نے کہا ہے کہ اگر یہاں کسی وقت خطرہ محسوس کرو تو پوائنٹ ون پر منتقل ہو جانا۔ شیر وہیں ہے۔''

''گڈ.....!'' طارق نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی تھی۔ اُس کے تمام ساتھی محفوظ تھے۔ البتہ مراد علی کی موت کا اُسے افسوس تھا۔ مراد علی نے ایک بہت بڑے مقصد کے لئے جان دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب کشمیر کے شہداء کی تاریخ لکھی جائے گی تو اُس میں مراد علی کا نام بھی شامل ہو گا۔

اُس روز شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ ہی دیر پہلے سکینہ کی ایک سہیلی آ گئی۔ ٹینا کا تعلق عیسائی گھرانے سے تھا اور وہ بھی سکینہ کے ساتھ اُسی ہسپتال میں نرس تھی۔ سکینہ اُسے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

''ارے ٹینا..... خیریت تو ہے؟'' سکینہ نے کہا۔

''خیریت تو میں تمہاری دریافت کرنے آئی ہوں۔ تم تین دن سے ڈیوٹی پر نہیں آ رہیں۔ کسی نے بتایا تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔ آج ڈیوٹی سے آف ہوئی تو میں نے سوچا کہ تمہاری خیریت دریافت کرتی چلوں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ مجھے تو بھلی چنگی لگ رہی ہو۔'' ٹینا ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی۔

''بخار آ گیا تھا..... اب ٹھیک ہوں۔ کل یا پرسوں ڈیوٹی پر آ جاؤں گی۔'' سکینہ نے جواب دیا۔ ''چائے پیو گی.....؟''

''نہیں سکینہ! بہت دیر ہو جائے گی۔ میں تو بس! تمہاری خیریت دریافت کرنے آ گئی تھی۔''

''ارے ہاں! معلوم ہے، آج ہسپتال میں کیا ہوا؟''

''کیا ہوا.....؟'' سکینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''پولیس آئی تھی۔''

''پولیس.....؟'' سکینہ کی بھویں تن گئیں۔

''ہاں..... پولیس نے اُن تمام نرسوں اور لیڈی ڈاکٹرز کے پتے دریافت کئے جو ہوسٹل کی بجائے اپنے گھروں میں رہتی ہیں۔ پولیس کو مسلمان لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔''

''کیوں..... پولیس یہ پتے کیوں دریافت کر رہی ہے؟''

''تمہیں پتہ نہیں ہے، تین روز پہلے بعض تخریب کاروں نے جمنا کے کنارے فوجی کیمپ تباہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن اُن کا ایک ساتھی پولیس کی گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے طبی امداد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ پولیس تمام کلینکوں اور پرائیویٹ ڈاکٹروں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ اب پولیس ان ڈاکٹروں اور نرسوں کے پتے بھی نوٹ کر رہی ہے جو ہوسٹلوں کی بجائے اپنے گھروں میں رہتی ہیں تاکہ اُن کو بھی چیک کیا جا سکے۔ تمہارا نام اور پتہ بھی لکھوایا گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے پولیس نے ان پتوں پر چیکنگ شروع کر دی ہے۔'' ٹینا نے بتایا۔

یہ اطلاع سکینہ کے لئے خاصی تشویش ناک تھی۔ لیکن اُس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ٹینا کے جانے کے بعد سکینہ ایک بار پھر پریشان ہو گئی۔ اُس نے طارق کو اس تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ وہ سکینہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''گھبراؤ نہیں سکینہ! میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر کسی قسم کی مصیبت

نازل ہو۔ میں، تم لوگوں کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ اگر اُس رات تمہارا باپ سڑک پر سے اُٹھا کر نہ لاتا تو میں یا تو پولیس کے ہاتھ لگ جاتا یا سڑک پر پڑے پڑے مر جاتا۔ تم نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم نے کہا کہ شاہ رُخ نے جس مکان کا پتہ بتایا تھا، وہ یہاں سے قریب ہی ہے۔ میں آج رات ہی منتقل ہو جاؤں گا۔ تم مجھے اُس مکان کا پتہ سمجھا دو!''

''لیکن تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ.....''

''میں اپنا خیال رکھوں گا۔'' طارق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میرا خیال ہے کہ اندھیرا پھیلتے ہی مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ اگر پولیس نے ہسپتال سے حاصل کر پر چیکنگ شروع کر دی تو وہ کسی بھی وقت یہاں آ سکتے ہیں۔''

سکینہ بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تقریباً گھنٹے بعد گلی میں تانگے کی آواز سنائی دی تو وہ دوڑتی ہوئی گیٹ پر پہنچ گئی۔ وہ سلمان ہی آج جلدی واپس آ گیا تھا۔ حسب معمول بچے بھی تانگے پر لد گئے تھے۔ سکینہ نے بچوں کو بھگا دیا اور گیٹ کھول دیا۔

''گھوڑا مت کھولنا بابا!'' سکینہ نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر دوڑتی ہوئی کے پاس پہنچ گئی۔ ''آج میری دوست ٹیٹا آئی تھی بابا! وہ بھی میرے ساتھ ہسپتال میں ہے۔'' سکینہ نے کہا اور مختصر الفاظ میں اُسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''یہ تو واقعی تشویش ناک بات ہے۔'' سلمان بولا۔ ''ہمیں رات گہری ہونے کا انتظا کی بجائے طارق کو اسی وقت یہاں سے ہٹا دینا چاہئے۔ تم اُس سے کہو، چلنے کے لئے جائے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔''

سلمان، تانگے کی سیٹوں کے نیچے کی جگہ خالی کرنے لگا، جہاں گھوڑے کے لئے اب میں دانہ، گھاس اور چنے وغیرہ رکھے رہتے تھے۔ سیٹوں کے نیچے کی جگہ خالی کر کے وہ تیز اُٹھاتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ طارق، تیار بیٹھا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس حالت میں یہاں سے جانا پڑ رہا ہے۔'' سلمان نے کہ طارق نے محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ پھر اُس نے اُن دونوں کا شکریہ ادا کیا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔

طارق کو تانگے کی سیٹوں کے نیچے خالی جگہ پر ٹھونس دیا گیا۔ یہ جگہ یوں تو خاصی بڑ طارق کو دُہرا ہو کر اُس میں سمانا پڑا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کی زخمی ٹانگ اور کند

تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ اُسے سیٹوں کے نیچے ٹھونسنے کے بعد سلمان نے بوری اور گھاس کے دو تین گٹھے بھی اندر ٹھونس دیئے اور پھر خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سکینہ نے سلمان کو اُس مکان کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ تانگے کے نکلنے کے بعد سکینہ نے گیٹ بند کر دیا اور کمرے میں آ کر ہر وہ نشان مٹانے لگی، جس سے یہاں طارق کی موجودگی ثابت ہو سکتی ہو۔ وہ طارق والا بستر جھاڑ ہی رہی تھی کہ باہر کا گیٹ دھڑ دھڑایا جانے لگا..... یوں لگتا تھا جیسے گیٹ توڑنے کی جوشش کی جا رہی ہو۔ سکینہ کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھی۔ اور پھر سکینہ نے جیسے ہی گیٹ کھولا، اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ سامنے دو پولیس والے کھڑے تھے.....

☆.....☆.....☆

گلی سے نکلتے ہوئے سلمان نے اُن دو پولیس والوں کو گلی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ پولیس والے اُسی کے گھر رہے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بروقت طارق کو لے کر گھر سے نکل آیا تھا۔ لیکن اُس کے خیال میں ابھی خطرہ موجود تھا۔ اُس نے تانگے کو بائیں طرف موڑتے ہ چابک رسید کر دیا۔ بڑی سڑک پر تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس نے تانگہ دائیں طرف کی گلی میں موڑ دیا۔ لیکن اچانک ہی ایک پولیس والے نے اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔ سلما کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ سلمان کو اُس پولیس والے کی صورت میں اپنی موت نظر آ گئی۔ اپنی تو اُسے پرواہ نہیں تھی۔ لیکن اُس کے خیال میں طارق کی جان قیمتی تھی۔ اُس نے کرلیا تھا کہ وہ طارق کو ہر قیمت پر بچانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لئے اُسے خواہ اپنی جا ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

''کیا بات ہے سرکار.....! اگر تمہیں کہیں جانا ہے تو کوئی اور سواری دیکھ لو! میں گھر جا ہوں۔ گھوڑا تھک گیا ہے۔ صبح سے جتا ہوا ہے۔'' سلمان نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تھانے چھوڑ آؤ! پھر جا کے گھوڑا کھول دینا۔ ایک ملزم کو لے کر جانا ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔ وہ اُس وقت ایک مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس نے دروازے طرف رُخ کر کے کسی کو آواز دی۔ دو اور پولیس والے مکان سے باہر آ گئے۔ اُن کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک جوان لڑکی بھی تھی۔ ایک پولیس والا اُس آدمی کو دھکے دیتا ہوا لا رہا تھا لڑکی کا ہاتھ دوسرے کانسٹیبل نے پکڑا ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ مکان سے کچھ اور لوگ بھی نکلے اور پولیس کو دیکھ کر چند راہ گیر بھی جمع ہو گئے تھے۔ دو پولیس والے، لڑکی کو لے کر اگلی سیٹ پر گئے۔ اُنہوں نے لڑکی کو اپنے درمیان میں اس طرح دبا لیا تھا کہ وہ سینڈوچ بن کر رہ گئی تیسرا کانسٹیبل، ادھیڑ عمر آدمی کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ کون ہیں سرکار! کیا، کیا ہے انہوں نے.....؟'' سلمان نے تانگہ ہانکتے ہوئے پوچھا

اس کی اپنی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔

''پیار کے پنچھی ہیں یہ دونوں.....'' آگے بیٹھے ہوئے ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''اس کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ یہ دونوں اندر عشق کی پینگیں بڑھانے لگے۔ اُوپر سے گھر والے آ گئے اور یہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ان کے عشق کی کہانی اب تھانے میں پوری ہو گی۔''

''میں بے قصور ہوں حوالدار جی! یہ آدمی مجھے ڈرا دھمکا کر اس مکان میں لے گیا تھا۔'' لڑکی نے کہا۔

''چپکی بیٹھی رہ.....!'' کانسٹیبل نے اُسے ڈانٹ دیا۔

سلمان خاموشی سے تانگہ ہانکتا رہا۔ اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُن پولیس والوں کو یہ پتہ چل جائے کہ جن سیٹوں پر وہ بیٹھے ہوئے ہیں، اُن کے نیچے وہ شخص موجود ہے، جس کی تلاش میں پورے دہلی کی پولیس پاگل ہو رہی ہے تو وہ پیار کے ان پنچھیوں کو بھول جائیں گے۔

سیٹ کے نیچے چھپا ہوا طارق بڑی اذیت میں تھا۔ وہ گٹھڑی کی طرح دُہرا تہرا ہو کر دُبکا ہوا تھا۔ اُس کے زخموں کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اور یوں لگتا تھا جیسے پورا جسم زخم بن گیا ہو جس میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ تانگے پر پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس کی ذرا سی غلطی اُسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ تو کوئی حرکت کر سکتا تھا اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکال سکتا تھا۔ تانگے کو لگنے والے دھچکوں سے اُس کی تکلیف میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ تکلیف اور خوف سے اُس کا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

آخر کار تانگہ ایک جگہ رُک گیا۔ مسافر اُتر گئے اور تانگہ پھر حرکت میں آ گیا۔ سیٹ کے نیچے دُبکا ہوا طارق ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اُس کی تکلیف اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ تانگہ ایک بار پھر رُک گیا۔ سلمان نیچے اُتر کر پچھلی طرف آ گیا اور سیٹ کے نیچے اس طرح ہاتھ مارنے لگا جیسے گھاس کے گٹھے درست کر رہا ہو۔

''مکان تو یہی ہے۔ لیکن اس وقت گلی میں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ وہ گزر جائیں تو میں دستک دوں۔'' اُس نے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''جو بھی دروازے کھولے، اُسے کہنا رحمان بابا کا مہمان آیا ہے۔'' طارق نے کراہتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

سلمان، سیٹ کے نیچے گھاس کے گٹھوں کو درست کرتا رہا۔ گلی میں سامنے سے دو عورتیں اور

تین آدمی آ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے دو آدمی اور بھی تھے۔

''کیوں بھئی تانگے والے! دلّی دروازے چلنا ہے؟'' قریب پہنچنے پر ایک آدمی نے کہا۔

''تانگہ خالی نہیں ہے سرکار! میں تو سواریوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ سامنے والے گھر گئے ہیں۔'' سلمان نے جواب دیا۔

وہ لوگ جیسے ہی آگے بڑھے، سلمان نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ ہی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک عورت کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔

''رحمان بابا کا مہمان آیا ہے۔'' سلمان نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

''کہاں ہے.....؟ اُسے جلدی سے اندر لے آؤ!'' عورت نے جواب دیا۔

سلمان نے محتاط نگاہوں سے گلی میں دونوں طرف دیکھا اور پھر طارق کو سیٹ کے نیچے سے نکال کر کندھے پر لا دلیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ طارق کو ایک کمرے میں بستر پر لٹانے کے بعد سلمان وہاں رُکا نہیں۔ اُسے اپنی بیٹی سکینہ کی فکر تھی۔ اُس نے دو پولیس والوں کو اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

مکان کا دروازہ کھولنے والی وہ عورت غالباً اس مکان کی مالکہ تھی۔ اُسے یقیناً پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ طارق کسی بھی وقت یا کسی بھی روز یہاں آ سکتا ہے۔ مکان کے دروازے کے سامنے ایک مختصر سی ڈیوڑھی تھی۔ جس کے اُوپر دو چھتی سی بنی ہوئی تھی۔ اُس دو چھتی میں عام طور پر گھر کا فالتو سامان رکھ دیا جاتا تھا۔ اُس دو چھتی پر جانے کے لئے دو راستے تھے۔ ایک ڈیوڑھی کی طرف سے اور دوسرا اندرونی کمرے سے۔ کوئی بھی راستہ ایک درمیانے سائز کی کھڑکی سے زیادہ کشادہ نہیں تھا۔

سلمان، طارق کو چارپائی پر لٹا کر جا چکا تھا۔ اور وہ ادھیڑ عمر عورت بھی دروازہ بند کر کے واپس آ گئی تھی۔ طارق اُس سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کی نظر عین سامنے دو چھتی کی کھڑکی نما راستے پر جم گئی جہاں سے آٹو میٹک رائفل کی ایک نال جھانکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ طارق کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی طارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ دل شیر تھا جس نے کھڑکی کے راستے سے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے فوراً ہی بعد حنا بھی اُسی راستے سے نیچے کود گئی۔

''میں تو رائفل کی نال دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا۔'' طارق نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دروازے پر جب تانگہ رُکا تھا تو حنا نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا تھا۔ تانگے والے نے اُس وقت سیٹوں کے نیچے جھک کر سرگوشی کی تھی جس پر حنا کو شبہ ہو گیا اور ہم دونوں رائفلیں سنبھال کر دو چھتی پر پہنچ گئے۔ ڈیوڑھی والا راستہ اور یہ کمرہ ہماری رائفلوں کی زد میں تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو اندر آنے والوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔'' دل شیر نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر بولا۔ ''ویسے یہ تانگے والا کون تھا؟''

''میرا محسن.....!'' طارق نے جواب دیا۔ ''اُس رات اگر یہ نہ ملتا تو میں پولیس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا۔ اُس کی بیٹی نرس ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف میری جان بچائی بلکہ تین دن تک مجھے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ آج شام سے کچھ پہلے اطلاع ملی تھی کہ پولیس میری تلاش میں سرکاری ہسپتالوں کی اُن مسلمان نرسوں کو چیک کر رہی ہے جو ہوسٹلوں کی بجائے اپنے گھروں میں رہتی ہیں۔ اُس گھر میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی، جہاں مجھے دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جا سکتا۔ اس لئے مجھے یہاں منتقل ہونا پڑا۔ ویسے یہ ایک لمبی داستان ہے۔ کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ تم کہو! دوستوں کا کیا حال ہے؟'' طارق نے کہا۔

''دوست تو سب خیریت سے ہیں۔ البتہ دُشمنوں کو بدہضمی ہو گئی ہے۔'' دل شیر نے جواب دیا۔ ''دہلی پولیس، شکاری کتوں کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ ٹریننگ کیمپ میں ہونے والے جانی نقصان نے حکومت کے ایوان ہلا کر رکھ دیئے ہیں۔ پورے شہر پر خوف و ہراس کی فضا طاری ہے۔ اب دبے لفظوں میں عوامی حلقوں کی طرف سے یہ بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اُس فوجی کیمپ کو ختم کیا جائے۔ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے بعض لیڈروں کو یہ علم ہو چکا ہے کہ یہ فوجی کیمپ کس مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اب تو اپوزیشن بھی یہ آواز اُٹھا رہی ہے کہ اسرائیل سے اس قسم کے معاہدے کے سلسلے میں اپوزیشن کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ نقصان اُٹھانا پڑا۔''

''کیا خیال ہے..... یہ ٹریننگ کیمپ ختم کر دیا جائے گا یا جاری رہے گا.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''اگر جاری بھی رکھا گیا تو اس میں تعطل پیدا ہو جائے گا۔ اور ہم چاہتے بھی یہی تھے کہ ان سرگرمیوں کو کم از کم فی الحال روک دیا جائے۔'' دل شیر نے جواب دیا۔

''لیکن یہ اپنے آدمیوں کو ٹریننگ کے لئے اسرائیل بھیجتے رہیں گے۔'' طارق بولا۔

''اس سلسلے میں تو ظاہر ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن بہرحال! کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ تم سناؤ! تمہاری تکلیف کیسی ہے؟''

''زخموں کو مندمل ہونے کے لئے آرام کی ضرورت ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''اگر سلمان کے گھر میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے مجھے آرام کا موقع نہ مل سکا۔'' طارق چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر پنڈت رگھومل والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

''اس کا مطلب ہے کہ سلمان اور اُس کی بیٹی سکینہ کے سر پر بھی خطرہ منڈلانے لگا ہے۔ بہر حال! ہم اُنہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ میں کل ہی شاہ رُخ سے اس سلسلے میں بات کروں گا'' دل شیر نے کہا اور ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ ''آج کھانے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟''

''کھانا تو تیار ہے۔ یہیں دری پر دستر خوان بچھا دُوں......؟'' عورت نے کہا۔

''ہاں...... یہیں لے آؤ۔ کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔'' دل شیر نے کہا۔

دری پر ہی دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا گیا۔ طارق کو، ٹرے میں رکھ کر کھانا چارپائی پر دے دیا گیا تھا۔ ابھی اُنہوں نے کھانے کے چند لقمے ہی لئے تھے کہ گلی میں یکے بعد دیگرے گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے بعد بہت سارے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں...... طارق اور دل شیر نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دل شیر کھانا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ اُس نے ڈیوڑھی کے دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا تو سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ گلی میں بجلی کے کھمبے پر جلنے والے بلب کی روشنی میں اُسے تین پولیس والے نظر آئے تھے۔ اُن تینوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ دروازے کے بالکل سامنے پولیس کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ دائیں بائیں بھی کچھ پولیس والے موجود تھے۔ وہ اگرچہ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اُن کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک پولیس والا عین سامنے والے مکان کے دروازے پر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ، جس شخص سے باتیں کر رہا تھا، وہ دروازے کے اندر کی طرف تھا۔ اس لئے نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل شیر، کمرے کی طرف بھاگا۔

''ہری اَپ...... پولیس اس مکان کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس والوں کی تعداد بارہ سے کم نہیں ہو گی۔ حنا! ایک رائفل طارق کو نکال کر دے دو اور تم اُوپر کی سیڑھیوں پر چلی جاؤ۔ مریم! تم طارق کے ساتھ بیٹھک کے دروازے کا خیال رکھو گی۔'' دل شیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

طارق، تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کی گود میں کمبل پر کھانے کی ٹرے رکھی ہوئی تھی جو بدحواسی میں اُلٹ گئی تھی۔ حنا اُسی وقت کمرے میں دوڑ گئی تھی۔ اُس کی واپسی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اُس نے ایک آٹومیٹک رائفل، طارق کے ہاتھوں میں تھما دی۔ دوسری

مریم کی طرف اُچھال دی اور خود اپنی رائفل لے کر سیڑھیوں کی طرف دوڑ گئی۔ دل شیر اپنی رائفل سنبھالے دوبارہ ڈیوڑھی والے دروازے پر آ گیا اور جھری سے باہر جھانکنے لگا۔ دروازے کے سامنے جیپ کے دوسری طرف ایک پولیس والے کے ساتھ سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس ایک آدمی کھڑا تھا۔ اب دل شیر نے اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ پولیس والا اُس سے کہہ رہا تھا۔

''تمہاری اطلاع غلط تو نہیں ٹھاکر......؟''

''نہیں سرکار......!'' ٹھاکر نے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، تانگے والے نے سیٹ کے نیچے سے ایک زخمی آدمی کو نکال کر کندھے پر لادا تھا اور اندر لے گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی زخمی ہے جس کی پولیس کو تلاش ہے۔ اس مکان میں اُس کے دوسرے ساتھی بھی موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... اب تم اپنے مکان میں چلے جاؤ!'' پولیس والے نے کہا۔ وہ غالباً اُس پارٹی کا انچارج تھا۔

دل شیر، دروازے سے ہٹ کر دوچھتی پر چڑھ گیا اور مورچہ لگا کر بیٹھ گیا۔ بیرونی دروازہ اُس کے عین سامنے تھا۔ کوئی بھی بچ کر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چند منٹ گزر گئے، گلی میں بھاری قدموں کی آوازیں گونجتی رہیں، پھر ایک گونجدار آواز سنائی دی۔

''ہم موتی منزل میں رہنے والوں سے مخاطب ہیں۔'' پولیس والے نے وہ نام دُہرایا جو مکان کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ ''ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہو۔ اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ اگر کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں صرف پانچ تک گنوں گا۔ اس کے بعد فائر کھول دیا جائے گا۔'' اس کے بعد چند سیکنڈ تک خاموشی رہی، پھر گنتی شروع ہو گئی......

پانچ کہنے کے ساتھ ہی فضا، فائرنگ کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ اندر سے اس فائرنگ کا جواب نہیں دیا گیا۔ دل شیر، دوچھتی پر تیار بیٹھا تھا۔ اُس کی اُنگلی ٹرائیگر پر تھی اور نظریں دروازے پر...... فائرنگ رُک گئی۔ پولیس پارٹی کے انچارج نے چیخ کر کچھ کہا اور پھر دروازے کو توڑا جانے لگا۔ غالباً رائفل کے دستے سے ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ دو منٹ میں دروازہ ٹوٹ گیا اور بیک وقت دو پولیس والوں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ اُن کے پیچھے دو پولیس والے اور بھی تھے۔

دل شیر اسی موقع کا منتظر تھا۔ اُس نے رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا...... ڈیوڑھی، فائرنگ اور

چیخوں کی ملی جلی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ تین پولیس والے ڈھیر ہو گئے جبکہ چوتھا دروازے سے باہر جا گرا تھا۔

باہر سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ لیکن پولیس والوں کی گولیاں سامنے والی دیوار میں لگ رہی تھیں اس لئے اُوپر دوچھتی میں بیٹھا ہوا دل شیر بالکل محفوظ تھا۔ بیٹھک کی طرف سے طارق اور مریم نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گلی سے دو پولیس والوں کی چیخیں سنائی دیں..... وہ تو زخمی ہو گئے تھے یا ختم ہو گئے تھے۔

''شنکر! تم دو آدمیوں کو لے کر دائیں طرف والے مکان سے چھت پر پہنچو! اور کرموا تم ایک آدمی کے ساتھ بائیں طرف والے مکان کی چھت پر پہنچ جاؤ..... وہ لوگ، چھت کے راستے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ میں وشوانا تھ اور گردھاری کے ساتھ گلی میں موجود ہوں۔'' پولیس آفیسر کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

دل شیر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُسے پولیس والوں کی تعداد کا پتہ چل گیا تھا۔ تین آدمی اُس کے سامنے مرے پڑے تھے، پانچ کو چھتوں پر پہنچنے کا حکم مل چکا تھا اور گلی میں آفیسر سمیت تین آدمی تھے۔

گلی میں فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ دل شیر آہستگی سے دوچھتی سے اُتر آیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس مکان کو گھیرے میں لے لیا گیا تو وہ چوہے کی طرح پکڑے جائیں گے۔ اور پکڑے جانے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لئے وہ گھیرے میں آنے سے پہلے ہر صورت میں اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

دل شیر، سینے کے بل رینگتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اگر دروازے کے سامنے گلی میں کوئی پولیس والا ہوتا تو اُسے یہاں تک پہنچنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ لیکن پولیس والے مختلف سمتوں سے آڑ میں کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔ دل شیر نے دروازے میں پڑی ہوئی ایک پولیس والے کی لاش کی آڑ لیتے ہوئے سر اُٹھا کر باہر دیکھا۔ بائیں طرف کار کے پیچھے ایک پولیس والا کھڑا مکان کی بیٹھک کے دروازے کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ اُس کی صرف کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ دل شیر نے نشانہ لے کر فائر کر دیا..... اُس کی گولی ٹھیک نشانے پر لگی۔ کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے اور پولیس والا کار کے پیچھے ڈھیر ہو گیا..... اُس کے منہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل سکی تھی۔ پولیس پارٹی کے انچارج اور اُس کے دوسرے ساتھی نے دروازے پر فائرنگ شروع کر دی لیکن آڑ میں ہونے کی وجہ سے دل شیر محفوظ ہی رہا۔

اب اُوپر سے بھی فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دونوں طرف کے مکانوں کی چھتوں پر

پولیس والے پہنچ چکے تھے اور حنا، مکان کی سیڑھیوں والے دروازے میں کھڑی فائرنگ کر کے انہیں روکے ہوئے تھی۔

دل شیر گھات لگائے بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد ایک اور پولیس والا ایک طرف سے دوڑ کر دوسری طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ وہ غالباً بہتر پوزیشن حاصل کرنے کے لئے سامنے والے ایک مکان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ لیکن دل شیر کی گولی نے اُسے وہاں تک پہنچنے کی مہلت نہیں دی۔ گولی اُس کی گردن میں لگی اور وہ مکان کے تھڑے پر ڈھیر ہو گیا..... یہ پولیس پارٹی کا انچارج تھا۔ اب گلی میں صرف ایک ہی پولیس والا رہ گیا تھا۔ باقی پولیس والے مکانوں کی چھتوں پر پہنچ چکے تھے۔

دل شیر کی نظریں اپنے مکان کے سامنے کھڑی پولیس جیپ پر جمی ہوئی تھیں۔ اگر وہ لوگ جیپ تک پہنچ جاتے تو آسانی سے فرار ہو سکتے تھے۔ گلی میں صرف ایک پولیس والا رہ گیا تھا۔ اور دل شیر کے خیال میں جیپ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر رینگتا ہوا اندر آ گیا۔ طارق اور مریم، بیٹھک کے دروازے پر جمے ہوئے تھے۔ دل شیر نے اُن دونوں کو ڈیوڑھی والے دروازے پر پہنچنے کو کہا اور خود اُوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

اُوپر، پولیس والے دونوں طرف والے مکانوں کی چھتوں پر تھے۔ حنا نے کسی کو بھی اپنے مکان کی چھت پر کودنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ، وقفے وقفے سے فائرنگ کرتے ہوئے اُنہیں روکے ہوئے تھی۔

''گلی میں صرف ایک پولیس والا رہ گیا ہے۔ ہم دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی جیپ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی تم نیچے آ جانا! اگر پولیس پارٹی کی کمک پہنچ گئی تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔'' دل شیر نے سرگوشیانہ لہجے میں حنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ نیچے آ گیا۔

مریم اور طارق ڈیوڑھی میں پہنچ چکے تھے۔ طارق، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

''طارق.....! کیا تم اُس جیپ تک پہنچ سکو گے؟'' دل شیر نے سرگوشی کی۔ ''گلی میں صرف ایک پولیس والا ہے۔ میں فائرنگ کر کے اُسے سامنے آنے سے روکے رکھوں گا۔ تم لوگ جیپ تک پہنچ جانا۔''

''ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں۔'' طارق نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

دل شیر، بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس نے باہر جھانکا ہی تھا کہ ایک گولی زن کی آواز

سے اُس کے سر کے اُوپر صرف دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی..... وہ ایک دم نیچے گر گیا اور اس طرف فائرنگ شروع کر دی، جس طرف سے گولی چلائی گئی تھی۔

''طارق..... ریڈی!'' دل شیر چیخا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے سیٹی بجا دی۔

طارق، مریم کا سہارا لے کر لنگڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف دوڑا۔ اس دوران حنا بھی اُوپر سے دوڑتی ہوئی آ گئی۔ اُس نے سیڑھیوں والا اُوپر کا دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ اُوپر سے پولیس والوں کو نیچے آنے سے کچھ دیر کے لئے روکا جا سکے۔

''جلدی کرو..... طارق کو سہارا دے کر جیپ پر چڑھاؤ!'' دل شیر بولا۔

طارق، جیپ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے اُسے خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ اُس نے اُچک کر جیپ پر چڑھنا چاہا تو گر پڑا۔ اتنی دیر میں حنا، وہاں پہنچ گئی۔ اُس نے مریم کی مدد سے طارق کو اُٹھا کر جیپ میں ڈالا اور خود بھی اُچک کر اُوپر چڑھ گئی۔ مریم، جیپ پر چڑھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ بھیانک انداز میں چیختی ہوئی نیچے گر گئی۔ دوسری طرف سے چلائی جانے والی پولیس کی گولی اُس کی پشت سے داخل ہو کر دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

دل شیر نے اُس سمت میں پے در پے کئی فائر کئے۔ پولیس والا غالباً کسی آڑ میں دبک گیا تھا۔ اس دوران سیڑھیوں والا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ پولیس والے دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دل شیر سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پولیس والے نیچے آ گئے تو اُن کے زندہ بھاگ نکلنے کا امکان ختم ہو جائے گا۔

طارق، جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ تکلیف کی شدت سے اُس کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ اُس کے ساتھ دوسری سیٹ پر بیٹھی ہوئی حنا نے اُس طرف فائرنگ شروع کر دی جس طرف پولیس والا چھپا ہوا تھا۔ اس دوران دل شیر بھی مکان سے باہر آ گیا۔ جیپ کے سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہی اُس نے انجن سٹارٹ کر دیا۔ حنا بدستور فائرنگ کر رہی تھی۔ اُس کی ایک گولی تقریباً بیس گز پیچھے کھڑی ہوئی ٹھیک کار کی ٹینکی پر لگی۔ دوسرے ہی لمحے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کار کے پرخچے اُڑ گئے.....

جیپ تیزی سے حرکت میں آ کر کئی گز دُور نکل چکی تھی۔ کار کے دھماکے سے آگ کا ایک گولہ سا اُوپر کو اُٹھا اور پھیلتا چلا گیا۔ کار کے جلتے ہوئے کچھ ٹکڑے آس پاس کے مکانوں پر بھی گرے تھے۔ جیپ تیزی سے دوڑ رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی حنا مسلسل فائرنگ کر رہی تھی۔

''گولیاں ضائع مت کرو حنا! ابھی ان کی ضرورت پڑے گی۔'' دل شیر نے چیخ کر کہا۔ حنا

نے فائرنگ بند کر دی۔

''طارق کی حالت بگڑ رہی ہے دل شیر!'' حنا، طارق پر جھکتے ہوئے بولی۔ اُس کا لباس خون سے تر ہو رہا تھا۔

جیپ مختلف گلیوں میں دوڑتی ہوئی مہاتما گاندھی روڈ پر نکل آئی۔ یہاں سے ایک گلی سے نکل کر وہ متھرا روڈ پر آ گئے۔ یہ سڑک، سٹیڈیم کے پچھلی طرف سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ کی طرف چلی گئی تھی۔ ایک موڑ سے ذرا آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے دل شیر نے جیپ روک لی۔ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت اُس کار میں بیٹھ رہے تھے۔ دونوں ادھیڑ عمر تھے۔ مرد کے لباس اور سر پر رکھی ہوئی مخصوص طرز کی ٹوپی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پارسی تھے۔ دل شیر، جیپ سے چھلانگ لگا کر اُن کے سامنے آ گیا۔ رائفل اُس کے سامنے تھی۔

''کار سے پیچھے ہٹ جاؤ..... ورنہ اُڑا دوں گا۔'' دل شیر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

''ماں.....'' پارسی کے حلق سے کراہ سی نکلی۔ رائفل دیکھ کر اُس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔

''ایسا کائے کو بولتا رے۔ پیسو چاہئے تو لے لو..... لے لو..... پر اپنے کو کچھ نائیں بولو۔''

''پیسو نہیں، کار کی چابی چاہئے۔'' دل شیر غرایا۔

''چابی کار میں لگے لے ہے۔ بیٹھو، بیٹھو..... یہ تمہارے باپ کا کار.....'' پارسی کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

''بکومت.....!'' دل شیر نے اُسے ڈانٹ دیا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے حنا کو بھی اشارہ کر دیا۔

حنا، طارق کو لے کر جیپ سے اُتر آئی۔ اُس نے پہلے طارق کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی اندر گھس گئی۔

''ماں.....'' پارسی ایک بار پھر کراہا۔ اُس کی ساتھی عورت پٹ سے سڑک پر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ منظر دیکھ کر اپنی اپنی سیٹیں چھوڑ کر کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے۔ دل شیر نے سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کیا اور کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔ پارسی وہیں کھڑا تھر تھر کانپتے ہوئے ماں، ماں کی گردان کر رہا تھا۔

کئی سمتوں سے پولیس سائرن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نیشنل آرٹ گیلری والی سڑک پر گھومتے ہی دل شیر چونک گیا..... سامنے سے پولیس کی ایک جیپ، سائرن بجاتی ہوئی آ

رہی تھی۔ دل شیر نے کار، سائیڈ میں کر لی۔ لیکن اُس کی رفتار ہلکی نہیں کی۔ پولیس کی جیپ انتہائی تیز رفتاری سے اُس کے قریب سے گزر گئی۔ دل شیر نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ کار، اب شاہجہاں روڈ کراس کرتی ہوئی مولانا آزاد روڈ پر پہنچ چکی تھی۔ دل شیر نے کار کی رفتار کم کر دی اور اُسے مختلف گلیوں میں گھماتا ہوا شاہ رُخ کے بنگلے والی گلی میں لے آیا۔ اور پھر چند ہی منٹ بعد کار، شاہ رُخ کے بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔

''حنا!'' وہ پورچ میں کار روکتے ہوئے بولا۔ ''تم طارق کو اندر لے جاؤ! میں کار کو گیراج میں چھوڑ کر آتا ہوں۔''

حنا، طارق کو سہارا دے کر اُتار رہی تھی کہ شاہ رُخ برآمدے والے دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اُس نے دوڑ کر طارق کو سہارا دیا اور اُسے کمرے میں لے آیا۔

''اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اسے فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے۔'' حنا بولی۔

''وہ میں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن تم لوگ.....''

''پوائنٹ ون پر پولیس نے ریڈ کر دیا تھا۔'' حنا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ بڑی مشکل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن مریم پولیس کی گولی کا نشانہ بن گئی۔''

''اوہ.....! لیکن طارق، تم لوگوں کو کہاں ملا؟ یہ تو سکینہ نامی کسی نرس کے گھر میں تھا۔'' شاہ رُخ نے کہا۔

''شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد طارق بھی پوائنٹ ون پر آ گیا۔ سکینہ کو اطلاع ملی تھی کہ پولیس اُس کے گھر پر ریڈ کرنے والی ہے، اس لئے اُس نے طارق کو اپنے باپ کے ساتھ پوائنٹ ون پر پہنچا دیا تھا۔''

''لیکن پولیس کو پوائنٹ ون کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟ وہ تو ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ سکینہ اور اُس کا باپ پکڑا گیا ہو اور اُنہوں نے پوائنٹ ون کے بارے میں پولیس کو بتا دیا ہو.....؟''

''نہیں.....!'' یہ دل شیر کی آواز تھی جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ''سکینہ کا باپ سلمان طارق کو تانگے کی سیٹوں کے نیچے چھپا کر لایا تھا۔ پوائنٹ ون کے سامنے جب وہ طارق کو سیٹوں کے نیچے سے نکال کر اندر لا رہا تھا تو سامنے کے مکان میں رہنے والے ایک ہندو ٹھاکر نے اُسے دیکھ لیا۔ اُسے غالباً شبہ ہو گیا تھا۔ اُس نے پولیس کو اطلاع کر دی اور پولیس نے ریڈ کر دیا۔ پولیس نے یہ چھاپہ غالباً کسی پلاننگ کے بغیر مارا تھا جس کا نتیجہ اُنہیں بھگتنا پڑا۔ اُس کے غالباً چھ آدمی جہنم واصل ہوئے ہیں۔ مریم بھی اُس وقت گولی کا نشانہ بن گئی، جب ہم پولیس کی

جیپ پر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''پہلے سلیم، پھر مراد علی اور اب مریم.....'' شاہ رُخ کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ ''لیکن ان کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ یہ لوگ اپنے خون سے آزادی کی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ ان کے نام، قیامت تک زندہ رہیں گے۔'' وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر طارق کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آفرین ہے تم پر طارق! پے در پے تکالیف اُٹھانے کے باوجود تم نے ہمت نہیں ہاری۔ تم واقعی ایک بہادر انسان ہو۔''

''ہمت تو وہ لوگ ہارتے ہیں جن میں کوئی جذبہ نہ ہو، کوئی لگن نہ ہو۔ اور میرے دل میں تو ایک ایسی لگن اور ایک ایسا جذبہ ہے، جو کبھی سرد نہیں پڑ سکتا۔'' طارق نے کہا۔

''دل شیر! اسے نیچے لے چلو۔ میں میڈیکل کٹ لے کر آتا ہوں۔ ڈاکٹر احمد سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' شاہ رُخ نے کہا اور فون کا ریسیور اُٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

دل شیر اور حنا، طارق کو تہہ خانے والے کمرے میں لے آئے تھے۔ چند منٹ بعد شاہ رُخ بھی میڈیکل کٹ لے کر آ گیا۔

''ڈاکٹر احمد، گیارہ بجے تک پہنچے گا۔ اُس وقت تک ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس کی پٹی تبدیل کر دیں۔'' شاہ رُخ نے کہا اور طارق کے کندھے پر لپٹی ہوئی خون آلود پٹی کھولنے لگا۔

لیکن اتفاق سے ڈاکٹر احمد جلدی پہنچ گیا۔ وہ شاہ رُخ کا دوست تھا۔ اور نئی دہلی ریلوے سٹیشن کے قریب اُس کا کلینک تھا۔ اُس نے پٹی کھول کر زخموں کا جائزہ لیا اور دوبارہ ڈریسنگ کر دی۔

''انفیکشن ہو گیا ہے۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسے کم از کم ایک ہفتے تک بستر سے ہلنے نہ دیا جائے۔ اگر زخم زیادہ بگڑ گیا تو زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کچھ دوائیں میرے پاس ہیں جو میں فوری طور پر دے رہا ہوں۔ کچھ دوائیں بازار سے منگوانی پڑیں گی۔ میں نے راستے میں آتے ہوئے ایک میڈیکل سٹور کھلا دیکھا تھا۔ لیکن میرے خیال میں وہاں سے کوئی دوا مناسب نہ ہو گا۔ کناٹ پلیس پر بھی بعض سٹور، رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ وہاں سے منگوا لو۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ اگر ٹمپریچر ہو جائے تو یہ دوا دے دینا۔ صرف دو گولیاں، زیادہ نہیں۔ میں صبح آ کر اسے دیکھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر.....شکریہ!'' شاہ رُخ نے اُس سے دواؤں والا پرچہ لے لیا۔

ڈاکٹر احمد کے جانے کے بعد شاہ رُخ نے ڈلہوزی ہاؤس فون کیا۔ اور اپنے ایک خاص آدمی کو دواؤں کے نام لکھوا کر اُسے ہدایت کی کہ وہ کسی میڈیکل سٹور سے یہ دوائیں لے کر راج پاتھ

کے چوراہے پر پہنچ جائے۔

فون کرنے کے پانچ منٹ بعد شاہ رُخ اپنی کار پر کوٹھی سے نکل گیا۔ جب وہ راج پاتھ کے چوراہے پر پہنچا تو اُس کا آدمی وہاں منتظر تھا۔ وہ موٹر بائیک پر آیا تھا۔ شاہ رُخ نے اُس سے دوائیں لے لیں اور واپس آ گیا۔ شہر میں بڑی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ راج پاتھ روڈ تک آتے جاتے دونوں مرتبہ اُسے چیک کیا گیا تھا۔

اُسی رات طارق کو بخار ہو گیا۔ اُس کا جسم رات بھر انگاروں کی طرح جلتا رہا۔ ڈاکٹر احمد کی دی ہوئی گولیاں بھی زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوئیں۔ حنا اُس کے پلنگ کے قریب بیٹھی وقفے وقفے سے اُس کی پیشانی پر برف کی پٹیاں رکھتی رہی۔ جب دن کی روشنی طلوع ہوئی تو طارق کا بخار کم ہونے لگا۔

طارق تقریباً ایک ہفتے تک بخار میں مبتلا رہا۔ اس دوران حنا کسی ماہر نرس کی طرح اُس کی تیمارداری کرتی رہی۔ یوں تو گھر میں جنت بی بی، دل شیر اور شاہ رُخ بھی موجود تھے۔ مگر طارق کی دیکھ بھال حنا نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اُسے طارق سے کچھ عجیب سا لگاؤ ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا جذبہ..... جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر احمد بھی طارق کو دیکھنے کے لئے باقاعدگی سے آ رہا تھا۔ پندرہ دن کی دیکھ بھال کے بعد طارق کے زخم مندمل ہونے لگے اور پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران ہر قسم کی سرگرمیاں معطل رہیں۔ دل شیر اور حنا نے اس دوران کوٹھی سے قدم تک باہر نہیں نکالا تھا۔ پولیس کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ چکی تھیں۔ اخبارات نے دہلی کی پولیس کو دنیا کی سب سے زیادہ ناکارہ پولیس قرار دیا تھا جو ایک مہینہ گزرنے کے بعد بھی دھماکے کرنے والوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ طارق اور اُس کے ساتھیوں کے حساب سے سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ اسرائیلی فوجی ماہرین واپس چلے گئے تھے اور یہ طارق اور اُس کے ساتھیوں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

طارق اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ کوٹھی میں بند پڑے پڑے ایک ماہ سے بھی زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ طارق سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح کوٹھی میں بند رہا تو اُس کی ہڈیوں کو زنگ لگ جائے گا۔ دل شیر اور حنا کا بھی یہی خیال تھا۔ اُنہوں نے اس سلسلے میں شاہ رُخ سے بات کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ گزشتہ کارروائیوں کے دوران ہم کسی کی نظروں میں نہیں آئے تھے۔ اللہ اب باہر نکلنے میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن احتیاط کی بہرحال ضرورت ہے۔''

''ہم محتاط رہیں گے۔'' دل شیر بولا۔

''پروگرام کیا ہے.....؟'' شاہ رُخ نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے باری باری اُن تینوں کی طرف دیکھا۔

''سنا ہے، اوبیرائے ہوٹل میں ایک اسرائیلی رقاصہ آج رات اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی ہے۔ ہم اُس یہودی رقاصہ کی یاترا کرنا چاہتے ہیں۔'' دل شیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا.....؟'' شاہ رُخ نے اُسے گھورا۔

''آج کے اخبار میں اُس کی تصویریں چھپی ہیں۔'' دل شیر نے جواب دیا۔ ''بھارتی ثقافت کے وزیر آج کے اس پروگرام کے مہمان خصوصی ہوں گے۔ شہر کی بعض اہم شخصیات کو بھی ہوٹل کی طرف سے مدعو کیا گیا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اُس رقاصہ میں ایسی کیا بات ہے؟''

''بہت ہی احمق آدمی ہو۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ ''خاص بات کیا ہو گی؟ ہوٹل کی انتظامیہ نے ثقافت کے وزیر اور چند اہم اور معزز شخصیات کو مدعو کر لیا۔ ایسی باتوں کے دو ہی مقاصد ہوا کرتے ہیں۔ وزیر کی آمد سے مفت کی پبلسٹی ملے گی اور دوسرا مقصد یہ کہ ہوٹل کی انتظامیہ، حکومت سے اپنا کوئی کام نکلوانا چاہتی ہو گی کاروباری لوگ اس قسم کے ہتھکنڈے تو استعمال کیا ہی کرتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ بہرحال! تم لوگ اوبیرائے جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ طارق کا حلیہ بھی کچھ بدلا ہوا ہی لگ رہا ہے۔ اسے تہاڑ جیل کے مفرور قیدی کی حیثیت سے بھی نہیں پہچانا جا سکتا۔ واپسی کب تک ہو گی تم لوگوں کی.....؟''

''یہ تو پروگرام پر منحصر ہے۔ پروگرام اچھا ہوا تو آخر تک دیکھیں گے۔ بصورت دیگر جلدی آ جائیں گے۔'' دل شیر نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''ہم تمہاری سفید امبیسڈر گاڑی لے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... لے جاؤ!'' شاہ رُخ نے جواب دیا۔

دل شیر نے میز پر سے چابی اُٹھالی اور وہ تینوں باہر نکل آئے۔ حنا نے نیلے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بلاؤز سلیولیس تھا۔ اُس لباس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ بیماری کے دوران طارق نے داڑھی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ چھوٹی گول داڑھی اور بھاری مونچھیں اُس کے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

جب وہ ہوٹل اوبیرائے پہنچے تو پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ سٹیج پر اسرائیلی رقاصہ اپنی عریانیت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ سٹیج کے سامنے والی سیٹوں پر بھارتی ثقافت کا وزیر اور دیگر مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنہیں بھی ہال کے آخر میں ایک ٹیبل مل گئی جسے اُنہوں نے غنیمت جانا۔ لوگ،

رقاصہ کی ہر ادا پر تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے۔ لیکن طارق کے خیال میں یہ داد اُس کے فن کی نہیں، اُس کی عریانیت اور جسم کے خوبصورت زاویوں کو دی جا رہی تھی۔ دل شیر اپنی کرسی پر بیٹھا بڑے غور سے رقاصہ کو دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ کرسی سے اُٹھ گیا۔

''چلو..... بال رُوم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''کیوں..... رقاصہ پسند نہیں آئی کیا؟'' طارق مسکرایا۔

''یہی سمجھ لو!'' دل شیر نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ لوگ بال رُوم میں آ گئے۔ اس خوبصورت ہال میں ایک طرف بہت بڑا بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ مختلف میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے اپنے پسندیدہ مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔ یہ لوگ بھی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ دل شیر نے ویٹر کو کافی کے لئے کہہ دیا۔ حنا دلچسپ نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایسے ہوٹلوں میں صرف وہی لوگ آ سکتے تھے جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہو۔ اس قسم کے ہوٹل دراصل! بڑے لوگوں کے لئے عیاشی کے اڈے تھے۔ یہاں شکار اور شکاری ایک دوسرے کی گھات میں رہتے تھے۔ کوئی شکار کرتا اور کوئی شکار ہو جاتا۔ حنا دیکھ رہی تھی کہ ہر میز پر کوئی نہ کوئی خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ ایک میز پر ایک نہایت بدصورت، کالے کلوٹے اور بھاری بھرکم آدمی کے ساتھ بہت ہی دھان پان اور حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر لنگور کے پہلو میں حور والا محاورہ ذہن میں اُبھر آتا تھا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ حسین لڑکی اُس لنگور سے محبت کرتی ہوگی۔ اُسے محبت تو اُن کڑکڑاتے کرنسی نوٹوں سے تھی جو اُس لنگور کی جیب میں بھرے ہوئے تھے۔

حنا نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ بہت سی نظریں اُس کا بھی طواف کر رہی تھیں۔ یہ اُن عیاش مردوں کی ہوس بھری نظریں تھیں جو کبھی ایک عورت پر اکتفا نہیں کرتے۔

اسی لمحے ویٹر نے اُن کی میز پر کافی لگا دی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی حنا متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دائیں طرف تیسرے نمبر کی میز پر ایک جوان عورت اور ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر مرد بیٹھا ہوا تھا۔ حنا نے محسوس کیا کہ وہ عورت بار بار طارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''طارق.....!'' حنا نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''وہ عورت، تم میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے۔ اُس کی نظریں بار بار تمہاری طرف اُٹھ رہی ہیں۔ دائیں طرف، تیسری میز پر اورنج ساڑھی والی۔''

طارق نے غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر اُس طرف دیکھا۔ اُس عورت کے چہرے پر نظر

پڑتے ہی اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... ہاتھ میں پکڑا ہوا کافی کا مگ چھلک پڑا۔ وہ عورت مادھوری تھی۔

''اپنے حواس ٹھکانے رکھو!'' دل شیر نے سرگوشی کی۔ ''یہ عورت کون ہے..... جانتے ہو اسے؟''

''مادھوری ہے.....'' طارق نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''تہاڑ جیل سے فرار ہونے کے بعد میں نے اور پشکر نے اس کے فلیٹ میں پناہ لی تھی۔ میں، تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ مادھوری کس طرح ہمارے ہاتھ لگی تھی۔ لیکن یہ تو گرفتار ہو گئی تھی اور اُس نے میرے اور پشکر کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس سے چند روز پہلے اُس کا شوہر اپنے مالک کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔ لیکن..... لیکن..... یہ یہاں.....؟''

''تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ ہو سکتا ہے، یہ مادھوری کی شکل سے ملتی جلتی کوئی اور عورت ہو۔'' اس مرتبہ حنا نے سرگوشی کی۔

''نہیں.....'' طارق نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی، جس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے پہچان چکی ہے۔''

''خیر..... آرام سے بیٹھے رہو! دیکھ لیں گے۔'' دل شیر نے کہا۔

وہ مادھوری ہی تھی۔ اور اُس نے طارق کو پہچان لیا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھی کی طرف جھکتے ہوئے کوئی سرگوشی بھی کی تھی۔ چند منٹ بعد مادھوری نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ کا گوشہ دبا کر مخصوص اشارہ کیا اور میز سے اُٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلی، طارق نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ جب باہر نکلا تو مادھوری اُسے بائیں طرف کھڑی نظر آ گئی۔ طارق تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ آؤ! سوئمنگ پول کی طرف چلتے ہیں۔'' مادھوری نے کہا۔

وہ دونوں ہوٹل کی وسیع و عریض عمارت کے پچھلی طرف آ گئے۔ یہاں سوئمنگ پول کے علاوہ ایک وسیع اور خوبصورت لان بھی تھا۔ وہ لان میں ایک کینوپی کے نیچے آ کر رُک گئے۔ سوئمنگ پول بند تھا۔ اس لئے آس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کینوپی کے نیچے بینچ پر بیٹھ گئے۔

''تم اس طرح پبلک مقامات پر آ کر غلطی نہیں کر رہے؟ تم جانتے ہو کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے اور تمہاری تصویر صرف دلّی ہی نہیں، پورے بھارت کے تھانوں میں لگی ہوئی ہے۔''

مادھوری نے کہا۔

''میری بات چھوڑو۔ لیکن تم...... یہ کایا پلٹ کیسی؟ میں نے تو اخبار میں تمہاری گرفتاری کی خبر پڑھی تھی۔'' طارق نے کہا۔

''ہاں...... میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اور اب پولیس کی مہربانی سے ہی یہ شاندار زندگی گزار رہی ہوں۔'' مادھوری نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں......!'' طارق نے اُسے گھورا۔

''گرفتاری کے بعد میں نے پولیس کو سچ سچ بتا دیا تھا کہ تم لوگ مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر میرے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ میرا، تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران ایک پولیس آفیسر مجھ پر خاصا مہربان ہو چکا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا پتی قتل کے الزام میں مفرور ہے اور میں بالکل اکیلی ہوں۔ اُس پولیس آفیسر کی بیوی مر چکی ہے۔ اُس کی ایک بیٹی ہے جو شملہ کے ایک انگریزی سکول میں پڑھتی ہے اور وہیں رہتی ہے۔ وہ پولیس آفیسر پہلے میرے فلیٹ پر آتا رہا، پھر اپنے گھر لے گیا۔ اب میں اُس کی رکھیل ہوں۔''

''اور تمہارے ساتھ یہ آدمی کون ہے......؟'' طارق نے پوچھا۔

''وہی پولیس آفیسر۔'' مادھوری نے جواب دیا۔ ''ہے تو معمولی سا انسپکٹر۔ لیکن بہت دولت مند ہے۔ بڑی عیش کراتا ہے مجھے۔ اُسے تم پر شبہ ہو گیا ہے۔ تمہاری طرف میری توجہ اُسی نے مبذول کرائی تھی۔ اُس نے تمہاری طرف اِشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم جیل سے بھاگے ہوئے وہی قیدی تو نہیں جس نے میرے گھر میں پناہ لی تھی؟ میں نے اُسے ٹال دیا کہ وہ نہیں ہو۔''

''تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟'' طارق نے کہا۔

''تمہارے کردار نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔'' مادھوری نے جواب دیا۔ ''تم تقریباً چوبیس گھنٹے میرے فلیٹ پر رہے۔ میں نے تمہیں پیشکش بھی کی تھی، لیکن تم نے اُلٹا مجھے ڈانٹ دیا۔ اب میں نے تمہیں اسی لئے باہر بلایا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ! ورنہ ممکن ہے، وہ پولیس آفیسر تم سے کچھ باز پرس کرے اور تم پھنس جاؤ۔''

''شکریہ مادھوری......!'' طارق بولا۔ ''میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔''

ٹھیک اُسی لمحے طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھنڈی چیز اُس کی گردن سے آ لگی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔

''تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے مسٹر! مجھے تم پر شبہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا، اب تم لوگوں کی باتوں سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہاتھ اُٹھا کر کھڑے ہو جاؤ...... کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔''

طارق کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اُس نے کن انکھیوں سے مادھوری کی طرف دیکھا۔ اُس کا خیال تھا کہ مادھوری نے اُسے پھنسانے کے لئے یہ سارا ڈرامہ رچایا تھا۔ لیکن مادھوری کا چہرہ بھی خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور اُس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس صورت حال نے اُسے بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔

طارق بینچ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا لئے۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر! میں، وہ نہیں ہو جو تم سمجھ رہے ہو۔'' طارق بولا۔

''بند کرو بکواس! میں تم دونوں کی باتیں سن چکا ہوں۔'' وہ غرایا۔ ''اور یہ کتیا...... یہ تو مارِ آستین ثابت ہوئی ہے۔ اس کا تو وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گی۔''

''یاد تو تم کرو گے مسٹر...... پستول پھینک کر ہاتھ اُوپر اُٹھا لو! زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش کی تو جسم میں اتنی گولیاں پیوست ہوں گی کہ کوئی انہیں شمار بھی نہیں کر سکے گا۔''

یہ آواز پولیس آفیسر کی پشت سے سنائی دی تھی۔ اور ظاہر ہے، وہ دل شیر کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟ پولیس آفیسر کو اپنی پشت پر کوئی سخت سی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا چہرہ دھواں ہو گیا اور اُس نے پستول طارق کی گردن سے ہٹا کر آگے پھینک دیا۔

''پستول اُٹھا لو طارق!'' دل شیر نے کہا۔

طارق نے جلدی سے آگے بڑھ کر پستول اُٹھا لیا۔ اس دوران دل شیر سامنے آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی لکڑی تھی۔ یہ لکڑی ہی اُس نے پولیس آفیسر کی پشت سے لگا کر اُسے پستول پھینکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تم تو بڑے بزدل نکلے۔'' دل شیر، لکڑی کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔

''تت...... تم لوگ بچ کر نہیں جا سکو گے۔'' پولیس آفیسر ہکلایا۔ ''ہوٹل میں اس وقت سادہ لباس میں درجنوں پولیس والے موجود ہیں۔ تم لوگ بھاگ نہیں سکو گے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' دل شیر مسکرایا۔ ''لیکن وہ تمام پولیس والے تمہارے منسٹر کے ساتھ اُس بوڑھی رقاصہ کے حسن کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی تمہارے منسٹر کو بھی گولی مار دے تو انہیں پتہ نہیں چلے گا۔''

پولیس آفیسر خوف زدہ سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دل شیر نے جو کچھ کہا تھا، وہ

درست تھا۔ ہوٹل میں اگرچہ سادہ لباس میں بھی کئی پولیس والے موجود تھے۔ لیکن وہ سب سب ہال میں یا مین گیٹ کی طرف تھے۔ سوئمنگ پول پر کیا ہو رہا تھا؟ یہ تو کسی نے سوچا بھی ہوگا۔

پولیس آفیسر نے اچانک ہی طارق پر چھلانگ لگا دی۔ اُس نے ایک ہاتھ، طارق پستول والے ہاتھ پر ڈال دیا۔ طارق کے لئے یہ صورتِ حال قطعی غیر متوقع تھی۔ پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس آفیسر نے پستول پر چھلانگ لگائی ٹھیک اُسی وقت مادھوری نے بھی پستول پر چھلانگ لگا دی۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود اُسے احساس تھا کہ پستول اُس پولیس آفیسر کے ہاتھ نہیں لگنا چاہئے۔ پستول، مادھوری کے جسم کے نیچے دب گیا۔ پولیس آفیسر پستول کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

پولیس آفیسر کا ہاتھ، پستول پر پہنچ گیا تھا۔ مادھوری نے دانت اُس کے بازو پر گاڑ دیئے پولیس آفیسر کی اُنگلی، ٹرائیگر پر تھی۔ ٹرائیگر دب گیا اور گولی مادھوری کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست ہوگئی..... پستول چونکہ اُس کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس لئے فائر کی آواز بھی دب کر رہ گئی تھی۔

طارق نے اگرچہ فوراً ہی پولیس آفیسر پر چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن اُسے دیر ہو چکی تھی۔ اُس نے ایک گھٹنا پولیس آفیسر کے کندھے پر رکھ دیا اور اپنا ایک بازو اُس کے گلے میں ڈال کر دبانے لگا۔ پولیس آفیسر کا سانس گھٹنے لگا۔ پستول پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ طارق اُس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے بازو کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز اُبھری پولیس آفیسر کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اُس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ لیکن طارق نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پولیس آفیسر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ ختم ہو چکا تھا طارق اُس کے اُوپر سے اُٹھ گیا اور پھر اُس کی لاش گھسیٹ کر سوئمنگ پول میں پھینک دی۔ پھر اُس نے مادھوری کو سیدھا کیا۔ اُس کے سینے سے بہنے والا خون جمتا جا رہا تھا۔ وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ طارق نے پولیس آفیسر کا پستول اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

''حنا کہاں ہے.....؟ اب نکل چلو یہاں سے!'' طارق نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''حنا، گاڑی لے کر پچھلی سڑک پر پہنچ چکی ہوگی۔ میرے ساتھ آؤ! ایک چھوٹا دروازہ پیچھے دیوار میں بھی ہے۔ ہم اُس طرف سے نکل جائیں گے۔'' دل شیر نے کہا۔

وہ لان میں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے ہوٹل کی عمارت کی عقبی سمت میں چلنے لگی۔ پچھلی طرف

کی لانڈری اور ملازمین کے کوارٹرز وغیرہ تھے۔ وہ اُن کوارٹروں کے پچھلی طرف سے ہوتے ہوئے پچھلی دیوار کے قریب آ گئے۔ یہاں ملازمین کی آمد و رفت کے لئے ایک چھوٹا گیٹ تھا۔ دو آدمی گیٹ کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر تھے اور اُنہوں نے سردی سے بچنے کے لئے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ طارق اور دل شیر اُن کی طرف دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گئے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمیوں نے بھی اُن کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

وہ دونوں پچھلی سڑک پر آ کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی دائیں طرف سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ اُن کے قریب رُک گئی۔ وہ اُنہی کی کار تھی۔ سٹیئرنگ کے سامنے حنا بیٹھی ہوئی تھی۔

''جلدی بیٹھو..... انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے کار میں بیٹھتے دیکھ کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف بھاگا تھا۔'' حنا نے کہا۔

وہ دونوں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دل شیر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور طارق پچھلی سیٹ پر۔ کار ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی۔ ٹھیک اُسی لمحے ایک موٹر سائیکل موڑ گھوم کر اُس طرف آ رہی تھی۔ حنا نے کار کا رُخ لودھی روڈ کی طرف کر دیا۔ موٹر سائیکل بھی اُن کے پیچھے اسی طرف گھومی

یہ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ سڑک پر آمد و رفت خاصی تھی۔ حنا کار چلانے میں بڑی مہارت کا ثبوت دے رہی تھی۔ ایک موقع پر اُسے کار کی رفتار کم کرنا پڑی۔ اس دوران موٹر سائیکل قریب آ گئی۔ موٹر سائیکل سوار کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ پستول حنا کی طرف اُٹھاتے ہوئے چیخا۔

''کار روک لو لڑکی! ورنہ گولی مار دوں گا۔''

حنا نے کار کی رفتار کم کر دی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے طارق نے غیر محسوس انداز میں پستول والا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور موٹر سائیکل سوار کے سر پر فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی موٹر سائیکل سوار کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ موٹر سائیکل لہراتی ہوئی سامنے سے آنے والی ایک کار سے ٹکرا گئی۔ طارق چاہتا تو اُسے محض زخمی کر کے اپنے تعاقب سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ حنا نے اُن تینوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بعد میں اُنہیں شناخت بھی کر سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے موٹر سائیکل سوار کو ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

حنا نے کار کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد کار، پرتھوی راج روڈ پر گھوم کر شاہجہاں روڈ سے گزرتی ہوئی مولانا آزاد روڈ پر مڑ گئی اس واقعے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر گھر میں آ کر بیٹھ گئے۔ اگرچہ اُنہیں شناخت کرنے والے ختم ہو چکے تھے۔ لیکن احتیاط کا تقاضہ یہی تھا

کہ وہ چند روز روپوش رہیں۔

تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ طارق اکثر سوچا کرتا تھا کہ چار سال پہلے وہ جس مشن پر
تھا، وہ کیا تھا؟ آخر ایک روز اُس نے جب اس موضوع پر شاہ رُخ سے بات کی تو اُس
کہ وہ مشن تو اُن کے پکڑے جانے کی وجہ سے ختم کر دیا گیا تھا۔ اس دوران جو چھوٹی
کارروائیاں اُنہوں نے کی تھیں، ان سے لبریشن فرنٹ کو بے حد سہارا ملا تھا۔ ان کار
سے دہلی کی حکومت بوکھلا گئی تھی۔ دہلی پولیس ''تخریب کاروں'' کی تلاش میں شکاری کی
طرح پھر رہی تھی۔ اصل ''مجرم'' تو اُن کے ہاتھ نہ آ سکے البتہ سینکڑوں بے گناہوں کو
سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ دوسری طرف کشمیر میں بھی کشمیری مجاہدین کے خلاف
کارروائیوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ ہزاروں بے گناہ کشمیری، پولیس اور فوج کے ہاتھوں مار
رہے تھے۔ اُن کے گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ انہی دنوں یہ خبر بھی آئی کہ سری نگر کے ق
سوپور میں کشمیری مسلمانوں کی ایک بستی کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ بھارتی فوج نے
مسلمانوں کو اُن کے گھروں میں زندہ جلا دیا تھا۔ بھارتی اخبارات تو اس قسم کی خبریں شائع
کر رہے تھے، لیکن ریڈیو پاکستان اور بی بی سی سے طارق کو صورتِ حال کا کچھ علم ہو رہا تھا
خبریں سن سن کر اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کار ایک روز اُس نے واپس جا
فیصلہ سنا دیا۔

''ممکن ہے، تمہارا فیصلہ درست ہو۔ لیکن ہم یہاں جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وہ اپنی سرزمی
آزادی کے لئے ہی کر رہے ہیں۔ آزادی کے اس جہاد میں تمہارا بھی اتنا ہی حصہ ہے
وادی میں بھیڑیا صفت، بھارتی فوجیوں سے لڑنے والے مجاہدین کا ہے۔ ہماری ان کاررو
نے بھارتی حکومت کی ساکھ کو جو نقصان پہنچایا ہے، اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ کاررو
دراصل ہمارے اس مشن کا حصہ ہیں، جس کا مقصد ہندوستان میں کشمیریوں کے حق میں را
عامہ کو ہموار کرنا ہے۔ ٹریننگ کیمپ کی تباہی کے بعد تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ عوام نے حکو
کی پالیسی کے خلاف کس ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔ یہی ہماری کامیابی ہے۔ اگر ہم رائے عا
اپنے حق میں ہموار کر سکیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اسے نہ صرف ہمیں اخلاقی
حاصل ہو گی بلکہ حکومت کی پالیسی پر کسی نہ کسی حد تک ہمارے حق میں اثر انداز ہو گی۔'' شاہ
چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''بھارت کی حکومت یومِ جمہوریہ منانے کی تیاری کر رہی
سری نگر اور پوری وادی میں کشمیری مسلمانوں نے بھارتی حکومت کے خلاف مظاہروں کا پرو
بنایا ہے۔ ہمیں بھی اس قسم کی ہدایات دی گئی ہیں۔ دہلی میں کشمیری مسلمان مظاہرے کریں

ی ٹیم اپنی کارروائی کرے گی۔ اس کارروائی میں ہمارے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے جن
پہلی مرتبہ ملو گے۔ بھارت کے یومِ جمہوریہ میں اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ اُس
ر تم یہاں رُکنا پسند کرو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ مجھے تمہارے جانے پر کوئی اعتراض نہ ہو

''ٹھیک ہے...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' طارق نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔
''گڈ...... مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' شاہ رُخ نے کہا۔ ''کل رات میں نے ڈلہوزی ہاؤس
میٹنگ بلوائی ہے۔ اُس میٹنگ میں وہ سب لوگ شریک ہوں گے جو اِس مشن میں حصہ
رہے ہیں۔ دو مجاہدین، حال ہی میں سری نگر سے آئے ہیں۔ وہ بھی اپنی تجاویز پیش کریں
میں تو کل دوپہر کے بعد گھر سے چلا جاؤں گا۔ دل شیر بھی صبح ہی چلا جائے گا۔ تم حنا کو
لے کر آ جانا۔ میٹنگ کا وقت، رات دس بجے رکھا گیا ہے۔''
''ٹھیک ہے...... میں حنا کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔'' طارق نے جواب دیا۔
اُس رات طارق دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ پچھلے پہر اُس کی آنکھ لگی تو صبح دیر تک سوتا رہا۔ جب
ہوا تو پتہ چلا کہ حنا کے سوا گھر پر کوئی نہیں ہے۔ طارق نے تیار ہو کر ناشتہ کیا اور ڈرائنگ
میں آ گیا، جہاں حنا بھی موجود تھی۔ وہ دونوں باتوں میں وقت گزارتے رہے۔
آٹھ بجے رات کا کھانا کھا کر وہ کوٹھی سے نکل گئے۔ کوٹھی میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ کچھ دُور
ک چلتے رہے، پھر اُنہیں ایک ٹیکسی مل گئی جس سے وہ کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ ڈلہوزی ہاؤس
میٹنگ کا وقت دس بجے کا تھا۔ ساڑھے نو بجے تک وہ دونوں شاپنگ سنٹر میں گھومتے رہے
ساڑھے نو بجے ڈلہوزی ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ آج یہاں ایک مصری رقاصہ کا پروگرام تھا۔
وں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ حنا اور طارق کونے کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ اُن سے
ی میز پر ایک ایسا آدمی بیٹھا تھا جسے دیکھ کر طارق چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُسے
جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس شخص کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟ وہ
بھی اُس کی طرف دیکھ کر خفیف سے انداز میں مسکرا دیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ شخص اپنی میز
اُٹھ کر اُس طرف چلا گیا، جہاں باتھ رُومز کی طرف جانے والا راستہ تھا۔
نو بج کر پچاس منٹ پر حنا، میز سے اُٹھ گئی۔ وہ لیڈیز رُوم کی طرف گئی تھی۔ اُس کے ٹھیک
منٹ بعد طارق نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ باتھ رُومز والی راہداری میں داخل ہو کر وہ بائیں
مڑ گیا۔ اور پھر مختلف راہداریوں اور خفیہ راستوں سے ہوتا ہوا جب وہ تہہ خانے والے
میں پہنچا تو وہاں اُس شخص کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر چونک گیا جسے ہال میں ساتھ والی میز

پر بیٹھے دیکھا تھا۔

اس کمرے میں دیواروں کے ساتھ صوفے بچھے ہوئے تھے جن پر آٹھ آدمی اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے ایک تو حنا تھی اور دوسری طارق کے لئے اجنبی تھی۔ اُس کی عمر اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ خاصی حسین تھی وہ بھی۔ مردوں میں گلاب دین بھی موجود تھا۔ اُس کی یہاں موجودگی ثابت کر رہی تھی کہ شاہ رُخ سے اُس کا مستقل رابطہ رہا تھا۔ ٹھیک بجے ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر سب لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُس نے سب سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے کچھ دیر بعد شاہین کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ تب طارق کو پتہ کہ ہال میں دوسری میز پر بیٹھے ہوئے جس شخص کا چہرہ اُسے جانا پہچانا لگا تھا، وہ لبریشن فرنٹ ایک مجاہد تھا اور صرف ایک دن پہلے فرنٹ کی طرف سے کچھ تجاویز لے کر سرینگر سے آیا تھا۔ کا نام مبارک علی تھا۔ اب طارق کو سب کچھ یاد آ گیا تھا کہ اُسے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ طا نے کئی سال پہلے جس کیمپ میں ٹریننگ حاصل کی تھی، مبارک علی اُس کیمپ کا انچارج تھا۔ وہ شخص، جسے دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہو گئے تھے، اُس کا تعلق بھی فرنٹ سے تھا اور وہ بھی ایک روز پہلے ہی سرینگر سے آیا تھا۔

تعارف کے بعد باقاعدہ میٹنگ شروع ہو گئی اور سب لوگ بھارت کا یومِ جمہوریہ ''شاہانہ شان'' طریقے سے منانے کے لئے تجاویز پیش کرنے لگے۔

☆

25 اور 26 جنوری کی درمیانی شب گیارہ بجے، طارق مندر مارگ پر لکشمی نارائن مندر سے چند گز دُور ایک مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ نیلم نامی اُس خوب صورت عورت کا مکان تھا، جو اُس رات میٹنگ میں شریک تھی۔ اُس رات میٹنگ میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کس کو کس کے ساتھ مل کر کیا کام کرنا ہے؟ طے شدہ پروگرام کے مطابق طارق کو آج کی رات نیلم کے ساتھ گزارنی تھی اور صبح اُسے نیلم کے ساتھ اپنی کارروائی مکمل کرنی تھی۔ پروگرام کے مطابق طارق کو رات بارہ بجے کے بعد نیلم کے مکان پر پہنچنا تھا۔ لیکن وہ ایک گھنٹہ پہلے ہی آ گیا تھا۔ دستک کے جواب میں دروازہ ایک نوعمر لڑکی نے کھولا تھا۔ لباس اور حلیے سے وہ کوئی ملازمہ ہی لگتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی طارق اندر آ گیا۔ لڑکی نے اُسے روکنے یا اُس سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی، یا پھر طارق نے اُسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''نیلم کہاں ہے.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ طارق آگے بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اُس نے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس طرح رہ گیا جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لئے ہوں..... دروازے کے بالکل سامنے پلنگ پر ایک مرد اور ایک لڑکی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے..... دروازے کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔ طارق کو دیکھ کر لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس نے مرد کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹایا اور خود کو چھپانے کے لئے بستر کی چادر کھینچ کر جسم پر لپیٹنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں شرم و حیا نام کی تو کوئی چیز نہیں تھی، لیکن چہرے پر خوف کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ ماتھے پر سرخ بندیا اُسے ہندو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر طارق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ گھوم کر تیزی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ کمسن لڑکی اب بھی ڈیوڑھی میں کھڑی تھی۔

''میں نے پوچھا تھا، نیلم کہاں ہے.....؟'' اس مرتبہ طارق نے قدرے سخت لہجے میں لڑکی سے دریافت کیا اور لڑکی نے اس مرتبہ اُوپر کی طرف اُنگلی اُٹھا دی۔

طارق نے گھور کر لڑکی کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک مختصر سا لاؤنج تھا اور اُس سے آگے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تاریکی تھی۔ دوسرے کمرے میں روشنی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ طارق نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

یہ کمرہ بہت شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ قیمتی صوفے، خوب صورت، دبیز قالین..... کمرے کی ہر چیز خوبصورت اور قیمتی تھی۔ دائیں طرف والے صوفے پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے تھے۔ آدمی ہندو لگتا تھا۔ عمر پچاس سے کچھ اُوپر ہی رہی ہوگی۔ اُس نے دھوتی کرتا اور سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ کلین شیو اور سر کے بال سفید تھے۔ وہ نیم مدہوش تھا۔ اُس نے اگرچہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا رکھی تھی لیکن اُس کا سر عورت کے کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ عورت، نیلم تھی..... اُس کے جسم سے ساڑھی کا پلو ہٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا، جسے وہ مرد کے ہونٹوں کی طرف لے جا رہی تھی۔ لیکن دروازے پر پیر کی ٹھوکر پڑنے سے وہ اس طرح اُچھلی کہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس اُس کے ساتھی مرد پر گر گیا۔ شراب نے اُس کا کرتا اور کوٹ تر کر دیا۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

''یہ..... یہ کون بدتمیز ہے؟'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے ہکلایا۔

''لالہ جی! یہ.....'' نیلم نے جھک کر اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

نیلم نے اُس بوڑھے ہندو کے کان میں نجانے کیا کہا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سرگوشی سے اُس کا سارا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔ اُس نے دروازے کے قریب پڑے ہوئے اپنے جوتے پہننے کی کوشش کی، مگر پیر اُلٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ آخر کار اُس نے جھک کر جوتے ہاتھوں میں اُٹھا لئے اور پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر باہر بھاگ گیا۔

طارق، دروازے کے قریب کھڑا خونخوار نگاہوں سے نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلم اپنی جگہ سے اُٹھ کر ساڑھی درست کرنے لگی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا کردار اتنا مکروہ اور گھناؤنا ہے۔'' طارق سلگتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کل رات کی میٹنگ میں تو تم دخترانِ کشمیر کی عزت و ناموس کی قسمیں کھا کر ہندو بھیڑیوں سے خوف ناک انتقام کی باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن اس وقت تمہارا یہ رُوپ دیکھ کر گھن آ رہی ہے مجھے۔ اور شاید یہی تمہارا اصل رُوپ ہے۔''

''بعض اوقات آنکھوں دیکھا بھی قابل یقین نہیں ہوتا۔'' نیلم نے مدھم لہجے میں کہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ''ضروری نہیں کہ حقیقت وہی ہو، جو تم نے دیکھی ہو۔''

''میری نظروں کو جھٹلانا چاہتی ہو.....؟'' طارق نے اُسے گھورا۔ ''اگر یہ سب کچھ فریب نظر تھا تو پھر حقیقت کیا ہے؟''

''حقیقت وہی ہے جو تمہارے دل میں ہے۔'' نیلم نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں، کشمیر کی بیٹی ہوں اور کشمیر کی کوئی بیٹی اپنی جان تو دے سکتی ہے، کسی کو اپنی عزت سے اس طرح کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آج وادی میں میری سینکڑوں بہنوں اور بیٹیوں کو رُسوا کیا جا رہا ہے۔ میں اُن کے بارے میں سنتی ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میں اُن کا انتقام لے رہی ہوں۔ یہ دُکانداری میں حصولِ زر، عیاشی یا جنسی تسکین کے لئے نہیں کر رہی۔ یہ تو وہ جال ہے جو میں ان خونخوار بھیڑیوں کو پھنسانے کے لئے پھیلائے بیٹھی ہوں۔ لوگوں کو میرا دامن داغدار نظر آتا ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ میرا دامن بالکل صاف اور بے داغ ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے وطن کی آزادی کے لئے کر رہی ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ تم نے جو کچھ دیکھا، وہ حقیقت میں وہ نہیں تھا جو تم سمجھ رہے ہو۔''

''لیکن نیچے ایک کمرے میں، میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ کیا ہے.....؟'' طارق بولا۔

''ہاں..... وہ حقیقت ہے۔'' نیلم نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں شاید علم نہیں کہ وہ ہندو لڑکی ہے اور اُس کا چاہنے والا بھی ہندو ہے۔ میں اُنہی کے جوتے اُنہی کے سر پر مار رہی ہوں۔ اُنہی کی بیٹیوں اور بہنوں کو اُنہی کے سامنے ننگا کر رہی ہوں۔ یہ بھیڑیئے نما انسان بڑی خوشی سے اپنی

بہنوں اور بیٹیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں اور مجھے وہ سب کچھ مل جاتا ہے، جو میں چاہتی ہوں، اس کے لئے میں نے یہ دُکانداری سجا رکھی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں.....؟'' طارق کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔

''یہ کوٹھا، عام تماش بینوں کے لئے نہیں ہے۔'' نیلم نے جواب دیا۔ ''یہاں آنے والوں کا تعلق یا تو حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے ہوتا ہے یا ایسی شخصیات سے جن سے ہم اپنے مطلب کی کوئی بات معلوم کر سکیں یا اس سے کوئی فائدہ اُٹھا سکیں۔ یہ بڈھا جو ابھی یہاں سے گیا ہے، جانتے ہو کون ہے؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں.....؟'' طارق نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ لالہ پریم ناتھ ہے..... کشمیری ہندو۔'' نیلم نے جواب دیا۔ ''اس کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزرا ہے۔ آج کل حکومت کے اس شعبے سے وابستہ ہے جسے امورِ کشمیر کا نام دیا جاتا ہے۔ لالہ پریم ناتھ اس شعبے میں کلیدی عہدے پر فائز ہے۔ اس کے توسط سے کچھ کارآمد باتیں معلوم ہو چکی ہیں اور کچھ کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔''

''لیکن تم نے اُس کے کان میں کیا کہا تھا کہ وہ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگ نکلا؟'' طارق نے کہا۔

''میں نے اُسے بتایا تھا کہ تم ایک منسٹر کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو اور کچھ دیر بعد وہ منسٹر بھی یہاں آنے والا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ اس قدر بدحواس ہوا کہ اُسے جوتے ہاتھ میں اُٹھا کر بھاگنا پڑا۔'' نیلم نے یہ کہتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور نیچے تم نے جس شخص کو دیکھا تھا، وہ بھی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ لیکن اب وہ بھی ننگ گیا ہوگا۔''

''مجھے افسوس ہے نیلم! میں نے تمہارے کردار پر شک کیا۔ تم واقعی عظیم ہو کہ تم نے اپنے وطن کی آزادی اور اپنی ہم وطن بہنوں اور بیٹیوں کے ناموس کی خاطر رُسوائی کا داغ اپنی پیشانی پر سجا رکھا ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''یہ رُسوائی کا داغ نہیں، درحقیقت تمہارے ماتھے پر چمکتا ہوا وہ روشن ستارہ ہے جو دوسروں کو راہ دکھا رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔''

''وطن کی آزادی کے لئے ہمیں جان کی قربانی بھی دینا پڑے تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔'' نیلم نے کہا۔

''میں شاید جلدی آ گیا ہوں.....''

''اسی لئے میں نے تمہیں بارہ بجے آنے کو کہا تھا۔'' نیلم مسکرائی۔ ''بہرحال..... آؤ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔''

وہ اُس کمرے میں آ گئے، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، لیکن بتی بجھی ہوئی تھی۔ نیلم نے اندر داخل ہو کر بتی جلا دی۔ یہ بیڈ روم تھا۔ یہاں کی ہر چیز خاصی قیمتی تھی۔

''یہ میرا ذاتی بیڈ روم ہے۔ اس میں میرے سوا اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ تم بیٹھو! میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' نیلم کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اُس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے، سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ ''یہ لو! گرم گرم کافی۔ میرا خیال ہے تم اس کی طلب محسوس کر رہے ہو گے۔'' نیلم نے یہ کہتے ہوئے ایک کپ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

طارق، پلنگ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نیلم اپنا کپ لے کر قالین پر بیٹھ گئی۔ طارق بھی کرسی سے اُٹھ کر قالین پر آ گیا۔ اُس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ نیلم، لباس بھی تبدیل کر آئی تھی۔ اب وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔

''کیا پروگرام ہے.....؟'' طارق نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

نیلم کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ نیچے کہیں سے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ نیلم کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ اُس کی واپسی میں تقریباً دس منٹ لگے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں پیلے رنگ کا ایک شولڈر بیگ تھا۔ اُس نے بیگ بڑی احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا اور وہ ایک بار پھر صبح کا پروگرام بنانے لگے۔

وہ دونوں صبح ٹھیک چھ بجے گھر سے نکل گئے۔ تقریباً اُسی وقت اُن کے دوسرے ساتھی بھی اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر شہر کے مختلف حصوں میں پھیل رہے تھے۔

صبح نو بجے یومِ جمہوریہ کی تقریبات کا آغاز ہوا۔ اور ٹھیک اُس وقت جب بھارتی وزیراعظم اپنا بھاشن دے رہا تھا، شہر دھماکوں سے گونجنے لگا۔ پہلا دھماکہ، دہلی کے مین ریلوے سٹیشن پر ہوا تھا..... اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے شہر کے مختلف علاقوں میں دھماکے ہونے لگے۔ یہ دھماکے دہلی میں کشمیری مسلمانوں کی طرف سے بھارت کو یومِ جمہوریہ کی سلامی تھی۔

☆

دہلی کے پولیس حکام بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ مہینے کے دوران یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ پہلے تہاڑ جیل سے دو خطرناک کشمیری مجاہدین کا فرار جن میں ایک پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور دوسرا مفرور روپوش ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد صفدر جنگ ایئر پورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے جہاز کی تباہی اور اس کے صرف تین دن بعد جمنا کے کنارے ٹریننگ کیمپ کی تباہی۔ پھر کوٹلہ فیروز شاہ میں نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں آٹھ پولیس والوں کی ہلاکت اور پھر ہوٹل اوبیرائے کے سوئمنگ پول میں ایک پولیس آفیسر کی لاش اور پول کے قریب ہی ایک ایسی عورت کی لاش کا پایا جانا جو چند روز پہلے جیل سے بھاگے ہوئے کشمیری مجاہد اور اُس کے ساتھی کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار ہو گئی تھی، لیکن بعد میں اُسے چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ عورت اکثر و بیشتر اُس پولیس آفیسر کے ساتھ دیکھی گئی تھی، جس کی لاش اوبیرائے کے سوئمنگ پول میں پائی گئی تھی۔ آخر میں بھارت کے یومِ جمہوریہ کے موقع پر پورے دہلی میں بموں کے دھماکے، جن میں مجموعی طور پر گیارہ افراد کی ہلاکت کے علاوہ کروڑوں روپے کی املاک کا نقصان بھی ہوا تھا۔

ایک انگریزی اخبار نے گزرے ہوئے واقعات کا تفصیلی تجزیہ شائع کرتے ہوئے شبہے کا اظہار کیا تھا کہ ان تمام سرگرمیوں کے پیچھے تہاڑ جیل سے بھاگے ہوئے طارق سعید نامی اُسی کشمیری مجاہد کا ہاتھ ہے، جس کا پولیس ابھی تک سراغ نہیں لگا سکی۔ اخبار نے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ طارق سعید کو دہلی میں رہنے والے کچھ اور لوگوں کی امداد بھی حاصل ہے۔ اور یہ لوگ ایک منظم گروہ کی طرح ان کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ لیکن پولیس ابھی تک طارق سعید یا اُس کے کسی ساتھی کا سراغ نہیں لگا سکی۔ اس کے برعکس بے گناہوں کو پکڑ کر نہ صرف جیلوں میں ٹھونس دیا گیا ہے بلکہ اُنہیں تشدد کا نشانہ بھی بنایا جا رہا ہے۔ اخبار نے پولیس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان بے گناہوں پر تشدد کرنے کی بجائے اُن لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ اخبار نے طارق سعید کی تصویر بھی شائع کی تھی۔ یہ تصویر سوا چار سال پرانی تھی اور جیل کے ریکارڈ سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ تصویر، آج کے طارق سعید سے اس قدر

مختلف تھی کہ اُس کی مدد سے طارق کو شناخت کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

یومِ جمہوریہ پر دھماکوں کے بعد طارق اور اُس کے ساتھی ایک بار پھر اپنی سرگرمیاں معطل کر کے زیرِ زمین چلے گئے تھے۔ گلاب دین اُن کے لئے بہت ہی کارآمد آدمی ثابت ہوا تھا۔ یہ لوگ اُس کی بدولت ٹریننگ کیمپ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے تھے۔ اور پھر یومِ جمہوریہ کے موقع پر بھی اُس نے اُن کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شاہ رُخ اُس سے ابھی اور کام بھی لینا چاہتا تھا۔ یہ اطلاع بھی گلاب دین ہی نے دی تھی کہ پولیس نے خفیہ طور پر چند ایسے سرکاری افسروں کی خفیہ نگرانی شروع کر دی ہے، جنہیں ماضی میں مشکوک افراد سے ملتے جلتے دیکھا گیا تھا۔ یا اب بھی اُن کے ایسے لوگوں سے روابط قائم تھے جن کا کردار پولیس کے لئے مشکوک تھا۔ اُن میں بعض نام تو ایسے تھے جو شاہ رُخ کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن ایک دو نام اُس کے جانے پہچانے تھے۔ اُن میں ایک نام لالہ پریم ناتھ کا بھی تھا۔ لالہ پریم ناتھ حکومت کے شعبہ امورِ کشمیر میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ یہ بڈھا، نیلم کے حسن کا اسیر تھا اور نیلم کے ذریعے اُس سے حکومت ہند کی کشمیر کی پالیسی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا رہتا تھا۔ لالہ پریم ناتھ اُن کے لئے نہایت اہم آدمی تھا اور وہ لوگ اُسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔

نیلم کو اس سلسلے میں خبردار کر دینا ضروری تھا۔ نیلم کے ہاں اگرچہ ٹیلی فون موجود تھا، لیکن شاہ رُخ نے فون پر بات کرنے کی بجائے طارق کو نیلم کے پاس بھیج دیا کہ اُسے اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے۔

طارق، شاہ رُخ کی گاڑی لے گیا۔ وہ رات تقریباً دس بجے مندر روڈ پر پہنچ گیا۔ گاڑی اُس نے لکشمی نارائن مندر کے قریب ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر چھوڑ دی اور ٹہلنے والے انداز میں نیلم کے مکان کی طرف چلنے لگا۔

دستک کے جواب میں دروازہ آج بھی اُسی لڑکی نے کھولا تھا۔ طارق اُس سے کچھ کہے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ اس مکان کے گراؤنڈ فلور پر دو تین کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ البتہ روشنی تمام کمروں میں نظر آ رہی تھی۔

''نیلم کہاں ہے.....؟'' طارق نے اندر داخل ہونے کے بعد لڑکی سے پوچھا۔ ''اچھی طرح کان کھول کر سنو! میں نیلم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، کسی اور کے بارے میں نہیں۔''

نجانے کیوں لڑکی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے اُوپر کی طرف اِشارہ کر دیا۔ طارق سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ نیلم اُوپر والے لاؤنج میں ہی مل گئی۔

''اوہ تم.....؟'' وہ طارق کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''ہاں، میں۔ ایک بہت ہی اہم معاملہ درپیش تھا۔ شاہ رُخ نے فون پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے مجھے بھیج دیا گیا۔'' طارق نے کہا۔

''تم کمرے میں چل کر بیٹھو..... میں دس منٹ میں آتی ہوں۔'' نیلم نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سیڑھیاں اُترنے لگی۔ طارق، کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا۔ اُس نے کمرے کی بتی جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے..... طارق کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ طارق نے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا، وہ نیلم تھی۔ اور اُس کے ساتھ لالہ پریم ناتھ بھی تھا، جو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ نیلم نے اُسے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ دونوں اُس کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مزید دس منٹ انتظار میں گزر گئے۔ جب نیلم کمرے میں آئی تو اُس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''تم نے بتی نہیں جلائی.....؟'' اُس نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں..... اندھیرے میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے.....؟''

''یہی وہ کاغذات ہیں، جن کے حصول کے لئے میں تڑپ رہی تھی اور لالہ پریم ناتھ میرے لئے۔'' نیلم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذات کا پلندہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''میں سمجھا نہیں.....؟'' طارق بولا۔

''یہ کشمیر کے بارے میں حکومت کی اگلی ایک سال کی پالیسی ہے۔ میں بہت دنوں سے اس کے حصول کے لئے لالہ پریم ناتھ پر دباؤ ڈال رہی تھی۔'' نیلم نے بتایا۔

''اوہ.....!'' طارق چونک گیا۔ ''میں لالہ پریم ناتھ ہی کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ لالہ پریم ناتھ انٹیلی جنس کی نظروں میں آ گیا ہے۔ اور اُس کی باقاعدہ نگرانی ہو رہی ہے۔ میں یہی کہنے آیا تھا کہ فی الحال اس سے دُور ہی رہو۔''

''تم یہ کاغذات سنبھالو! میں لالہ جی سے نمٹ کر ابھی آتی ہوں۔'' نیلم یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

دس منٹ گزر گئے۔ اچانک نیچے سے نسوانی چیخوں اور شور کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں..... طارق بدحواس سا ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ نیلم بھی دوڑی دوڑی وہاں پہنچ گئی۔

''کیا ہوا..... یہ شور کیسا ہے.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، پولیس نے ریڈ کیا ہے۔تم میرے کمرے میں جاؤ! اور یہ کاغذات چھپالو۔ میں دیکھتی ہوں۔'' نیلم کہتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دوڑ گئی۔

طارق، نیلم کے کمرے میں گھس کر دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ اُس نے کاغذات کا پلندہ بڑی احتیاط سے اپنے لباس میں چھپالیا تھا۔

نیلم جب نیچے پہنچی تو صورتِ حال خاصی تشویش ناک تھی۔ چار پولیس والے جن میں ایک سب انسپکٹر تھا اور تین کانسٹیبل، تینوں کمروں سے پیار کے پنچھیوں کو باہر لا چکے تھے۔ تینوں لڑکیاں ہندو تھیں اور مرد بھی اُن کے ہم مذہب ہی تھے۔ لڑکیوں نے جسموں پر بستروں کی چادریں لپیٹ رکھی تھیں اور مردوں نے اُلٹے سیدھے لباس پہن کر اپنی عریانیت چھپانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تینوں تھرتھر کانپ رہے تھے۔

''انسپکٹر وجے......!'' نیلم نے انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تھانے میں بیٹھے اپنا بھتہ مل جاتا ہے تو تم میرے مہمانوں کو اس طرح پریشان کرنے کیوں آئے ہو؟''

''آج بات ذرا مختلف ہے نیلم بائی!'' انسپکٹر وجے نے کہا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور اُس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ''مجھے اطلاع ملی تھی کہ لالہ پریم ناتھ یہاں آیا ہوا ہے۔ انٹیلی جنس والے، لالہ پریم ناتھ کو تمہارے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان سے پہلے ریڈ کر کے کیوں نہ یہ کریڈٹ میں حاصل کرلوں۔ کہاں ہے لالہ پریم ناتھ؟''

''لالہ پریم ناتھ......؟'' نیلم بری طرح چونک گئی۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے ساتھ آؤ انسپکٹر! اور اپنے آدمیوں سے کہو، میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔ انہیں بھی تو یہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔''

''اے! تم لوگ یہیں رُکو۔ میں آرہا ہوں۔'' انسپکٹر وجے نے اپنے آدمیوں سے کہا اور نیلم کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

طارق، دروازے کے پیچھے چھپا سیڑھیوں پر نیلم اور انسپکٹر وجے کی آوازیں سن رہا تھا۔ نیلم کی باتوں سے طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اُس نے کیا منصوبہ بنایا تھا اور انسپکٹر کو اُوپر کیوں لا رہی تھی؟

''اندر چلو انسپکٹر......! لالہ پریم ناتھ، اندھیرے میں دبکا بیٹھا ہے۔'' نیلم نے کہا۔

انسپکٹر وجے جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے طارق نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ اُس نے اپنا ایک بازو انسپکٹر کی گردن پر لپیٹ دیا۔ یہ صورتِ حال انسپکٹر وجے

کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن اُس کی گردن شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن طارق کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ ایسے موقعوں پر اُس کے چہرے پر عجیب سی درندگی اُبھر آتی تھی۔ اس وقت بھی اُس کے چہرے کے تاثرات بہت ہی خوفناک تھے۔

انسپکٹر وجے کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ طارق نے اُس کی گردن کو تین زوردار جھٹکے دیئے۔ آخر کار کڑک کی ہلکی سی آواز اُبھری اور انسپکٹر کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کو طارق نے دوسرے ہاتھ سے دبا لیا تھا۔

''تم جلدی سے اس کی یونیفارم پہن لو! میں لالہ کو لے کر آتی ہوں۔'' نیلم کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔

اُس کے جاتے ہی طارق نے انسپکٹر کی لاش کو دروازے کی آڑ میں گھسیٹ لیا اور اُس کی یونیفارم اُتارنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد نیلم جب لالہ پریم ناتھ کو لے کر اُس تاریک کمرے میں داخل ہوئی تو طارق، انسپکٹر کی وردی پہن چکا تھا۔ کاغذات بھی اُس نے احتیاط سے قمیض کے اندر چھپا لئے تھے۔ اُس نے انسپکٹر کی ٹوپی، سر پر اس طرح جھکا لی تھی کہ اُس کا اُوپر کا نصف چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اُس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور لالہ پریم ناتھ کی طرف دیکھا، جو تھرتھر کانپ رہا تھا۔

''چل بے شیطان......!'' طارق اُسے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''آج تجھے پتہ چلے گا کہ عشق کیسے لڑایا جاتا ہے۔''

''م......میں بے قصور ہوں انسپکٹر! اس بیسوا......''

''چلتا ہے یا نہیں بیسوا کے بچے......!'' طارق نے اُسے دیکھا اور ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اُترنے لگے۔ آخری سیڑھی پر طارق رُک گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ وہ کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم یہیں رُکو! اور ان سب کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو! میں ابھی آتا ہوں۔'' طارق نے مصنوعی طور پر کھانستے ہوئے کہا اور لالہ پریم ناتھ اور نیلم کو دھکے دیتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے سامنے بھی دو کانسٹیبل موجود تھے۔ اُنہوں نے کھٹ سے سلیوٹ جھاڑ دیا۔ طارق نے اُن کی طرف دیکھے بغیر کھانستے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ اندر جاؤ۔ ملزموں کو باندھنے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کرو! میں ان دونوں کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔''

ایک کانسٹیبل نے عجیب سی نظروں سے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر طارق، نیلم اور لالہ پریم ناتھ کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گلی میں ایک آدمی اور دو تین عورتیں جا رہی تھیں۔ پولیس کو دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ کر ا بھی تیز تیز قدم اُٹھا کر چلنے لگے۔ گلی کے موڑ پر طارق، گاڑی کے قریب رُک گیا۔

''اس بڈھے کو لے کر پیچھے بیٹھ جاؤ..... جلدی کرو!'' طارق نے کہا اور اگلا دروازہ کھول اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔ وہ گلی سے نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر آئے پولیس کی ایک جیپ تیزی سے گلی میں مُڑتی ہوئی نظر آئی۔ سڑک پر آتے ہی طارق نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ اُسے یقین تھا کہ یہ پولیس پارٹی، نیلم کے مکان کی طرف ہی جا رہی تھی۔ انسپکٹر کے آدمیوں کو تو وہ بے وقوف بنا کر نکل آئے تھے۔ لیکن جب یہ نئے پولیس والے وہاں پہنچیں گے تو اُن کا راز فاش ہو جائے گا اور فوراً ہی اُن کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ پولیس جیپ میں ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی ہو گا۔ اس کے ذریعے وہ پورے شہر کی پولیس کو الرٹ کر سکتے تھے۔ اگرچہ اُن کی کار نہیں دیکھی گئی تھی لیکن چیکنگ کے دوران دھر لئے جانے کا امکان تھا۔

''ڈرائیونگ کر سکتی ہو نیلم.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''ہاں.....!'' نیلم نے جواب دیا۔

''تو پھر جلدی سے آگے آ جاؤ! میں اس بڈھے سے نمٹتا ہوں۔'' طارق نے گاڑی روک لی۔

نیلم اگلی سیٹ کی پشت کے اُوپر سے آگے آ گئی اور طارق پیچھے پہنچ گیا۔ ''کہاں چلنا ہے.....؟'' نیلم نے گاڑی کو حرکت میں لاتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت زیرو پوائنٹ قریب ترین ہے۔ اسی طرف چلو!'' طارق نے جواب دیا اور لالہ پریم ناتھ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لالہ پریم ناتھ خوف سے نیم مُردہ ہو رہا تھا۔ طارق نے اچانک ہی لپک کر اُس کا نرخرہ دبا لیا۔ بڈھے نے مزاحمت تو کی لیکن یہ مزاحمت زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ رُوح نے جلد ہی اُس کے ناتواں جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ لالہ پریم ناتھ ختم ہو چکا ہے، طارق نے کار کا دروازہ کھول کر اُس کی لاش باہر دھکیل دی اور ہاتھ جھاڑتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

مختلف سمتوں سے پولیس سائرنوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ شہر میں اُن کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت نیلم نے کار، کناٹ پلیس پر ڈلہوزی ہاؤس کی پچھلی گلی میں موڑ دی۔ یہ گلی سنسان تھی۔ چند کاریں کھڑی تھیں۔ اُس نے کار ایک جگہ روک دی اور وہ دونوں اُتر کر تقریباً دوڑتے ہوئے ایک تنگ سے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اندر تاریکی تھی وہ دونوں ایک لمحے کو رُکے اور پھر اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہ تنگ

زینہ تھی جس کا ایک موڑ گھوم کر وہ روشنی میں آ گئے۔ پولیس کی یونیفارم میں ہونے کی وجہ سے طارق کو اچانک ہی ایک آدمی نے سامنے آ کر روک لیا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ طارق نے اطمینان سے ٹوپی، سر سے اُتار دی اور اسی لمحے نیلم بھی سامنے آ گئی۔ پہچان لئے جانے کے بعد انہیں مخصوص کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں شاہ رُخ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک پولیس والے کو نیلم کے ساتھ دیکھ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا، پھر طارق کو پہچان کر اُس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

''تم لوگ.....؟'' وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ ''میں سمجھا نہیں، یہ سب کیا ہے.....؟''

''نیلم کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ اور پھر اُسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ ''یہ کشمیر کے بارے میں بھارتی حکومت کی اگلے ایک سال کی پالیسی ہے۔ ان کاغذات کا حصول نیلم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔'' طارق نے شرٹ کے نیچے سے کاغذات کا پلندہ نکال کر شاہ رُخ کے سامنے میز پر ڈال دیا۔

شاہ رُخ، کاغذات کھول کر دیکھنے لگا۔ وہ اگرچہ سرسری سے انداز میں اُن کاغذات کو دیکھ رہا تھا لیکن ہر کاغذ پر نظر پڑتے ہی اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔

''نیلم.....!'' وہ کاغذات، میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے واقعی ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چل رہا ہے کہ بھارتی حکومت اگلے ایک سال کے دوران وادی کشمیر میں کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن اب یہ لوگ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ہم وادی میں ہر جگہ ان کا مقابلہ کریں گے۔ اور طارق تم.....'' وہ طارق کی طرف دیکھنے لگا۔ ''دو چار روز میں تم بھی روانگی کی تیاری کرو۔ یہاں صرف ایک ایسا کام رہ گیا ہے، جس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد تم کشمیر روانہ ہو جاؤ گے۔ نیلم بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔''

''اور وہ کام کیا ہے.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ تمہیں کل بتایا جائے گا۔ اب تم اُوپر جا کر لباس تبدیل کرو۔ اُوپر میرے کمرے میں تمہیں ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ اور نیلم! تم بھی اُوپر چلی جاؤ۔ تمہارا باہر نکلنا درست نہیں ہے۔ اب تم دو تین دن یہیں رہو گی۔ لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟'' اُس کے خاموش ہونے پر طارق نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ کاغذات، لالہ پریم ناتھ کے ذریعے حاصل کئے گئے ہیں۔ اور لالہ پریم ناتھ، انٹیلی جنس

کی نظروں میں آچکا ہے۔ آج پولیس کے ریڈ اور نیلم کے فرار کے بعد پولیس، لالہ پریم ناتھ
پوچھ گچھ ضرور کرے گی۔ اور جب وہ ان کاغذات کے بارے میں بتا دے گا تو حکومت، کشمیر
بارے میں اپنا یہ منصوبہ تبدیل کر دے گی۔ اس طرح یہ کاغذات ہمارے لئے بے کار ہو جائیں
گے۔'' شاہ رُخ نے کہا۔

''لیکن لالہ پریم ناتھ اپنی زبان نہیں کھولے گا۔'' طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو.....؟'' طارق نے اُسے گھورا۔ ''وہ پولیس کی
برداشت نہیں کر سکے گا۔ یہاں کی پولیس کو تم جانتے ہو۔ وہ لوگ زبان کھلوانے کے لئے کیسے کیسے
ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔''

''لیکن پولیس اب لالہ پریم ناتھ کی زبان نہیں کھلوا سکے گی۔'' طارق بولا۔ ''میں تمہیں یہ بتا
بھول گیا تھا کہ نیلم کے کوٹھے سے فرار ہوتے وقت ہم لالہ پریم ناتھ کو بھی اپنے ساتھ لے آئے
تھے۔ میں نے اُس کی گردن مروڑ کر اُسے راستے میں پھینک دیا تھا۔ اُس کی لاش، پولیس کو سڑک
پر سے مل گئی ہوگی۔ لیکن تم جانتے ہو کہ کوئی لاش کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ اور جہاں تک ان کاغذات
کا سوال ہے تو کسی کو ان کے بارے میں پتہ نہیں چل سکے گا۔ یہ فوٹو سٹیٹ کاپیاں ہیں۔ جبکہ اصل
کاغذات، فائل میں موجود ہیں۔ اس طرح کسی کو شبہ نہیں ہو سکے گا۔''

''اب میں مطمئن ہوں۔'' شاہ رُخ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب جاؤ! تم لوگ آرام
کرو۔ مجھے کچھ اور ضروری کام نمٹانے ہیں۔''

طارق اور نیلم اُس کمرے سے نکل کر اُوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ طارق کو وہ
کمرہ معلوم تھا جو شاہ رُخ کے زیر استعمال تھا۔ یہاں دو تین اور کمرے بھی تھے جنہیں کسی ایمرجنسی
میں پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ نیلم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ طارق نے پولیس کی
وردی اُتار کر الماری میں رکھا ہوا ایک لباس پہن لیا اور نیلم والے کمرے میں آ گیا۔ وہ دیر تک
بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اُنہیں ڈلہوزی ہاؤس میں بند ہوئے تین دن گزر گئے۔ شاہ رُخ نے اُنہیں بڑی سختی سے منع کر
رکھا تھا کہ وہ اپنے کمروں سے نکل کر ڈلہوزی ہاؤس کے ریسٹورنٹ یا کلب والے حصے کی طرف
آنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ پچھلے دو دن سے ریسٹورنٹ اور نائٹ کلب میں کچھ مشکوک قسم کے
لوگ دیکھے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کے بارے میں شاہ رُخ کو یقین تھا کہ اُس کا تعلق
انٹیلی جنس سے ہے۔ دوسروں کا تعلق بھی غالباً پولیس ہی سے تھا۔ اُن لوگوں کی یہاں موجودگی سے
ظاہر کر رہی تھی کہ اُنہیں ڈلہوزی ہاؤس پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے۔ شاہ رُخ نے اپنے تمام ساتھیوں

سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ فی الحال ڈلہوزی ہاؤس کا رُخ نہ کریں۔ وہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا
چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ طارق اب کچھ بیزاری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ تقریباً قید ہو کر رہ گیا تھا۔
بالآخر کار اُس کا انتظار ختم ہو گیا۔ اُس روز پانچ بجے کے قریب شاہ رُخ پلاسٹک کا ایک تھیلا
اٹھائے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔

''یہ لباس تبدیل کر لو! تمہیں ٹھیک سات بجے ہنومان مندر پہنچنا ہے۔'' شاہ رُخ نے تھیلا اُس
کے پلنگ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''ہندو مان مندر.....؟'' طارق نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے کوئی پنڈت سمجھا ہے کیا؟''

''تمہیں تھوڑی دیر کے لئے پنڈت ہی بننا پڑے گا۔'' طارق مسکرایا۔ ''تم یہ لباس تبدیل کر لو،
میں ابھی آتا ہوں۔''

شاہ رُخ کے جانے کے بعد طارق نے تھیلا کھولا۔ گیروے رنگ کا لمبا سا چغہ، لکڑی کی
کھڑاؤں اور چند مالاؤں کے علاوہ اس تھیلے میں لمبے بالوں والی وِگ اور داڑھی مونچھیں وغیرہ بھی
تھیں۔ طارق نے پہلے لباس پہنا اور پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر لمبے بالوں والی وِگ سر پر سیٹ
کرنے لگا۔ وِگ کے بعد اُس نے داڑھی مونچھیں اُٹھا کر دیکھیں، دونوں چیزیں ملی ہوئی تھیں۔
اس نے بڑی احتیاط سے داڑھی اور مونچھیں چہرے پر چپکا لیں اور آئینے میں دیکھنے لگا۔ اپنی شکل
دیکھ کر اُسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ گھنسی مونچھیں، داڑھی سے اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ اُس کے ہونٹ
چھپ کر رہ گئے تھے۔ سر کے بال بھی بکھرے ہوئے سے تھے۔ تھیلے سے پیلے رنگ کا ایک چاک
بھی برآمد ہوا تھا جس سے اُس نے پیشانی پر ایک موٹی سی لکیر کھینچ لی۔ اب وہ دیکھنے میں ایک ہندو
سنیاسی ہی لگتا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور نیلم اندر داخل ہوئی۔ ایک
ہندو سنیاسی کو کمرے میں دیکھ کر اُس کے منہ سے خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔

''ارے..... پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ میں طارق ہوں۔'' طارق نے آگے بڑھ کر اُسے بانہوں
سے پکڑ لیا۔

نیلم کے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔ اگر وہ طارق کی آواز نہ پہچان لیتی تو اُس کی بات کا
بھی یقین نہ کرتی۔ طارق نے تھیلے میں سے رنگ برنگی موتیوں کی مالائیں نکال کر گلے میں ڈال
لیں۔

''کہیں جا رہے ہو.....؟'' نیلم نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....!'' طارق نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہنومان مندر جانے کا حکم ملا ہے۔ لیکن ابھی

تک یہ نہیں بتایا گیا کہ وہاں مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''ہنومان مندر.....!'' نیلم بولی۔ ''یہ تو زیادہ دُور نہیں ہے۔''

اس دوران شاہ رُخ بھی کمرے میں آ گیا۔ وہ طارق کو سمجھانے لگا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ ''تم مندر کے مرکزی دروازے میں داخل ہو کر دائیں طرف تیسرے ستون کے پاس کھڑے رہو گے۔ ٹھیک سات بجے پرکاش تم سے رابطہ قائم کرے گا۔ وہ تمہیں کچھ کاغذات دے گا۔ تم وہ کاغذات لے کر مندر سے نکل جاؤ گے۔ واپس آتے ہوئے اس بات کا خیال رکھو گے کہ تمہاری نگرانی تو نہیں کی جا رہی۔''

''لیکن پرکاش سے وہ کاغذات تو گلاب دین بھی وصول کر سکتا تھا۔'' طارق بولا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' شاہ رُخ نے اُسے گھورا۔ ''وہ گلاب دین کو اب بھی اپنا دوست سمجھتا ہے۔ وہ کاغذات، حنا کے حوالے سے بلیک میل کر کے پرکاش سے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ اُسے گلاب دین پر ابھی تک کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکا۔ اس لئے ہم گلاب دین کو اس طرح اُس کے سامنے نہیں لا سکتے۔'' شاہ رُخ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''ہنومان مندر اسی چوراہے کے دوسری طرف پارلیمنٹ سٹریٹ کے کنارے پر ہے۔ مندر سے پچاس گز کے فاصلے پر پیلے رنگ کی ایک کار کھڑی ہو گی جس کا انجن سٹارٹ ہو گا۔ اگر کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو تو اُس کار میں بیٹھ جانا۔ اگر کوئی خطرہ نہ ہو یا تمہاری نگرانی نہ کی جا رہی ہو تو کار کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ مندر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ تم ساڑھے چھ بجے یہاں سے نکل جانا۔''

''ٹھیک ہے.....!'' طارق نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''یہ اپنے پاس رکھ لو! کسی ہنگامی صورت حال میں اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔'' شاہ رُخ نے یہ کہتے ہوئے ایک پستول اُس کی طرف بڑھا دیا۔

طارق نے پستول لے کر اُسے چیک کیا اور چغے کے اندر چھپا لیا۔ شاہ رُخ جا چکا تھا۔ طارق، نیلم سے باتیں کرنے لگا۔ پھر ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہ عقبی دروازے سے ڈلہوزی ہاؤس سے نکل گیا۔ عقبی گلی سے نکل کر وہ چوراہے پر آ گیا۔ یہ دراصل دائرے کی شکل میں ایک بہت بڑا پارک تھا جس کے چاروں طرف شاپنگ سنٹر بنے ہوئے تھے۔ طارق، پارک میں داخل ہو گیا اور ایک ہندو جوگی ہی کی طرح چلتا ہوا دوسری طرف بڑھنے لگا۔ پارک میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ بچے بھی کھیل رہے تھے۔

پارک سے نکل کر وہ پارلیمنٹ سٹریٹ پر آ گیا۔ جب وہ ہنومان مندر میں داخل ہوا تو چھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ دائیں طرف تیسرے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ

جوڑ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے بڑے انہماک سے پوجا کر رہا ہو۔ بظاہر اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن آنکھوں میں بہت ہلکی سی جھری سے وہ اپنے آس پاس آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک سات بجے اُس نے ایک نوجوان کو مندر کے اندرونی حصے سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ پرکاش تھا..... اُس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ وہ طارق کے پاس آ کر رُک گیا۔ اُس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ جیسے ٹی بی کا مریض ہو۔

طارق نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے لوگوں کو دیکھتا رہا، پھر پرکاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بھگوان کے چرنوں میں آ کر بھی تمہیں سکھ نہیں ملا مورکھ! اس کی وجہ وہ بوجھ ہے، جو تم نے اُٹھا رکھا ہے۔ لاؤ! اپنا بوجھ مجھے دے دو۔ تمہیں شانتی مل جائے گی۔'' طارق نے کہا۔

پرکاش واقعی خوف سے مرا جا رہا تھا۔ اُس نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پوٹلی طارق کی طرف بڑھا دی۔ طارق نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پوٹلی لبادے میں چھپا لی۔ لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ ہال میں تقریباً دس گز دُور ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوا ایک اور شخص بھی اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پرکاش نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جوگی کو پرنام کیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ طارق بھی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت ستون کے پیچھے چھپا ہوا وہ آدمی تیزی سے آگے بڑھا اور اُس نے پرکاش کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسری طرف سے ایک اور آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا طارق کے قریب پہنچ گیا اور طارق کا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے غرایا۔

''میرے ساتھ چلتے رہو سوامی! اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دُوں گا۔''

طارق کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اُس نے کن انکھیوں سے دوسری طرف دیکھا، پرکاش بھی ایک آدمی کی گرفت میں تھا۔ طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان دونوں کا تعلق انٹیلی جنس سے تھا اور یقیناً باہر بھی ان کے آدمی موجود ہوں گے۔ وہ مزاحمت کئے بغیر سادہ لباس والے کے ساتھ چلتا رہا۔ اُس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مرکزی دروازے کے سامنے کشادہ سیڑھیوں پر پہنچ کر طارق نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ اُنہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی یقیناً انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اُس نے کچھ دُور کھڑے ہوئے ایک اور آدمی کو اشارہ کر دیا اور وہ دونوں آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھنے لگے۔ مندر کے مرکزی دروازے کے دائیں طرف پچاس گز کے فاصلے پر پیلے رنگ کی کار کھڑی تھی۔ لیکن طارق کے خیال میں اُس کا کار تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔ پھر بھی اُس کو کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

مندر میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ طارق نے اچانک ہی زوردار جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال کر اُس آدمی پر گولی چلا دی تھی جس نے چند لمحے پہلے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ گولی اُس شخص کی ٹانگ پر لگی اور وہ سیڑھیوں پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس وقت وہاں انٹیلی جنس کے چار آدمی تھے۔ ایک زخمی ہو گیا تھا، دوسرے نے پرکاش کو گرفت میں لے رکھا تھا اور باقی دو آدمیوں نے طارق کے پیچھے دوڑتے ہوئے فائرنگ شروع کر دی.....

بھگدڑ سی مچ گئی۔ مندر میں آنے اور جانے والے لوگ چیختے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ طارق، کار کی طرف دوڑ رہا تھا جو اَب بیس گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ انٹیلی جنس کے دونوں آدمی اُس کے پیچھے تھے۔ اچانک کار سے آٹومیٹک رائفل سے فائرنگ کی جانے لگی۔ ایک گولی طارق کے پیچھے دوڑنے والے آدمیوں میں سے ایک کے سینے میں لگی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے آدمی نے ایک طرف چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پرکاش نے بھی اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن اُسے زیادہ دُور جانے کا موقع نہ مل سکا۔ کار سے چلائی جانے والی ایک گولی نے اُس کا بھیجا اُڑا دیا تھا۔

طارق کار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پچھلا دروازہ کھل گیا۔ طارق کے بیٹھتے ہی کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔ کار میں تین آدمی تھے۔ ایک سٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا اور دو فائرنگ کر رہے تھے۔

کار ایک چکر کاٹ کر ڈلہوزی ہاؤس کی عقبی گلی میں پہنچ گئی۔ طارق نے کار سے چھلانگ لگا دی اور کار تیز رفتاری سے آگے نکل گئی۔ گلی میں تاریکی تھی۔ طارق دوڑتا ہوا ڈلہوزی ہاؤس کے عقبی دروازے میں داخل ہو گیا۔

پولیس کی گاڑیاں کناٹ پلیس کے آس پاس دندناتی پھر رہی تھیں۔ اُنہیں اُس پیلی گاڑی کی تلاش تھی جس میں ہندو سادھو فرار ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پولیس کو پیلے رنگ کی وہ گاڑی ایک ایسی سڑک پر مل گئی جہاں ہر قسم کی اشیاء فروخت کرنے والی چھوٹی دُکانوں کی بھرمار تھی۔ دُکاندار زیادہ تر تبتی تھے۔ سڑک کے کنارے اور دونوں طرف فٹ پاتھوں پر بھی خوانچے والوں کا قبضہ تھا۔ ابھی تو آٹھ بھی نہیں بجے تھے، پھر بھی سڑک پر راہ گیروں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ دُکانوں میں گاہکوں کی آمد و رفت تھی اور چھوٹے چھوٹے ریستوران بھی آباد تھے۔

پولیس نے پیلے رنگ کی اس گاڑی کو فوراً ہی گھیرے میں لے لیا تھا اور آس پاس ہندو سادھو اور اُس کے ساتھیوں کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ پولیس نے آس پاس کے دُکانداروں سے بھی

پوچھ گچھ کی مگر کسی نے کسی سادھو کو اُس گاڑی سے اُترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ایک خوانچے والے نے صرف اتنا بتایا کہ دو آدمی پیلے رنگ کی اس کار سے اُتر کر دائیں طرف کی گلی میں جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ لیکن اُن دونوں میں سے کسی کا حلیہ کوئی بھی نہیں بتا سکا تھا۔ تلاشی لینے پر اس گاڑی میں سے دو آٹومیٹک رائفلیں اور چار بھرے ہوئے میگزین مل گئے تھے۔ لیکن گاڑی میں کسی قسم کے کاغذات یا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے گاڑی کے مالک کے بارے میں فوری طور پر کچھ معلوم ہو سکتا۔

پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی گئی اور وسیع پیمانے پر ہندو سادھو اور اُس کے ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی گئی۔ علاقے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بھی پولیس روانے لگی۔ مشکوک افراد کو حراست میں لیا جانے لگا۔

تین پولیس والے ڈلہوزی ہاؤس میں بھی گھس آئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ خوف زدہ سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک ویٹرس نے منیجر کو اطلاع کر دی۔ منیجر فوراً ہی ہال میں پہنچ گیا۔ ڈلہوزی ہاؤس ہوٹل کم نائٹ کلب تھا۔ اس کا شمار دہلی کے اے کلاس نائٹ کلبوں میں ہوتا تھا۔ کوئی عام پولیس والا، انتظامیہ کی اجازت کے بغیر اندر گھسنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن آج ایک نہیں، تین تین پولیس والے اندر گھس آئے تھے اور وہ تینوں کانسٹیبل تھے جو ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے بڑی بدتمیزی سے سوال جواب کر رہے تھے۔

ڈلہوزی ہاؤس کا منیجر مسلمان اور شاہ رُخ کا خاص آدمی تھا۔ وہ تینوں کانسٹیبلوں پر چڑھ دوڑا۔

''تم لوگوں کو اندر داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی.....؟'' وہ دھاڑا۔ ''تم جانتے ہو، یہ کسی ملہاری یا مارواڑی کا چائے خانہ نہیں۔ یہ اے کلاس کلب ہے۔ یہاں شہر کے معززین اور شرفا آتے ہیں۔ میں پولیس کمشنر سے تمہاری شکایت کروں گا۔ تم لوگ فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔''

''ہمیں ایک ہندو سادھو اور اُس کے دو ساتھیوں کی تلاش ہے جو کچھ دیر پہلے ہنومان مندر کے سامنے دو تین آدمیوں کو قتل کر کے فرار ہوئے ہیں۔'' ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ وہ قاتل اطمینان سے یہاں بیٹھے چائے یا شراب پی رہے ہوں گے، تمہیں تم پکڑ لو گے.....؟'' منیجر دھاڑا۔

''انسپکٹر کا حکم ہے کہ اُنہیں تمام جگہوں پر تلاش کیا جائے۔'' کانسٹیبل نے کہا۔

''اپنے انسپکٹر کو بلاؤ.....!'' منیجر نے کہا۔

ٹھیک اسی لمحے انسپکٹر، ہال میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ بھی دو مسلح پولیس کانسٹیبل تھے۔

''یہ سب کیا ہے انسپکٹر......؟'' منیجر اُسے دیکھتے ہی بولا۔ ''میرے کلب کی ریپوٹیشن کو اس طرح برباد کیوں کیا جارہا ہے؟ میرے معزز گاہکوں سے نہایت گھٹیا سلوک کیا جارہا ہے۔ لوگ یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔''

''سوری مسٹر قادر!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''تم حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ایک ہندو سادھو اور اُس کے دو ساتھی مندر کے سامنے کم از کم تین افراد کو قتل کر کے فرار ہوئے ہیں۔ وہ ہندو سادھو، درحقیقت ایک غیر ملکی ایجنٹ ہے جسے ایک مقامی آدمی سے کچھ کاغذات لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا، لیکن وہ کمبخت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔''

''اور وہ آدمی کون تھا جو کاغذات دے رہا تھا......؟'' منیجر نے پوچھا۔

''بھارت کے ایک بہت قریبی دوست سفارت خانے کا ایک ملازم۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

''تو پھر اُسی سے کیوں نہیں پوچھ لیا جاتا کہ ہندو سادھو کون ہے؟''

''یہی تو افسوس کی بات ہے۔ وہ بھی ختم ہو چکا ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''چند روز پہلے بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ شعبہ امورِ کشمیر کے ایک کلیدی آفیسر کو ایک طوائف کے ذریعے بلیک میل کر کے اُس سے بھی شاید کسی قسم کے کاغذات وصول کئے گئے تھے۔ لیکن عین وقت پر وہ طوائف نہ صرف اپنے ساتھی کے ساتھ فرار ہو گئی بلکہ اُس آفیسر کو بھی قتل کر دیا گیا تاکہ یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اُس سے کس قسم کے کاغذات وصول کئے گئے تھے؟''

''ویسے آج کل تمہارا قانون کچھ بے بس نہیں ہو گیا......؟'' منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پچھلے کئی روز سے یہاں قتل و غارت ہو رہی ہے۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ اور ابھی تک ایک آدمی بھی نہیں پکڑا گیا۔''

''یہی تو ہماری بے بسی ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ قتل جیسی واردات کے بعد کوئی شخص، کسی ہوٹل میں بیٹھ کر اطمینان سے چائے نہیں پی سکتا۔ لیکن محض خانہ پُری کے لئے آپ مجھے اجازت دے دیں۔''

''ضرور......لیکن اس شرط پر کہ میرے معزز مہمانوں کو ہراساں نہ کیا جائے۔'' منیجر نے کہا۔

''ٹھیک ہے......میں ایک نظر کرسٹل رُوم پر ڈال لوں، پھر آپ کے دفتر میں آتا ہوں۔'' انسپکٹر نے صرف ایک کانسٹیبل کو اپنے ساتھ رکھا اور دوسروں کو باہر جانے کی ہدایت کر دی۔

منیجر قادر اپنے دفتر میں آ گیا۔ اُس نے دروازہ بند کرتے ہی انٹر کام کا ریسیور اُٹھا کر ایک نمبر دبایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ منیجر، ریسیور کان سے لگائے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''شاہ رُخ! پولیس، ہندو سادھو کے ساتھیوں کی تلاش میں ڈلہوزی ہاؤس میں داخل ہو چکی ہے۔ انسپکٹر ماتھر، ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو چیک کر رہا ہے۔ ممکن ہے، وہ کلب میں رہائش پذیر مہمانوں کو بھی چیک کرنا چاہے۔''

''انسپکٹر ماتھر جو کہتا ہے، ویسا ہی کرو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے شاہ رُخ نے جواب دیا۔

منیجر نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے ٹھیک ایک منٹ بعد انسپکٹر ماتھر، دفتر میں داخل ہوا۔

''کوئی مشتبہ آدمی نظر آیا......؟'' منیجر نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''نہیں......!'' انسپکٹر ماتھر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا میں کلب میں رہائش پذیر مہمانوں کو چیک کر سکتا ہوں......؟''

''ضرور......!'' منیجر نے ایک رجسٹر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ''لیکن اس وقت گورکھپور سے آئے ہوئے ایک بوڑھے اور اُس کی بیوی کے سوا کوئی مہمان ہوٹل میں موجود نہیں ہے۔ کوئی صبح باہر گیا ہے، کوئی دوپہر سے اور کوئی شام سے۔ اگر تم چاہو تو اس بوڑھے جوڑے کو چیک کر سکتے ہو۔ وہ تیسری منزل پر کمرہ نمبر 307 میں قیام پذیر ہیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے رجسٹر کو دیکھے بغیر کہا۔ ''اگر کلب میں کوئی مشکوک آدمی دیکھو تو فوراً پولیس سٹیشن اطلاع کر دینا۔''

''ضرور......!'' منیجر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ انسپکٹر کو باہر کے دروازے تک چھوڑنے بھی گیا تھا۔ واپس آ کر اُس نے ایک بار پھر انٹر کام پر شاہ رُخ کو رپورٹ دی اور پھر ہال میں آ کر اُن لوگوں سے معذرت کرنے لگا جن سے پولیس والوں نے پوچھ گچھ کی تھی۔ اُس نے یہ بھی اناؤنس کروا دیا کہ پولیس کی مداخلت سے پیدا ہونے والی بدمزگی دُور کرنے کے لئے تھوڑی دیر کے بعد خصوصی پروگرام پیش کیا جائے گا۔ اور وہ پروگرام ایک نئی رقاصہ کا نیم عریاں رقص تھا۔

☆

طارق، ڈلہوزی ہاؤس کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ چند منٹ کے اندر اندر اُس نے لباس تبدیل کیا اور سادھو والا چُغہ، داڑھی مونچھ، وِگ اور مالائیں ایک پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر وہ پوٹلی ہاتھ میں لے لی اور شاہ رُخ والے کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس نے لباس والا تھیلا اور پوٹلی شاہ رُخ کے سامنے ڈال دی۔ ''ان چیزوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگا دو۔'' اُس نے تھیلے کی طرف اِشارہ کیا۔

''اور یہ وہ کاغذات ہیں جن کے لئے کم از کم تین آدمیوں کو اپنی زندگی سے محروم ہونا پڑا

ہے۔'' طارق نے کاغذات والی پوٹلی شاہ رُخ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' شاہ رُخ نے پوٹلی کھولتے ہوئے کہا۔

''آج تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔'' طارق نے کہا۔ اور پھر پورے واقعات کی تفصیلات بتانے لگا۔ ''پرکاش بھی ختم ہو چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ! میں تھوڑی دیر میں، وہیں آتا ہوں۔'' شاہ رُخ نے کہا اور طارق اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

پرکاش سے ملنے والے کاغذات نہایت اہم ثابت ہوئے تھے۔ یہ دراصل! اس منصوبے کا ابتدائی خاکہ تھا جو کشمیر کے حوالے سے بھارتی حکومت اور اسرائیل نے مشترکہ طور پر تیار کیا تھا۔ اس منصوبے سے دونوں ملکوں کا مفاد وابستہ تھا۔ ہندو و یہود کی یہ مشترکہ سازش ایک طرف کشمیری مسلمانوں کے لئے تباہ کن تھی تو دوسری طرف پاکستان کو بھی نا قابل تلافی نقصان پہنچانے کی پلاننگ کی گئی تھی۔

یہ منصوبے کا ابتدائی خاکہ تھا۔ اس میں اگرچہ تفصیلات موجود نہیں تھیں۔ لیکن اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' اور اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے ایجنٹ مل کر کیا کرنا چاہتے تھے؟

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر کسی قوم کو غلام بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ ویت نام نے تین نسلوں تک امریکی استعمار کا مقابلہ کیا تھا اور آخر کار امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیوبا نے امریکہ کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ افغانستان کے غیور باشندے گیارہ سال تک سوویت یونین کی طاقت کا مقابلہ کرتے رہے تھے۔ افغانستان کی پچاس فیصد آبادیاں کھنڈر بن گئیں، لاکھوں افراد شہید ہو گئے، لاکھوں افراد ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اُنہوں نے سوویت یونین کی غلامی قبول نہیں کی اور آخر کار سوویت یونین کو افغانستان سے بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔ سوویت یونین کا اپنا شیرازہ بکھر گیا۔ جو مسلمان ریاستیں ستر اسی سال سے کمیونزم کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھیں، اُنہوں نے بھی آخر کار آزادی کا نعرہ بلند کر دیا اور اس طرح یونین کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ یوگوسلاویہ بھی بکھر گیا۔

آزادی کی اس لہر نے پوری دنیا کے مظلوموں میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ کشمیر کے مسلمان بھی جو گزشتہ 45 سال سے بھارتی استعمار کی چکی میں پس رہے تھے، ایک نئے جذبے اور ولولے کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے غاصب بھارت کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔

کشمیر میں اُٹھنے والی آزادی کی اس نئی لہر نے بھارتی حکمرانوں کی نیندیں اُڑا دیں۔ اُنہوں نے اس لہر کو دبانے کے لئے اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک نئی سازش تیار کی جسے طارق اور اُس کے ساتھیوں نے ابتدائی مرحلے ہی میں ختم کر دیا۔ اب ان کاغذات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہود و ہنود کشمیر کے مسلمانوں کے خلاف ایک نئی سازش کے تانے بانے بن رہے تھے۔

بھارت اگر کشمیری مسلمانوں میں پیدا ہونے والی آزادی کی اس نئی لہر سے خائف تھا تو پاکستان میں کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ نے اسرائیلی حکمرانوں کی نیندیں اُڑا رکھی تھیں۔ پاکستان اگرچہ کئی مرتبہ وضاحت کر چکا تھا کہ اُس کی ایٹمی سرگرمیاں پُرامن اور ترقیاتی مقاصد کے لئے ہیں۔ لیکن بھارت اور اسرائیل پاکستان کے اس مؤقف کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اُنہیں پاکستان کی ان ایٹمی سرگرمیوں کے پیچھے اسلامی بم دکھائی دے رہا تھا جس سے وہ خوف زدہ تھے۔ کہوٹہ کا ایٹمی پلانٹ اُن کے لئے ہوّا بنا ہوا تھا۔ چند سال پہلے اسرائیل اور بھارت نے کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کی سازش کی تھی۔ بھارت کے جیگوار طیارے سرینگر کے ہوائی اڈے پر تیار کھڑے تھے۔ اُن طیاروں کے پائلٹ اسرائیلی تھے۔ جو طیاروں کے کاک پٹس میں بیٹھے گرین سگنل کے منتظر تھے۔ منصوبے کے مطابق یہ جیگوار طیارے سری نگر سے پرواز کر کے کہوٹہ پر بموں کی بارش کرتے ہوئے نکل جاتے..... لیکن آخری لمحوں پر اُنہیں اطلاع ملی کہ پاکستان، یہود و ہنود کی اس سازش سے آگاہ ہو چکا ہے اور پاک فضائیہ کے طیارے بھارتی جیگوار طیاروں کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ اس طرح عین آخری وقت پر یہ منصوبہ ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی کہوٹہ کے خلاف کئی چھوٹی چھوٹی سازشوں کے انکشافات ہوئے تھے۔ لیکن یہود و ہنود کو ہر مرتبہ منہ کی کھانی پڑی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس خوابِ غفلت کی نیند نہیں سو رہی ہے۔

کچھ ہی عرصے بعد اسرائیل نے بھارت کے ساتھ مل کر ایک نئی سازش تیار کی۔ اس مرتبہ اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کے ایجنٹوں کو سیاحوں کے رُوپ میں سرینگر پہنچا دیا گیا۔ ان سیاحوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی اور یہ دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں سرینگر پہنچے تھے۔ یہ اسرائیلی ایجنٹ سیاحوں کے رُوپ میں آزاد کشمیر میں داخل ہو کر کہوٹہ کی طرف آتے اور تخریبی کارروائیاں سرانجام کر دیتے..... لیکن پاکستان کو اس سازش کا بھی بروقت پتہ چل گیا۔ بھانڈہ پھوٹ جانے پر اسرائیل نے اپنی اس سازش کا اعتراف کر لیا۔ لیکن بھارتی حکمران بڑی ڈھٹائی سے اس کی تردید کرتے رہے۔

پے در پے ناکامیوں کے بعد اسرائیل اور بھارت نے ایک نئی سازش تیار کی تھی۔ جس کا یہ خاکہ تھا۔ تفصیلات نہ ہونے کے باوجود اس خاکے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اب یہود و

ہنود کشمیری مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف کیا کرنا چاہتے تھے؟

نیلم کے ذریعے لالہ پریم ناتھ سے جو کاغذات ملے تھے، وہ بھی خاصے اہم تھے۔ یہ منصوبہ اگلے ایک سال کے دوران کشمیر میں مجاہدین سے نمٹنے کی حکمت عملی تھی، بلکہ پاکستان کے خلاف بھارت کے گھناؤنے عزائم کا بھی پتہ چلتا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق بھارت، پاکستان کی سرحد سے ملحق صوبے راجستھان کے علاقے رن کچھ میں ایسے کیمپ قائم کر رہا تھا، جہاں را کے ایجنٹ منتخب نوجوانوں کو تخریب کاری کی تربیت دیں گے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان ہوں گے۔ تربیت کے بعد انہیں سرحد پار پاکستانی علاقے میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ لوگ نہ صرف پاکستان میں تخریبی سرگرمیاں جاری رکھیں گے، بلکہ آزاد کشمیر پہنچ کر میر پور، پونچھ اور مظفر آباد وغیرہ میں بھی تخریبی کارروائیاں جاری رکھیں گے۔ ان علاقوں میں انہیں بعض مقامی لوگوں کی مدد حاصل ہوگی۔

کشمیر و پاکستان کے خلاف بھارت کے یہ منصوبے انتہائی خطرناک تھے۔ غدار کس ملک اور قوم میں نہیں ہوتے؟ اور ہمیشہ غداروں نے ہی اپنی قوم کو نقصان پہنچایا ہے۔ بیرونی دشمن سے نمٹنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن گھر کے بھیدی ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔

لالہ پریم ناتھ سے حاصل ہونے والے کاغذات میں کچھ نام ایسے بھی تھے، جو کشمیر اور پاکستان میں بھارت کے آلہ کار ہو سکتے تھے۔ ان ناموں کے بارے میں اگرچہ کوئی وضاحت موجود نہیں تھی، لیکن طارق کو یقین تھا کہ یہ نام بھارت کے حکمرانوں کے لئے بہت اہمیت رکھتے تھے۔

ان سازشوں کا انکشاف ہونے کے بعد طارق کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ اب جلد سے جلد دہلی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ تاکہ کشمیر پہنچ کر اپنی تنظیم کو بھارت کے ان گھناؤنے منصوبوں سے آگاہ کر سکے۔

شاہ رُخ کے خیال میں بھی اب طارق کا واپس چلے جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ طارق کے لئے کشمیر پہنچنا اب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ جیل سے فرار کے بعد طارق کی تصویریں نہ صرف ہندوستان کے تمام پولیس سٹیشنوں کو پہنچا دی گئی تھیں، بلکہ جموں اور سرینگر کے اہم مقامات پر بھی اُس کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت بھارت کی حکومت کو سب سے زیادہ مطلوب آدمی تھا۔

''ٹھیک ہے.....!'' اُس نے طارق کی بات سننے کے بعد کہا۔ ''آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد تم سرینگر کے لئے روانہ ہو جاؤ گے۔ نیلم بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔ اس کے لئے بھی یہاں رہنا

خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' وہ دونوں کچھ دیر تک پلاننگ کرتے رہے اور پھر گفتگو کا موضوع بدل گیا.....

پھر اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد طارق اور نیلم دہلی سے سرینگر جانے والے طیارے پر سوار ہو رہے تھے۔ نیلم کے جسم پر ایئر ہوسٹس کی یونیفارم تھی اور طارق، پر سر کی وردی میں تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُن کے چہرے بدلے ہوئے تھے۔ اُن کے لئے یہ سارا بندوبست شاہ رُخ ہی نے کیا تھا۔ انڈین ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس بملا اور اسٹیورڈ اشوک، شاہ رُخ کی قید میں تھے۔

جہاز نے صبح آٹھ بجے دہلی کے ایئر پورٹ سے ٹیک آف کیا۔ پرواز کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد طیارہ امرتسر ایئر پورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ نیلم نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا، اُسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ طیارہ، ٹرمینل بلڈنگ سے بہت دُور، رن وے کے آخری سرے پر رُکا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف سے سیکورٹی کے مسلح آدمیوں نے گھیرے میں لے لیا تھا.....

یہ صورتِ حال دیکھ کر نیلم بدحواس سی ہوگئی۔ اُس نے کاک پٹ سے آنے والی دوسری ایئر ہوسٹس کو دیکھ لیا۔ اُس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے نشی! جہاز کو آج یہاں کیوں ٹھہرایا گیا ہے..... اور اسے فوج نے گھیرے میں کیوں لے لیا ہے؟'' نیلم نے پوچھا۔

''کیپٹن کو کنٹرول ٹاور سے بتایا گیا ہے کہ دو انتہائی خطرناک غیر ملکی جاسوس ہمارے جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ ان میں ایک عورت ہے اور ایک مرد..... جہاز کو اس وقت تک پرواز کی اجازت نہیں دی جائے گی، جب تک تمام مسافروں کو چیک نہیں کر لیا جاتا۔'' دوسری ایئر ہوسٹس نشی نے بتا دیا۔

نیلم کو سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ طارق بھی اس وقت قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے بھی نشی کی بات سن لی تھی۔ اُس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ انڈین ایئر لائن کے سٹاف اور اس طیارے کے کریو کو تو وہ دھوکہ دینے میں کامیاب رہے تھے، لیکن زیادہ سیکورٹی والوں کی آنکھوں میں بھی دُھول جھونکنے میں کامیاب ہو سکیں گے یا پکڑے جائیں گے.....؟

تھوڑی دیر بعد سیڑھی، جہاز سے لگ گئی۔ کیپٹن کی ہدایت پر نشی نے دروازہ کھول دیا۔ ایک آفیسر اور اُس کے پیچھے دو جوان اندر داخل ہو گئے۔ آفیسر کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اور دوسرے سب مشین گنیں سنبھال رکھی تھیں۔ آفیسر، دروازے میں داخل ہوتے ہی رُک گیا۔

سامنے ہی طارق کھڑا تھا۔ سکیورٹی آفیسر کی چبھتی ہوئی نظریں، طارق کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے بھیانک موت اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہو۔

طارق کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ سکیورٹی آفیسر اُس سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اُسے گھور رہا تھا۔ طارق کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا فطری بات تھی کہ کہیں اس سکیورٹی آفیسر کو اُس پر شبہ تو نہیں ہوگیا؟ یا ایسا تو نہیں کہ اصلی اسٹیورڈ اشوک، شاہ رُخ کی قید سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہو اور ایئر لائن کو یہ اطلاع مل گئی ہو کہ اس طیارے میں اشوک نامی اسٹیورڈ نقلی ہے۔ لیکن نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔ شاہ رُخ کی قید سے فرار ہونا آسان نہیں تھا۔ اور پھر بالفرض وہ اسٹیورڈ، شاہ رُخ کی قید سے فرار ہو بھی گیا تھا اور ایئر لائن کو حقیقت کا پتہ چل گیا تھا تو یہ سکیورٹی آفیسر اُس کے سامنے اس طرح کھڑے ہونے کی بجائے اب تک اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا چکا ہوتا۔

''کیا نام ہے تمہارا.....؟'' سکیورٹی آفیسر نے طارق سے سوال کیا۔

''اشوک..... اشوک مہتہ سر.....!'' طارق نے جواب دیا۔

''تمہارا شناختی کارڈ.....؟'' سکیورٹی آفیسر نے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

طارق نے جیب سے وہ شناختی کارڈ نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ شناختی کارڈ اصلی تھا اور اس پر تصویر بھی اشوک مہتہ ہی کی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ہی طارق کے چہرے میں اس کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ ویسے طارق کو دل ہی دل میں شاہ رُخ کی ذہانت کی داد دینی پڑ رہی تھی۔ اُس نے ایئر لائن کے دو ایسے افراد کا انتخاب کیا تھا، جو قد و قامت اور جسمانی لحاظ سے نیلم اور طارق سے بڑی حد تک مشابہت رکھتے تھے۔ اشوک مہتہ کے چہرے پر طارق ہی کی طرح چھوٹی گول داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ طارق کی آنکھوں میں نیلی رنگت کے کونٹیکٹ لینز لگانے کے علاوہ چہرے پر بہت تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی تھی۔

سکیورٹی آفیسر نے اُس کے کارڈ کا بغور جائزہ لینے کے بعد کارڈ پر چسپاں تصویر اور طارق کے چہرے کا موازنہ کیا اور پھر کارڈ اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاز کے کیپٹن سے کہو کہ وہ اعلان کردے کہ کوئی مسافر اپنی سیٹ سے نہ اُٹھے۔ ہم ایک ایک مسافر کو چیک کریں گے۔''

''یس سر.....!'' طارق نے سر ہلا دیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا کاک پٹ میں داخل ہوگیا۔ اُس نے سکیورٹی آفیسر کا حکم کیپٹن تک پہنچا دیا اور کیپٹن، طیارے کے مسافروں کو سکیورٹی آفیسر کے احکامات سے آگاہ کرنے لگا۔

سکیورٹی کے چار اور آدمی جہاز پر آگئے تھے۔ اُن میں سے دو تو جہاز کے پچھلے حصے میں

گئے اور دو نے فرسٹ اور اکانومی کلاس کے درمیان پوزیشن سنبھال لی۔ جبکہ پہلے سے موجود دو سکیورٹی والے دروازے کے قریب ہی سب مشین گنیں سنبھالے کھڑے رہے۔ سکیورٹی آفیسر نے دروازے کے قریب سیڑھی کے پلیٹ فارم پر آکر نیچے کھڑے ہوئے دو اور آدمیوں کو اُوپر آنے کا اشارہ کیا۔ اُن میں سے ایک کا تعلق تو سکیورٹی ہی سے تھا، جبکہ دوسرا ایئر پورٹ مینجر تھا۔ وہ سکھ تھا، جس نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔

''کیپٹن اور فرسٹ انجینئر کے علاوہ کریو کے صرف دو آدمی جہاز میں رہیں گے۔ کریو کے باقی افراد کو اور خصوصاً لیڈیز کو ٹرمینل میں بھیج دیا جائے۔ آپ کریو ممبرز کے کارڈ چیک کریں، جس کارڈ پر شبہ ہو، اُسے روک لیں۔'' سکیورٹی آفیسر نے سکھ ایئر پورٹ مینجر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یس سر.....!'' ایئر پورٹ مینجر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سب سے آگے طارق ہی تھا۔ ایئر پورٹ مینجر نے اُس کا کارڈ چیک کیا۔ اُس کے اصلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ مینجر نے کارڈ اُس کے حوالے کرتے ہوئے اُسے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کردیا۔ طارق نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ سکیورٹی آفیسر نے اُسے روک لیا۔

''اے! تم نہیں..... تم جہاز پر ہی رہو گے۔''

طارق کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ پیٹ میں گرہیں پڑنے کے ساتھ متلی سی ہونے لگی۔ اُس نے ضبط کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوسکا اور حلق سے عجیب سی آواز نکالتے ہوئے قے کر دی۔ اگر سکیورٹی آفیسر ایک دم پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اُس کی یونیفارم کا ستیاناس ہو جاتا۔ نیلم قریب ہی کھڑی تھی۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر طارق کو سہارا دیا اور اُس کی پیٹھ سہلانے لگی۔

''اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے سر!'' نیلم نے کہا۔ ''جہاز کا سارا کریو خوف زدہ ہے۔ پہلے کبھی اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا نہیں ہوا۔''

''ٹھیک ہے.....!'' سکیورٹی آفیسر نے نیلم کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسے دفتر میں بھیج دو۔''

اُس طیارے پر عملے کے آٹھ افراد تھے۔ کیپٹن، فرسٹ انجینئر، چار اسٹیورڈ اور دو ایئر ہوسٹس۔ طارق کے ساتھ ایک اور اسٹیورڈ کو نیچے اُتار دیا گیا اور نیلم کے ساتھ دوسری ایئر ہوسٹس کو بھی اُتار دیا گیا۔ نیلم کا کارڈ بھی چیک کیا گیا تھا۔ ان سب کو ایک جیپ پر ٹرمینل بلڈنگ کی طرف روانہ کردیا گیا۔ اور اس کے بعد طیارے کے مسافروں کی چیکنگ شروع ہوگئی۔

جیپ اُنہیں ٹرمینل بلڈنگ کے گیٹ کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ اس گیٹ پر ایئر

پورٹ سکیورٹی کے دو آدمی اور ایک گراؤنڈ ہوسٹس کھڑی تھی۔ نیلم، طارق کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ گراؤنڈ ہوسٹس بھی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی۔

''کیا ہوا.....؟'' اُس نے دوسری طرف سے طارق کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اسے سٹاف رُوم میں لے چلو!'' نیلم نے جواب دیا۔

''لیکن معاملہ کیا ہے..... فلائٹ کیوں روکی گئی ہے؟'' گراؤنڈ ہوسٹس نے پوچھا۔

''کیا تمہیں ابھی تک پتہ نہیں چلا.....؟'' نیلم نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... ہمیں کچھ پتہ نہیں ہے۔'' گراؤنڈ ہوسٹس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیپٹن کو اطلاع دی گئی تھی کہ طیارے میں دو ہائی جیکر موجود ہیں، جو کسی بھی وقت کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔ بروقت پتہ چل جانے پر طیارے کو روک لیا گیا ہے۔ اور اب سکیورٹی والے مسافروں کو چیک کر کے ہائی جیکروں کو تلاش کر رہے ہیں۔'' نیلم نے جواب دیا۔

وہ لوگ، لاؤنج سے ہوتے ہوئے سٹاف رُوم میں آ گئے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے جو نیلم وغیرہ سے مختلف سوال کرنے لگے۔ طارق نے ایک بار پھر اُبکائی لی اور دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر دوہرا ہو گیا۔ نیلم اُس پر جھک گئی۔

''ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے نیلم.....!'' طارق نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''اگر اشوک مہتہ اور بملا کا راز کھل گیا تو ہم بچ نہیں سکیں گے۔ مجھے شبہ ہے کہ.....'' ایک آدمی کو قریب آتے دیکھ کر طارق خاموش ہو گیا۔

''اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر کو بلاؤں.....؟'' قریب آنے والے شخص نے کہا۔ وہ بھی سکھ تھا، اور اُس کا تعلق ایئر پورٹ کے گراؤنڈ سٹاف سے تھا۔

''میرا خیال ہے، میں اسے باہر لے جاتی ہوں۔ تازہ ہوا میں طبیعت سنبھل جائے گی۔'' نیلم نے کہتے ہوئے طارق کو سہارا دے کر اُٹھایا۔

وہ دونوں سٹاف رُوم سے باہر آ گئے۔ اور چند سیکنڈ بعد بیرونی لاؤنج میں آ گئے، جہاں اچھی خاصی افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ سکیورٹی کے مسلح آدمی کئی جگہوں پر پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ بہت سے سکیورٹی والے تیزی سے اِدھر اُدھر آ، جا رہے تھے۔

نیلم، طارق کو سہارا دیئے لاؤنج سے باہر آ گئی۔ اُس کا رُخ لاؤنج کے سامنے والی سڑک کے دوسری طرف لان کی طرف تھا۔ وہ لاؤنج کے قریب پہنچ کر بھی نہیں رُکے بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے دوسری طرف سڑک پر آ گئے۔ اُسی وقت اُنہیں ایک کار نظر آئی۔ سٹیئرنگ کے سامنے ایک بوڑھا سکھ بیٹھا ہوا تھا، اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ نیلم نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی رُکوا

لی۔

''ان کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اگر آپ ہمیں شہر کے کسی ڈاکٹر تک پہنچا دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔'' نیلم نے کہا۔

''بیٹھو.....!'' بوڑھے سکھ نے فوراً ہی کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ طارق بدستور اُبکائیاں لیتا رہا۔ وہ کار چلانے والے بوڑھے سکھ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔

''کی گل ہے سجنو!'' بوڑھے نے مُڑ کر نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟''

''جی، سردار جی!'' نیلم نے جواب دیا۔ ''آپ گاڑی ذرا تیز چلایئے۔''

سردار جی، سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

''آپ ایئر ہوسٹس ہیں، اور یہ آپ کے ساتھی۔ آپ یہ تو بتاؤ! کہ جہاز روکا کیوں گیا ہے جی؟'' سردار جی نے پوچھا۔

''جہاز میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے سردار جی!'' نیلم نے جواب دیا۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ اس میں دو ہائی جیکر سوار ہیں جنہیں پکڑنے کے لئے جہاز کو گھیرے میں لیا گیا ہے۔'' سردار جی نے کہا۔

''افواہوں پر کان نہیں دھرنا چاہئے سردار جی! حقیقت وہی ہے، جو میں بتا رہی ہوں۔'' نیلم نے کہا۔

''ٹھیک ہے بادشاہو..... تُسی ٹھیک کہندے ہو۔'' سردار جی نے کہا اور سامنے دیکھنے لگے۔

طارق نے اُسی وقت ایک اور زوردار قسم کی اُبکائی لی۔ سردار جی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ اُنہیں شاید یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر بندے نے قے کر دی تو گاڑی کا ستیاناس ہو جائے گا۔

شہر کے پہلے چوراہے پر سردار جی نے گاڑی دائیں طرف موڑ دی اور تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے ہی دُکان پر ''رنجن کلینک'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

''یہ ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ اگر کہو تو میں آپ کے ساتھ چلوں؟'' سردار جی نے کہا۔

''نہیں سردار جی.....'' نیلم جلدی سے بولی۔ ''آپ نے یہاں تک پہنچا کر ہمیں بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔ میں اسے خود ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔''

''جیسی تہاڈی مرضی سجنو!'' سردار جی نے کندھے اُچکا دیئے۔

نیلم، طارق کو سہارا دے کر کلینک میں داخل ہوئی۔ یہ کسی لیڈی ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ پرانے سے بورڈ پر اُس کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی نیلم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ سردار جی کی گاڑی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت کلینک کے اندرونی دروازے سے ایک بوڑھی عورت نکلی۔ اُس کے جسم پر سفید سوتی ساڑھی تھی۔ اور سر کے بال بھی ساڑھی کی طرح سفید تھے۔ وہی ڈاکٹر رنجن تھی۔

''آیئے..... اندر آ جایئے!'' اُس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوری ڈاکٹر.....'' طارق نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہم غلطی سے یہاں آ گئے ہیں۔ ہمیں جانا دراصل کہیں اور تھا۔''

''اوہ..... کوئی بات نہیں۔ انسان تو بندہ بشر ہے۔ اکثر بھول جاتا ہے۔'' ڈاکٹر رنجن نے کہا۔

وہ دونوں ایک بار پھر معذرت کرتے ہوئے کلینک سے باہر آ گئے۔ نیلم نے گھوم کر دیکھا بوڑھے سکھ کی کار، موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ٹھیک اُسی لمحے ایک ٹیکسی کلینک کے سامنے آ کر رُکی۔ اُس میں تین افراد تھے۔ اگلی سیٹ پر ایک نوجوان سکھ بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر دو عورتیں تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان..... اُس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ زرد رنگت اور چہرے پر تکلیف کے تاثرات نمایاں تھے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے نوجوان نے سکھ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور پھر پچھلا دروازہ کھول کر نوجوان لڑکی کو سہارا دے کر کلینک میں لے گیا۔ نیلم اور طارق فوراً ہی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

''کتھے جانا ہے باؤ جی.....؟'' سکھ ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے مُڑ کر طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جلیانوالہ باغ.....!'' طارق نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے سیدھا ہوتے ہوئے ٹیکسی سٹارٹ کر دی۔ نیلم کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب وہ کہاں جائیں گے۔ لیکن طارق مطمئن تھا۔ امرتسر میں ایک ایسی جگہ اُس کے ذہن میں تھی جہاں اُس کے خیال میں اُنہیں پناہ مل سکتی تھی۔ اور وہ جگہ تھی، گورونانک سٹریٹ پر گوربخش سنگھ کا مکان..... یہ وہی سکھ نوجوان تھا، جسے تقریباً ساڑھے چار سال پہلے طارق اور سلیم نے شہر میں ہونے والے بلوے کے دوران زخمی حالت میں اُٹھایا تھا اور گورونانک سٹریٹ کے ایک مکان پر پہنچایا تھا۔ وہ خود بھی دو تین دن اُس مکان میں رہا تھا۔ طارق کو یقین تھا کہ اگر گوربخش سنگھ سے ملاقات ہو گئی تو اُنہیں دو چار دن کے لئے پناہ ضرور مل جائے گی۔ لیکن وہ براہِ راست اس مکان پر نہیں جانا چاہتے تھے۔

☆

طارق سوچ رہا تھا کہ جہاز کے کیپٹن کو دہلی سے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جہاز میں دو غیر ملکی جاسوس سوار ہیں۔ جن میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ اس حد تک یہ اطلاع بالکل درست تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ راز کیسے فاش ہوا کہ وہ دونوں اُس طیارے سے سرینگر جا رہے تھے۔ ابھی تک انٹیلی جنس کو یہی اطلاع ملی تھی کہ ایک مرد اور ایک عورت اُس طیارے پر سوار ہیں۔ ممکن ہے، اب تک یہ اطلاع بھی مل گئی ہو کہ وہ دونوں کس بھیس میں ہیں۔ طارق کو شبہ تھا کہ اُن کی روانگی کے بعد اُن کے گروپ کا کوئی آدمی پکڑا گیا ہوگا، جس نے اُن کے بارے میں بتا دیا۔ ویسے وہ اسے خوش قسمتی ہی سمجھتے تھے کہ سکیورٹی نے اُنہیں کلیئرنس دے کر جہاز سے اُترنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی طارق کی اداکاری بھی کام آئی تھی۔ اُس نے دوسروں کی نظروں سے چھپا کر حلق میں اُنگلی ٹھونس لی تھی جس سے اُسے قے ہو گئی۔ اس طرح اُنہیں جہاز سے اُترنے اور پھر ٹرمینل بلڈنگ سے بھی نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن طارق کے خیال میں وہ ابھی خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔ سڑکوں پر پھرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگر اُن کی پول کھل گئی اور اُن کی تلاش شروع ہو گئی تو وہ کسی بھی لمحے پکڑے جا سکتے تھے۔

طارق اور نیلم، ٹیکسی میں بیٹھے ایسا ظاہر کر رہے تھے، جیسے محض سیر و تفریح کے لئے نکلے ہوں۔ ساڑھے چار سال پہلے گوربخش سنگھ کے چاچا کے مکان میں رہتے ہوئے طارق نے کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، جن میں ایک کتاب امرتسر کی تاریخ کے بارے میں بھی تھی۔ اور اب وہ نیلم کو امرتسر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس شہر کی بنیاد چار سو سال پہلے سکھوں کے رُوحانی سلسلے کے چوتھے گرو رام داس نے رکھی تھی۔ اُس کے بیٹے گردار جن نے ایک تالاب کے وسط میں ایک گردوارہ تعمیر کروایا جس میں مذہبی کتاب گرنتھ صاحب رکھی گئی۔ گورمکھی زبان میں 'امرت' شہد کو اور 'سر' تالاب کو کہتے ہیں۔ یعنی شہد کا تالاب..... تب سے اُس شہر کا نام (امرتسر) پڑ گیا۔ 1803ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس گردوارے کو از سرِ نو تعمیر کروایا اور اس کے گنبد پر چار سو کلوگرام وزنی سونے کا پتر چڑھایا گیا۔ اُس گردوارے کی تعمیر میں ایسا ماربل استعمال کیا گیا تھا،

جس میں سنہری رنگت کی جھلک تھی۔ اسی لئے اُسے گولڈن ٹمپل کا نام دیا گیا تھا۔ سکھ اُسے ہرمندر یا دربار صاحب بھی کہتے ہیں۔

ٹیکسی، جلیانوالہ باغ کے گیٹ کے سامنے رُک گئی۔ طارق نے ڈرائیور کو پیسے دیئے اور اُتر کر گیٹ میں داخل ہو گئے۔ بڑا خوب صورت باغ تھا۔ اس وقت باغ میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ طارق اب نیلم کو اس جلیانوالہ باغ کا تاریخی پس منظر بتا رہا تھا۔ 13 اپریل 1919ء کو یہاں ایک پُر امن جلسے پر ایک انگریز جنرل ڈائر نے گولی چلوا دی تھی جس کے نتیجے میں تین سو سے زائد لوگ مارے گئے تھے۔ جلیانوالہ باغ میں اس واقعے کی ایک یادگار بھی قائم ہے۔

وہ دونوں اس یادگار کے قریب پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ لوگ اُس یادگار کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ دونوں اُس یادگار کے قریب سے گزرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ چند منٹ بعد وہ ایک بار پھر سڑک پر پہنچ گئے۔ ایک تانگے والا دربار صاحب کی آواز لگا رہا تھا۔ اُس نے اُنہیں تانگے میں بٹھانے کی کوشش بھی کی، لیکن طارق نے تانگے کے بجائے قریب کھڑے ہوئے رکشے کو ترجیح دی۔

گولڈن ٹمپل کے سامنے رکشہ چھوڑ کر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی نے چند ہی منٹ میں اُنہیں گورونانک سٹریٹ پر پہنچا دیا اور وہ اُتر کر پیدل ہی ایک طرف چلنے لگے۔

ساڑھے چار سال پہلے طارق جب یہاں آیا تھا تو رات کا وقت تھا۔ اور اب دن کی روشنی میں اُسے مکان تلاش کرنے میں کچھ دُشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن بہرحال! وہ اندازے کی بناء پر ایک مکان کے سامنے رُک گیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔ اُس وقت گلی میں دو عورتیں آ رہی تھیں۔ دونوں عورتیں ادھیڑ عمر تھیں اور دونوں کے ہاتھوں میں ٹوکریاں تھیں جن سے سبزیوں کے پتے جھانک رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بازار سے سودا سلف خرید کر آ رہی تھیں۔ ایک عورت تو آگے نکل گئی اور دوسری ساتھ والے مکان کے سامنے رُک گئی۔ اُسے دیکھ کر طارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ یہ عورت وہی لیڈی ڈاکٹر تھی، جس نے اُس رات گوربخش سنگھ کا علاج کیا تھا۔ وہ عورت بھی اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُسی لمحے مکان کا دروازہ کھلا اور وہ عورت اندر چلی گئی۔

طارق کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ صحیح مکان تک پہنچا تھا۔ اُس نے دروازے پر ایک بار پھر دستک دی۔ اُس کے چند منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور ایک نوجوان باہر نکل آیا جس کی عمر بائیس تیئس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

"کس سے ملنا ہے جی آپ کو؟" اُس نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"گوربخش سنگھ سے۔ چار سال پہلے یہاں....."

"گوربخش سنگھ یہاں نہیں رہتا۔ وہ تو ترن تارن میں ہے۔" نوجوان نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ شاید اُس کے دوست کا مکان ہے۔ میں اس کا نام بھول رہا ہوں۔" طارق کنپٹی پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں..... یاد آیا۔ کرتار سنگھ! کیا اُس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"کرتار سنگھ تو میرا ہی نام ہے۔ تم لوگ کون ہو؟" نوجوان نے کہا۔ نیلم اس وقت اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ وہ بار بار گلی میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

"یہاں گلی میں بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم ہمیں بیٹھک میں بٹھا سکتے ہو؟ اطمینان سے بات کریں گے۔" طارق نے کہا۔

نوجوان نے ایک بار پھر باری باری دونوں کی طرف دیکھا، پھر اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مکان سے ملحق بیٹھک کا دروازہ کھل گیا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ طارق نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

"آپ لوگوں کا تعلق شاید انڈین ایئر لائن سے ہے۔" کرتار سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے طارق کی طرف دیکھا۔

"کسی حد تک تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔" طارق نے جواب دیا۔ پھر اصل موضوع پر آ گیا۔ "تمہیں شاید یاد ہو کہ تقریباً ساڑھے چار سال پہلے یہاں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ بھارتی ہندوؤں نے گولڈن ٹمپل کے ایک حصے کو آگ لگا دی تھی۔ ان ہنگاموں میں تمہارا دوست گوربخش بھی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اُسے دو گولیاں لگی تھیں۔ تم اُن دنوں اپنے ماما کے پاس ہوشیار پور گئے ہوئے تھے۔"

"آہو جی..... مجھے سب کچھ یاد ہے۔ مجھے ابا جی نے بتایا تھا۔ میرے دوست کو دو کشمیری مسلمانوں نے بچایا تھا۔ وہی اُسے زخمی حالت میں اُٹھا کر یہاں لائے تھے۔ پھر شہر میں کرفیو لگ گیا تھا اور وہ بھی تین چار دن ہمارے گھر میں ہی رہے تھے۔" کرتار سنگھ نے کہا۔

"ہاں..... میں اُن دونوں میں سے ایک ہوں۔" طارق نے جواب دیا۔ "تمہارا باپ کہاں ہے؟ وہ مجھے پہچان لے گا۔"

"ابا تو تین چار دن سے ترن تارن گیا ہوا ہے۔ کوئی کام ہو تو آپ مجھے بتائیے!" کرتار سنگھ نے کہا۔

"کیا ہم، تم پر اعتماد کر سکتے ہیں؟" طارق نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"آپ نے میرے دوست کی جان بچائی تھی۔ مجھے تو افسوس ہوا تھا کہ میں اُس وقت آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکا تھا۔ میری گردن تو آپ کے احسان کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، بلا جھجک کہیئے۔" کرتار سنگھ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ اس ایئر ہوسٹس کو بھگا کر لائے ہیں؟" نیلم کے ماتھے پر بندیا کی وجہ سے شاید وہ اُسے ہندو سمجھ رہا تھا۔

"تم غلط سمجھے۔" طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ یہ ایئر ہوسٹس ہندو نہیں ہے۔ میری طرح مسلمان ہے اور میں اُسے بھگا کر نہیں لایا۔ ہم دونوں دراصل مفرور ہیں۔ پولیس ہماری تلاش میں ہے اور ہمیں پناہ گاہ کی تلاش ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" کرتار سنگھ نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

طارق نے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر کرتار سنگھ کو اپنی کتھا سنانے لگا۔ آخر میں وہ بولا۔ "ہمارا پروگرام سرینگر جانے کا تھا۔ لیکن ہمارا راز کھل گیا اور ہم بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک شہر میں ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔"

"فکر ہی نہ کرو جی!" کرتار سنگھ نے کہا۔ "اب تو مجھے آپ کا احسان اُتارنے کا موقع مل گیا ہے۔ آرام سے گھر میں رہو۔ واہ گرو کی قسم! اگر کسی نے تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا تو کرتار سنگھ وہ ہاتھ کاٹ ڈالے گا۔ میں آج ہی ایک آدمی کو ترن تارن بھیج دیتا ہوں۔ شام تک ابا بھی آ جائے گا۔"

ترن تارن زیادہ دُور نہیں تھا۔ کرتار سنگھ کا باپ اوتار سنگھ شام سے پہلے پہلے آ گیا۔ اُس کے ساتھ گوربخش سنگھ بھی تھا۔ وہ طارق کو پہچانتے ہی واہ گرو کا نعرہ لگاتے ہوئے اُس سے لپٹ گیا۔ طارق جب گوربخش سنگھ سے فارغ ہوا تو اوتار سنگھ نے اُسے لپٹا لیا۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے پتر......!" وہ طارق کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "پر تمہارا دوسرا بیلی کہاں ہے......؟"

"وہ فوت ہو گیا ہے سردار جی!" طارق نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

بوڑھا اوتار سنگھ اُداس ہو گیا۔ چند لمحے فضا پر سوگواری سی طاری رہی، پھر وہ بتدریج معمول پر آتے چلے گئے۔

"اور سناؤ پتر! کیسے آنا ہوا...... اتنا عرصہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے......؟" اوتار سنگھ نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں ابا جی......!" طارق سے پہلے کرتار سنگھ بول پڑا۔ اور پھر اُس نے طارق سے سنی ہوئی پوری کہانی سنا ڈالی۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "میں آج دن بھر شہر کی خبریں لیتا رہا ہوں۔ یہ جس جہاز پر آئے تھے، وہ تو دو گھنٹے بعد سرینگر چلا گیا۔ لیکن پولیس ان دونوں کو پورے شہر میں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ سنا ہے، دِلّی سے بھی انٹیلی جنس کے کچھ آدمی منگوائے گئے ہیں۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ پاکستانی سرحد کی طرف جانے والے راستوں پر تو بڑی سختی سے چیکنگ ہو رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ سرحد پار کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"سردار جی!" طارق نے کرتار سنگھ کے خاموش ہونے پر اوتار سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس خیال سے یہاں آ گیا تھا کہ ہمیں اس گھر میں ایک دو دن پناہ مل جائے گی۔"

"اچھا کیا جو تم لوگ یہاں آ گئے۔" اوتار سنگھ نے جواب دیا۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ذرا تمہاری تلاش کا شور شرابہ ٹھنڈا ہو جائے تو ہم خود تمہیں چھوڑ آئیں گے، جہاں کہو گے۔"

"شکریہ سردار جی......!" طارق نے کہا۔

"پر یہ تو بتاؤ پتر! کہ یہ تمہاری گھر والی ہے......؟" اوتار سنگھ نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں سردار جی!" طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ بھی ایک مجاہدہ ہے۔ اپنے وطن کی آزادی کے لئے اس نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔"

"سلام ہے تیری ہمت کو کڑیئے!" سردار اوتار سنگھ نے توصیفی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کاکے!" اُس نے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ "جا! اپنی ماں سے کہہ کہ پروہنی کا بسترا اپنے کمرے میں بچھا دے۔ طارق پتر کوٹھے پر سوئے گا، میرے ساتھ۔"

سردار جی نے گویا ابھی سے اُن کے سونے کا بھی بندوبست کر دیا۔ رات کے کھانے کے بعد نیلم سردارنی کے کمرے میں ہی رہ گئی اور طارق، مردوں کے ساتھ اُوپر آ گیا۔ اُوپر دو کمرے تھے۔ ایک میں اوتار سنگھ کے ساتھ طارق کے لئے بھی چارپائی ڈال دی گئی تھی جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ لوگ رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کرتار سنگھ اور گوربخش سنگھ نیچے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد طارق، اوتار سنگھ سے مزید کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور کچھ ہی دیر میں وہ سو گیا۔

صبح اُس کی آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ کرتار سنگھ اُس کے لئے فوراً ہی چائے کا کپ اور پانی کا

گلاس لے آیا۔ اُس نے اُٹھ کر کلی کی اور چائے پینے لگا۔ کرتار سنگھ اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ طارق نے چائے کے ابھی چند ہی گھونٹ پیئے تھے کہ نیلم آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں انگریزی کا اخبار تھا اور چہرے پر پیلاہٹ نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔

''خیریت......؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''سب کچھ......ختم ہو گیا طارق......!'' نیلم نے بمشکل کہا اور اخبار اُس کی طرف بڑھا دیا۔

یہ ایک مقامی روزنامہ تھا۔ اُس کی ہیڈ لائن ہی طارق پر لرزہ طاری کر دینے کے لئے کافی تھی۔ اُس نے چائے کا کپ چھوٹی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خبر پڑھنے لگا......

اخبار کی اطلاع کے مطابق کل صبح جب یہ دونوں جہاز پر سوار ہو گئے تھے، اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے گروہ کا ایک آدمی پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا جس نے پولیس کو بتا دیا تھا کہ نیلم اور طارق سرینگر جانے والے جہاز پر سوار ہیں۔ اس اطلاع پر جہاز کو امرتسر ایئر پورٹ پر اُتار کر گھیرے میں لے لیا گیا تھا اور مسافروں کو چیک کیا گیا تھا۔ لیکن سکیورٹی والوں کو جہاز پر نیلم یا طارق نام کا کوئی مسافر نہیں ملا تھا اور نہ ہی کوئی مشتبہ شخص نظر آیا تھا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد دہلی پولیس نے پکڑے جانے والے شخص سے مزید بہت کچھ اُگلوا لیا۔ اُس نے پولیس کو یہ تک بتا دیا کہ کناٹ پیلس پر ڈلہوزی ہاؤس دہلی میں موجود کشمیری مجاہدین کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ پولیس کی بھاری جمعیت نے ڈلہوزی ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا۔ اس طرح پولیس اور ڈلہوزی ہاؤس میں موجود کشمیری مجاہدین میں زبردست مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں دہلی میں کشمیری مجاہدین کی خفیہ تنظیم کا لیڈر شاہ رُخ اور اُس کے چند آدمی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ دوپہر کے وقت پولیس، مولانا آزاد روڈ پر واقع شاہ رُخ کی کوٹھی پر بھی پہنچ گئی۔ کوٹھی کے تہ خانے سے انڈین ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس بملا اور اسٹیورڈ اشوک مہتہ بندھے ہوئے مل گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُنہیں کل رات اغواء کر کے یہاں قید کیا گیا تھا اور اُن سے اُن کی ڈیوٹی اور جہاز کے دوسرے کریو کے بارے میں سوالات کیئے گئے تھے۔

یہ راز فاش ہوتے ہی امرتسر ایئر پورٹ اور پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔ امرتسر ایئر پورٹ کے حکام اور سکیورٹی والے ایئر پورٹ سے بملا اور اشوک مہتہ کی گمشدگی سے پریشان تھے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ اشوک مہتہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہو گی اور وہ کسی ہسپتال یا پرائیویٹ کلینک میں ہو گا۔ دہلی سے اُن کے بارے میں یہ سنسنی خیز اطلاع ملنے پر پہلے سے زیادہ شدومد سے اُن کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن آخری اطلاعات آنے تک اُن کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

طارق نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اُسے شاہ رُخ اور اپنے دوسرے دوستوں کی موت پر

صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ پولیس کو ان دونوں کے اور شاہ رُخ وغیرہ کے بارے میں اطلاع دینے والا کون تھا۔ پولیس نے اُس شخص کا نام صیغہ راز میں رکھا تھا۔ تقریباً گھنٹے بعد وہ سب لوگ اکٹھے ہی بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

''پریشان کیوں ہو رہے ہو پتر......؟'' سردار اوتار سنگھ نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے ''آزادی کے راستے میں بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اور یہ قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں سردار جی!'' طارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سے منصوبہ بری طرح متاثر ہو گا۔ ہمیں جلد سے جلد سرینگر پہنچنا چاہیئے۔''

''ایک دو دن رُک جاؤ! میں سارا بندوبست کر دُوں گا۔ رب خیر کرے گا۔'' اوتار سنگھ نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

ناشتے میں اگرچہ بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن طارق کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس نے صرف ایک کپ چائے پر ہی اکتفا کیا۔ یہی کیفیت نیلم کی بھی تھی۔ سردار اوتار سنگھ اور اُس کی بیوی نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ بھی شاید اُن کی کیفیت کو سمجھ چکے تھے۔

کرتار سنگھ اور گوربخش سنگھ دن بھر اُنہیں معلومات فراہم کرتے رہے۔ پورے شہر میں وسیع پیمانے پر اُن کی تلاش ہو رہی تھی۔ کئی مسلمانوں اور سکھوں کو محض اس شبہے میں حراست میں لے لیا گیا تھا کہ اُنہوں نے اُن دونوں کو پناہ نہ دی ہو یا اُنہیں شہر سے فرار ہونے میں مدد نہ دی ہو۔ ظاہر ہے، کوئی ان کے بارے میں کیا بتا سکتا تھا؟

دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن اوتار سنگھ کی بیوی کلدیپ کور، نیلم کو اپنے ساتھ بازار لے گئی۔ ہوسٹس بملا والا میک اَپ ختم کر دینے کے بعد نیلم کا حلیہ کافی حد تک بدل گیا تھا۔ اور پھر کلدیپ کور نے بھی کچھ کمال کر دکھایا تھا۔ کلدیپ کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ بڑی بہت حسین تھی۔ وہ بڑی پُرخلوص اور دل میں چاہت رکھنے والی عورت تھی۔ وہ نیلم کو لے کر شہر کے مختلف بارونق بازاروں میں پھرتی رہی۔ اندرون لاہوری دروازے پر واقع ایک دکان سے اُس نے نیلم کے لئے چند ریڈی میڈ جوڑے بھی خریدے۔ اس دُکان میں کلدیپ کی ایک جاننے والی بھی مل گئی۔

''یہ میری نند کی دیورانی ہے۔ کل شام کو بٹالے سے آئی ہے۔'' کلدیپ کور نے اُس سے تعارف کرایا۔ ''اور لاڈو! یہ میری سہیلی بسنت کور ہے۔ ہم کالج میں دو سال اکٹھی پڑھ چکی ہیں۔ اس کے شوہر رٹز سینما کے مالک ہیں۔''

نیلم نے بالکل سکھوں کے انداز میں اُسے پرنام کیا۔ وہ کچھ دیر تک دُکان ہی میں کھڑی باتیں کرتی رہیں، پھر ایک دوسرے سے رُخصت ہوگئیں۔

شہر میں گھومتے ہوئے نیلم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پولیس اور سادہ لباس والے اب بھی اُن کی تلاش میں تھے۔ اُس نے کئی مقامات پر چیکنگ ہوتے بھی دیکھی تھی۔

دو دن مزید گزر گئے۔ اور پھر اُن کے جانے کا پروگرام بن گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ نیلم صبح سویرے بس کے کے ذریعے ترن تارن کے لئے روانہ ہو جائے گی۔ اور اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد طارق اور اوتار سنگھ وغیرہ نکلیں گے۔ لیکن پھر پروگرام میں یہ تبدیلی کر دی گئی کہ کرتار سنگھ کو کلدیپ کور اور نیلم کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

یہ لوگ چھ بجے گھر سے نکل گئے۔ گلی سے نکلتے ہی تانگہ مل گیا اور یہ لوگ پندرہ بیس منٹ میں بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ اُنہیں سات بجے کھیم کرن جانے والی بس پر جگہ مل گئی۔ کلدیپ کور کسی دوسری عورت کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ نیلم، کرتار سنگھ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

یہ بس ترن تارن اور مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی کھیم کرن تک جاتی تھی۔ کھیم کرن، سرحدی قصبہ تھا جہاں سرحد کے اُس پار چند میل کے فاصلے پر پاکستان کا شہر قصور تھا۔

بس، اڈے سے روانہ ہونے کے بعد دو جگہوں پر رُکی تھی اور پھر شہر سے نکل کر جیسے ہی ترن تارن کی طرف جانے والی سڑک پر مُڑی، اُسے روک لیا گیا۔ یہاں سڑک پر ایک عارضی پولیس چوکی بنی ہوئی تھی۔ بس رُکتے ہی دو پولیس والے اندر گھس آئے اور مسافروں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اس بس میں تقریباً سارے ہی مسافر سکھ تھے۔ دو بوڑھے مسلمان تھے۔ ہندو کوئی نہیں تھا۔ سکھوں نے جب سے خالصتان کا نعرہ بلند کیا تھا، ہندوؤں کی اکثریت امرتسر اور سکھوں کی اکثریت والے شہر چھوڑ کر اُن شہروں میں منتقل ہوگئی تھی، جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ چار سال پہلے جب سکھوں کے دربار صاحب ''گولڈن ٹمپل'' کو آگ لگائی گئی تھی، اُن دنوں مشرقی پنجاب میں ہندوؤں کی شامت ہی آگئی تھی۔ جو ہندو یہاں رہ بھی گئے تھے، وہ سفر کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

بڑی سخت چیکنگ تھی۔ پولیس والوں کا رویہ بھی بڑا سخت تھا۔ وہ ہر شخص سے اس طرح سوالات کر رہے تھے، جیسے وہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہو۔ ایک پولیس والے نے عورتوں سے بھی سوال جواب شروع کر دیئے۔ لیکن نیلم کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک بڑھیا نے اُس پولیس والے کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ مزید کسی عورت سے کوئی سوال کیے بغیر بس سے اُتر گیا۔ سڑک پر لگا ہوا آہنی بیریئر ہٹا دیا گیا اور بس آگے روانہ ہوگئی۔ نیلم نے اطمینان کا سانس

...یٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

...ارق، اوتار سنگھ اور گوربخش سنگھ کے ساتھ آٹھ بجے صبح گھر سے نکلا۔ وہ بھی گلی سے نکل کر ...نگے میں سوار ہو کر پندرہ بیس منٹ بعد گھاس منڈی پہنچ گئے۔ طارق جس حلیے میں گھر ...نکلا تھا، اُس پر اُسے خود بھی ہنسی آ رہی تھی۔ کھدر کا لمبا کرتا، سیاہ لاچہ جس کا ایک بالشت چوڑا ...سنہری تھا، سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی پگڑی، گلے میں سیاہ رنگ کا دھاگہ لپٹا ہوا تھا ...پر کرپان بندھی ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس حلیے میں بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ وہ ...طور پر ایک نوجوان سکھ ہی لگ رہا تھا۔ گوربخش سنگھ اور اوتار سنگھ بھی اپنے مخصوص لباس میں

...گھاس منڈی میں داخل ہوتے ہی اوتار سنگھ نے اُنہیں ایک جگہ روک دیا اور خود آگے بڑھتا ...گیا۔ یہ وہ منڈی تھی، جہاں سے پورے شہر کے لوگ اپنے مویشیوں اور پالتو جانوروں کے ...چارہ اور پٹھے خریدتے تھے۔ جگہ جگہ پٹھوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ کئی ٹریکٹر ٹرالیاں بھی ...سے لدی ہوئی کھڑی تھیں۔ بعض جگہوں پر نیلامی ہو رہی تھی اور بعض جگہوں پر ویسے ہی ...ے ہو رہے تھے۔

...اوتار سنگھ ایک ٹرالی کے پاس رُک گیا۔ یہ ٹرالی پٹھوں سے لدی ہوئی تھی اور ایک ادھیڑ عمر سکھ ...ں کے انبار پر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اوتار سنگھ کو دیکھ کر وہ چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔ ...ئے گیان سنگھ!'' اوتار سنگھ نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ ''کیا ہوا؟ تمہارے پٹھے بکے نہیں ابھی ...ے......؟''

''سودا ہو گیا ہے بھا جی! بیوپاری بیعانہ دے گیا ہے۔ ابھی رقم لے کر آتا ہی ہوگا۔ پر وہ ...پروہنے کہاں ہیں؟'' گیان سنگھ کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''وہ گوربخش سنگھ کے سال پرلی طرف کھڑا ہے۔ میں اُسے لے کر آتا ہوں۔ تو بیوپاری کو ...کر کے پٹھے اُتروا۔'' اوتار سنگھ کہتا ہوا اُس طرف چل دیا جہاں طارق اور گوربخش سنگھ ...ے تھے۔ وہ اُنہیں لے کر ٹرالی کے قریب آ گیا۔

...گیان سنگھ، اوتار سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا۔ ترن تارن میں اُن کی زمین تھی۔ پہلے ہمیشہ اُن کا ...ل لے کر منڈی آیا کرتا تھا۔ لیکن آج خاص طور پر گیان سنگھ پٹھے لے کر آیا تھا۔ چند منٹ ...بیوپاری بھی رقم لے کر آ گیا اور ٹرالی سے پٹھے اُتارے جانے لگے۔ پانچ منٹ میں ٹرالی خالی

...ٹھو بھا جی...... چلیں! راستے میں لاٹو پہلوان کو بھی لینا ہے۔ وہ تانگے پر بیٹھا ہمارا انتظار

کر رہا ہوگا۔'' گیان سنگھ کہتا ہوا ٹریکٹر پر بیٹھ گیا جبکہ طارق وغیرہ ٹرالی پر سوار ہو گئے۔

ٹریکٹر، گھاس منڈی سے نکل کر ترن تارن کی طرف جانے والی سڑک پر ہولیا۔ شہری حدود پر واقع چونگی ناکے پر ایک دُبلا پتلا سا آدمی اُن کا منتظر تھا۔ ٹریکٹر رُکتے ہی اُس نے اپنے قریب زمین پر پڑی ہوئی ایک بڑی سی گٹھڑی اُٹھا کر ٹرالی پر ڈالی اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ وہ بھی سکھ تھا۔

''یہ لاٹو پہلوان ہے۔'' اوتار سنگھ نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جسم میں جان نہیں ہے، پر پہلوانی کرتا ہے۔ اسے اکھاڑے سے ہمیشہ سٹریچر پر ڈال کر ہی لے جایا گیا ہے۔ کئی مرتبہ سمجھایا ہے، باز آجا پہلوانی سے۔ پر مانتا ہی نہیں۔''

''چاچا! تمہیں کیا پتہ، پہلوانی کیا ہوتی ہے؟'' لاٹو پہلوان نے جواب دیا۔ ''امرتسر کا نام ہی پہلوانوں کی وجہ سے مشہور ہوا ہے۔''

''آہو جی..... تم نے ہی تو امرتسر کا نام دنیا میں روشن کیا ہے۔ او، باز آجا لاٹو! ورنہ کسی روز اکھاڑے سے تمہارا جنازہ ہی اُٹھے گا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

لاٹو پہلوان کا نام تو کچھ اور تھا۔ مگر وہ لاٹو کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ گیان سنگھ کا مزارع تھا۔ اوتار سنگھ کے باپ نے ہی اُسے پالا تھا۔ اس لئے یہ گھر والوں سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اُسے گھر کا ایک فرد ہی سمجھا جاتا تھا۔

چیک پوسٹ پر اُنہیں روک لیا گیا.....

''کیہ گل ہے سنتری بادشاہو.....؟'' گیان سنگھ نے پولیس والے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا۔ ''ابھی تمہارا گمشدہ بندہ نہیں ملا؟''

''یہ کون لوگ ہیں.....؟'' سپاہی نے قدرے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

''یہ میرا بھاجی ہے، اوتار سنگھ۔ اور یہ اس کا بیٹا بچن سنگھ اور یہ میرا پتر ہے کرتار سنگھ۔ اور کچھ سنتری بادشاہ.....؟'' گیان سنگھ نے جواب دیا۔

''اور یہ.....؟'' کانسٹیبل نے لاٹو پہلوان کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں اوئے لاٹو پہلوان!'' اوتار سنگھ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کہتے تھے کہ سارا زمانہ تمہیں جانتا ہے۔ پر اس سنتری بادشاہ نے تو تمہیں پہچانا ہی نہیں۔''

''میں پہلوان ہوں بابا، اوتار سنگھ جی! کوئی جیل سے بھاگا ہوا مجرم نہیں، جو پولیس مجھے پہچانتی ہو۔ میں پولیس والوں سے یاری رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ وقت آنے پر یاروں کو بھی پکڑ کرلے جاتے ہیں۔''

''چپ اوئے! ورنہ ابھی لے جا کر بند کر دُوں گا۔'' سپاہی نے اُسے ڈانٹ دیا۔ اُس نے ی باری اُن سب کے چہروں کا جائزہ لیا اور پھر بیریئر پر بیٹھے ہوئے سپاہی کو اشارہ کر دیا۔ یئر کی زنجیر ہٹ گئی اور گیان سنگھ نے ٹریکٹر آگے بڑھا دیا۔

''اوئے! تو اُس سنتری کو جانتا ہے گیان سنگھ.....؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

''سب انسپکٹر واقف ہے..... وہ درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ صبح جب میں ترن ن سے آیا تھا تو اُس نے پٹھوں کا ایک گٹھا اپنی بھینس کے لئے اُتروالیا تھا۔'' گیان سنگھ نے ب دیا۔

طارق نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ترن تارن پہنچ گئے۔ یہ ایک ڑا قصبہ تھا بلکہ شہر کے زمرے میں آچکا تھا۔ اُن کا گاؤں شہر سے دوسری طرف تقریباً چار کے فاصلے پر تھا۔

گاؤں میں طارق اور نیلم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ آزادی سے گھومتے رہے۔ ایک رات گاؤں میں گزارنے کے بعد وہ صبح سویرے ٹریکٹر ٹرالی پر رُخصت ہو گئے۔ گیان سنگھ اور ش سنگھ اُن کے ساتھ تھے۔ نیلم اور طارق کے حلئے اب بھی سکھوں والے ہی تھے۔

اُن کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ لہلہاتی فصلیں اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ن بہت بھلے لگ رہے تھے۔ انہی کھیتوں میں کچھ چھوٹی چھوٹی سڑکیں بھی تھیں جو دیہاتوں تی تھیں۔ اُن کا رُخ واہگہ کی طرف تھا۔ واہگہ تک جانے کے لئے اگرچہ ایک پختہ سڑک بھی تھی۔ لیکن گیان سنگھ، کھیتوں کے درمیان کچے راستے اختیار کئے ہوئے تھا، جس سے ٹرالی کو رح جھٹکے لگ رہے تھے۔ طارق اور نیلم کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا تھا۔ تیس پینتیس میل کا فاصلہ ں میں طے ہوا۔ آخر کار وہ گراؤنڈ ٹرنگ روڈ پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک دائیں سمت میں امرتسر ف اور بائیں سمت میں پاکستان کی سرحدی چوکی واہگہ کی طرف چلی گئی تھی۔ جس جگہ وہ جی پر پہنچے تھے، وہاں سے واہگہ صرف دو میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن گیان سنگھ سڑک کو عبور کر یکٹر کو دوسری طرف ایک چھوٹی سی بستی میں لیتا چلا گیا۔

ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کی آبادی بھی سکھوں پر مشتمل تھی۔ بستی سے نکل کر وہ ایک بار ں میں کچے راستے پر پہنچ گئے۔ بستی میں سے گزرتے ہوئے کسی نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔

رحد کے ساتھ تقریباً متوازی دو گھنٹے تک سفر کرتے رہے۔ اور آخر کار ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں بیس بائیس گھروں پر مشتمل تھا۔ تمام کی تمام آبادی سکھوں پر

مشتمل تھی۔ بستی کے شروع میں ایک بہت بڑا جوہڑ تھا۔ کنارے پر کچھ عورتیں بیٹھی کپڑ
رہی تھیں۔ اُن کے قریب ہی ننگ دھڑنگ بچے پانی میں گھسے ایک دوسرے پر چھینٹے
رہے تھے۔ قریب ہی دو تین خارش زدہ کتے پانی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوہڑ کے وسط میں
بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

گیان سنگھ نے اُس جوہڑ سے ملحق بستی کے پہلے مکان کے سامنے ٹریکٹر روک لیا اور
بند کرتے ہوئے طارق اور نیلم کو اُترنے کا اشارہ کیا۔ گوربخش سنگھ اُن سے پہلے ہی دوڑ
مکان میں داخل ہو چکا تھا۔

یہ گیان سنگھ کے ہم زُلف چرن سنگھ کا مکان تھا جو اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندا
پاکستان کی سرحد یہاں سے صرف ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ اور چرن سنگھ کی
سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

چرن سنگھ اُس وقت گھر پر ہی موجود تھا۔ اُس نے بڑی گرمجوشی سے اُن کا استقبال کیا
منٹ وہ لوگ ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرتے رہے، پھر چرن سنگھ نے کہا۔ ''تم
منہ ہاتھ دھولو! کھانا بالکل تیار ہے۔ کھانے کے بعد آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

کھانے میں خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانا دیکھ کر طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دُشوار
نہیں آئی کہ چرن سنگھ کو ان کے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی۔ وہ لوگ ساڑھے سات بجے
تارن سے روانہ ہوئے تھے اور اب دو بجنے والے تھے۔ کھانے کے بعد نیلم کو تو گھر کی
کے پاس بھیج دیا گیا اور طارق اُن کے ساتھ بیٹھک والے کمرے میں آ گیا۔

''کل شام کو مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔'' چرن سنگھ نے گیان سنگھ کی طرف دیکھتے ہو
''میں نے سارا انتظام مکمل کر لیا ہے۔ لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''پچھلے تین چار روز سے رینجر کے آدمی بار بار ہمارے گاؤں میں چکر لگا رہے ہیں۔
دِلّی سے بھاگے ہوئے دو افراد کی تلاش ہے۔ اُن میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ اُ
کہنے کے مطابق وہ دونوں بھیس بدل کر جہاز کے عملے کے ساتھ امرتسر گئے تھے اور ہوائی
سے غائب ہو گئے تھے۔ حکام کا خیال ہے کہ وہ دونوں سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل
کی کوشش کریں گے۔ میلوں دُور تک سرحد کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ رینجرز والے کئی مرتبہ
آ چکے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اگر اس علاقے میں کسی مشتبہ شخص کو دیکھا جائے تو فوراً
چوکی پر اطلاع دی جائے۔ لیکن بہرحال! میں نے تمام انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ انہیں

ہی سرحد پار کرا دی جائے گی۔ سرحد کے اُس طرف اُنہیں کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا۔
ری طرف ان کا مقدر۔'' چرن سنگھ نے کہا۔
''سرحد پار پاکستان کا کون سا علاقہ لگتا ہے......؟'' طارق نے پوچھا۔
''بھینی......!'' گیان سنگھ نے جواب دیا۔ ''بہت بڑا گاؤں ہے۔ بالکل سرحد پر واقع ہے۔
گاؤں کا زمیندار چودھری برکت میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہمارے کھیت سرحد پر ملے
ے ہیں۔ اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اُس سے بھی بات کر رکھی ہے۔ سرحد کے
ری طرف چودھری برکت کے آدمی منتظر ہوں گے۔ وہ انہیں گاؤں پہنچا دیں گے۔''
''یہاں سے کس وقت نکلنا ہو گا؟'' طارق نے پوچھا۔
''رات ٹھیک دو بجے رینجرز کی گشتی پارٹی یہاں سے گزرتی ہے۔ ہم لوگ دو بجے سے پہلے
د کے قریب پہنچ جائیں گے۔ وہاں میرا مویشیوں کا باڑہ ہے۔ رینجرز کی گشتی پارٹی جیسے ہی
ر جائے گی، تم لوگوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔'' چرن سنگھ نے جواب دیا۔ ''اب تم
کچھ آرام کر لو! مجھے اس سلسلے میں ایک دو آدمیوں سے ملنا ہے۔ شام کو ملاقات ہو گی۔''
چرن سنگھ چلا گیا۔ گیان سنگھ بھی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ طارق کرسی سے اُٹھ کر
ن پر لیٹ گیا۔ ٹریکٹر ٹرالی پر چار پانچ گھنٹوں کے سفر نے اُس کا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا تھا اور وہ
طرح تھکن محسوس کر رہا تھا۔ دیوان پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔
اُس کی آنکھ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی کھلی تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں رات کا کھانا جلد
الیا جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی کھانے وغیرہ سے جلد ہی فارغ ہو گئے اور پھر باتوں کا سلسلہ چل

ایک بجے کے قریب دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں نوجوان سکھ تھے۔ چرن
نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھا۔
''رینجرز کی گشتی پارٹی نکل چکی ہے۔ وہ لوگ ٹھیک ایک گھنٹے بعد واپس آئیں گے۔ ہمیں
ے پہلے پہلے ہی ڈیرے پر پہنچ جانا چاہئے۔'' آنے والے دونوں نوجوانوں میں سے ایک
کہا۔
''ٹھیک ہے...... ہم لوگ تیار ہی بیٹھے ہیں۔ چلو، اُٹھو بھئی!'' چرن سنگھ نے طارق کی طرف
تے ہوئے کہا۔
طارق اور نیلم نے شام ہی کو اپنے حلئے بدل لئے تھے۔ اب وہ لباس سے سکھ نہیں، مسلمان
ے تھے۔ طارق نے گوربخش سنگھ سے ہاتھ ملایا اور اُن دونوں کے ساتھ کمرے سے نکل

آیا۔

رات تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خنکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ لوگ بستی سے نکل کر کھیتوں کی طرف جانے والے راستے پر ہو لئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کھیتوں میں ایک تنگ پگڈنڈی پر پہنچ گئے اور تاریکی میں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ سب سے آگے وہ دونوں نوجوان سکھ تھے۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں چینی ساخت کی آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔ اُن کے پیچھے چرن سنگھ تھا۔ اس کے بعد نیلم، پھر طارق اور آخر میں گیان سنگھ۔ چرن سنگھ اور گیان سنگھ کے ہاتھوں میں بھی آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا اور مویشیوں کا باڑہ سا بنا ہوا تھا۔ کھولیوں کے قریب ہی ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا جس میں زراعت کے متعلق چند چھوٹے موٹے آلات اور مویشیوں کا سامان پڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ درختوں کے جھنڈ میں رُک گئے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ تاریکی میں حشرات الارض کے سوا کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ عجیب وحشت ناک ماحول تھا، اور نیلم پر واقعی وحشت سی طاری ہو رہی تھی وہ طارق کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور اُس نے طارق کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

چند منٹ بعد دونوں سکھ پیپل کے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چلتے ہوئے تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اُن کے جانے کے بعد وہ لوگ خاموشی سے بیٹھے رہے۔ درختوں کے اُس جھنڈ سے تقریباً سو گز آگے سرحد تھی۔ کھیتوں کے درمیان خاردار تاروں کی ایک باڑ تھی۔ جس کے دوسری طرف پاکستانی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ خاردار باڑ بھی چند سال پہلے بھارتی حکومت نے لگائے تھے۔ اس سے پہلے یہاں سرحد کی نشاندہی کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صرف برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان برجیوں کے دونوں طرف چند فٹ کی جگہ، نومینز لینڈ تھی۔

جب وہ پیپل کے درختوں کے اُس جھنڈ میں پہنچے تو دو بجنے میں اٹھارہ منٹ تھے۔ ٹھیک دو بجے تاریکی میں ایسی آواز سنائی دی، جیسے کچھ لوگ باتیں کرتے ہوئے آ رہے ہوں۔ یہ آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، پھر رفتہ رفتہ قریب آتی چلی گئی۔ اور پھر اچانک ہی ایک جگہ روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ رینجرز کے گشتی سپاہی تھے۔ اُن کی تعداد چار تھی اور وہ درختوں کے جھنڈ سے تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر سرحد کے متوازی، ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ ڈیرے کے سامنے پہنچ کر اُن میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی۔ ٹارچ کی لہراتی ہوئی روشنی ڈیرے کی طرف اُٹھ رہی

تھی۔ گیان سنگھ اور اُن کے ساتھی مویشیوں کی کھرلیوں کے پیچھے دبک گئے۔ چرن سنگھ اور گیان سنگھ کی گرفت رائفلوں پر سخت ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی لہراتی ہوئی روشنی کھرلیوں کے قریب سے گزرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

رینجرز کی گشتی پارٹی آگے نکل چکی تھی۔ اچانک ہی فضا میں ٹیٹرے کی آواز اُبھری۔ بگلے سے ملتا جلتا یہ پرندہ عام طور پر رات کو فضا میں منڈلاتا رہتا ہے۔ لیکن اس وقت ٹیٹرے کی یہ آواز، کھیتوں میں سے سنائی دی تھی۔

''طارق.....!'' چرن سنگھ نے سرگوشی کی۔ ''تم اپنی ساتھی کو لے کر اس پگڈنڈی پر چلے جاؤ۔ تقریباً پچاس گز آگے میرے آدمی تم لوگوں کو مل جائیں گے۔ وہ تمہیں تاروں کی باڑ کے دوسری طرف پہنچا دیں گے۔ جاؤ! دیر نہ کرو۔''

نیلم اور طارق اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے۔ طارق کو اُن دونوں نے بغلگیر ہو کر رُخصت کیا۔ نیلم کے سر پر بھی ہاتھ پھیر کر اُس کو رب راکھا کہا اور وہ دونوں درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈی پر ہو لئے۔

طارق نے نیلم کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ناہموار پگڈنڈی پر وہ بار بار لڑکھڑا رہے تھے۔ نیلم کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ خوف کی وجہ سے یا کچھ زیادہ ہی سردی محسوس کر رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ اُس کا پیر رپٹا..... طارق نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی، مگر اس کے ساتھ خود بھی کھیت میں جا گرا۔ نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ طارق نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ چند گز گئے انہیں چرن سنگھ کے آدمی مل گئے۔

''جلدی کرو! اس عورت کے چیخنے کی آواز، سناٹے میں دُور تک پھیلی ہو گی۔ اگر گشتی پارٹی میں سے کسی نے سن لی ہو گی تو وہ لوگ واپس بھی آ سکتے ہیں۔'' اُن دونوں سکھوں میں سے ایک نے کہا۔

وہ چاروں، کھیتوں میں پگڈنڈی پر دوڑنے لگے۔ ایک جگہ نیلم کا پیر پھر رپٹ گیا۔ اس مرتبہ اس کے ایک پیر میں سے سینڈل اُتر گیا۔ وہ تاریکی میں سینڈل تلاش کرنے لگی، لیکن سینڈل نہیں ملا اور وہ اُس کی تلاش کا ارادہ ترک کر کے طارق کے ساتھ دوڑنے لگی۔ عین اُسی وقت تاریکی میں ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی.....

''ہولڈ اپ.....! کون ہے وہاں؟ رُک جاؤ! ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔''

یہ آواز انڈین رینجرز کے ایک سپاہی کی تھی جو خاصی دُور سے آئی تھی۔ وہ لوگ غالباً نیلم کی

چیخ سن کر واپس مُڑے تھے۔

''سامنے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تاریں کٹی ہوئی ہیں۔ تم لوگ جلدی سے نکل جاؤ۔ ہم انہیں روکتے ہیں۔'' چرن سنگھ کے ایک آدمی نے سرگوشی کی۔

طارق نے نیلم کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگا دی۔ باڑ میں کٹی ہوئی تاروں والا حصہ تلاش کرنے میں اُنہیں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ طارق نے پہلے نیلم کو تاروں میں سے دوسری طرف دھکیلا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کے دوسرے پیر میں سے بھی سینڈل اُتر گیا۔ طارق اُسے دھکیل کر خود تاروں میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فضا، فائر کی آواز سے گونج اُٹھی۔ رینجرز نے شاید اُنہیں دیکھ لیا تھا۔ گولیاں اُن دونوں کے آس پاس سے گزر گئیں۔ طارق کٹی ہوئی تاروں میں سے نکل آیا۔ اُس نے نیلم کا ہاتھ پکڑا اور اندھا دُھند دوڑ لگا دی۔

فائرنگ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہو...... اس کا مطلب تھا کہ چرن سنگھ کے آدمیوں نے رینجرز کو اپنے ساتھ فائرنگ میں اُلجھا لیا تھا۔

وہ دونوں کھیتوں میں تیزی سے دوڑتے رہے، پھر اچانک اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو...... دوسرے ہی لمحے وہ شڑاپ کی آواز کے ساتھ پانی میں گرے۔ دراصل یہ ایک چھوٹی ندی تھی، جسے وہ تاریکی میں نہیں دیکھ سکے تھے۔ وہ دونوں پانی میں تر ہو گئے۔ طارق اُٹھ کر ندی سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ تاروں کی باڑ کی طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ وہ ایک دم نیچے گر گیا۔ نیلم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ طارق نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نیلم اُس سے لپٹ گئی۔

وہ لوگ پاکستانی سرحد میں تقریباً بیس گز اندر آ چکے تھے۔ لیکن بھارتی سپاہیوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ وہ اُنہیں دیکھ کر گولی مار دیتے۔ طارق کے ذہن میں کچھ اور خدشات بھی سر اُبھار رہے تھے۔ بھینی کے زمیندار چودھری برکت کے آدمی انہی کھیتوں میں کسی جگہ اُن کے منتظر تھے۔ اندیشہ تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہ واپس نہ چلے جائیں۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر پاکستانی رینجرز کے جوان اس طرف نہ پہنچ جائیں۔ ایسی صورت میں بھی اُن کا بچنا مشکل تھا۔

وہ دو تین منٹ ندی کے اندر پانی میں بیٹھے رہے، پھر طارق پہلے خود باہر نکلا، پھر نیلم کو پکڑ کر نکالا اور کھیتوں میں ایک طرف چلنے لگا۔ اُن کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا جس سے چلنا بھی دُشوار ہو رہا تھا۔

چند گز آگے دو تین درخت نظر آ رہے تھے۔ اُن کا رُخ انہی درختوں کی طرف تھا۔ اچانک

ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بھینس ڈکرائی ہو۔ آواز دو مرتبہ سنائی دی۔ وہ دونوں اُس آواز کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ دراصل سگنل تھا جس کے بارے میں اُنہیں چرن سنگھ نے بتایا تھا۔ وہ جلد ہی اس جگہ پہنچ گئے، جہاں بھینی کے زمیندار چودھری برکت کے دو آدمی اُن کے منتظر تھے۔ وہ بھی کلاشنکوف رائفلوں سے مسلح تھے۔

طارق اور نیلم اُن کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے۔ سرحد پر فائرنگ کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید پاکستانی رینجرز کی گشتی پارٹی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اور اب دونوں طرف کے رینجرز میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

☆

رات کا باقی حصہ اُنہوں نے بھینی میں چودھری برکت کے گھر پر ہی گزارا۔ صبح ناشتے پر چودھری برکت اُنہیں بتا رہا تھا کہ 65ء میں جب بھارت کی فوج نے چوروں کی طرح پاکستان پر حملہ کیا تھا تو بھینی اور اس کے آس پاس کے دیہاتوں میں رہنے والوں نے پاک رینجرز کی مدد سے حملہ آور بھارتی فوج کو اُس وقت تک روکے رکھا تھا، جب تک پاک فوج کے جوان نہیں پہنچ گئے تھے۔ سرحد پر رہنے والے پاکستانی جیالوں نے بھارتی فوجیوں کے ناپاک قدم اپنی سرزمین پر نہیں پڑنے دیئے تھے اور پاک فوج کے آنے پر تو اُنہوں نے بھارتی فوجیوں کو اُنہیں کی دھرتی پر کئی میل پیچھے دھکیل دیا تھا۔

بھینی سے متصل چند میل کے فاصلے پر جلو کا واقعہ دنیا بھر کی عسکری تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح حملہ آور ہونے والی بھارتی فوج کسی نہ کسی طرح سرحد عبور کر کے جلو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بھارتی فوجیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ صبح کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے پہلے لاہور پر قابض ہو جائیں گے اور لاہور کے جم خانہ میں فتح کا جشن منائیں گے۔ یہ منصوبہ بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف نے بنایا تھا اور اس کی طرف سے بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری، دیگر وزراء اور ہندوستان کی چیدہ چیدہ شخصیات کو لاہور جم خانہ میں جشن فتح کے دعوت نامے بھی جاری کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جلو میں بی آر بی نہر کا کنارہ بھارتی فوجیوں کا قبرستان بن گیا۔ اُنہیں نہر عبور کرنا نصیب نہ ہو سکا۔ پاک فوج کے آنے تک جلو کے شیر دل عوام نے بھارتی حملہ آوروں کو روکے رکھا۔ اور جب پاک فوج کے دستے محاذ پر پہنچے تو جرات اور بہادری کے ایسے ایسے کارنامے دیکھنے میں آئے کہ ایک نئی عسکری تاریخ رقم ہوتی چلی گئی۔ جلو سے چند میل آگے اس بی آر بی نہر کے کنارے میجر عزیز بھٹی نے اپنے مٹھی بھر فوجی جوانوں کے ساتھ بھارت کی کئی ڈویژن فوج کو روکے رکھا۔ میجر عزیز بھٹی

نے وطن کی آن پر اپنی جان قربان کر دی، لیکن دشمن کے ناپاک قدموں کو اپنے وطن کی سرزمین پر نہیں پڑنے دیا۔

چودھری برکت اُنہیں پاکستانی جیالوں کے جرات مندانہ کارناموں کے واقعات سناتا رہا۔ نیلم اور طارق ان باتوں سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ چودھری برکت کا خیال تھا کہ وہ اُنہیں دو تین دن اپنے گاؤں میں روکے گا۔ لیکن طارق جلد سے جلد سری نگر پہنچنا چاہتا تھا۔

بھینی سے لاہور ریلوے سٹیشن تک اگرچہ روٹ نمبر 33 کی ایک بس بھی چلتی تھی۔ چودھری برکت اگر چاہتا تو اُنہیں بس پر بٹھا دیتا۔ لیکن اُس نے خود اُن کے ساتھ لاہور تک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چودھری برکت کے پاس سوزوکی کار کے علاوہ ایک سٹیشن ویگن بھی تھی جو دیکھنے میں اگرچہ پرانی سی نظر آتی تھی۔ لیکن اُس کا انجن بڑا زوردار تھا۔ ناشتے کے بعد وہ اس ویگن پر ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

بھینی سے لکھوڈ ہر تک سڑک کے دائیں بائیں تا حد نگاہ لہلہاتی ہوئی فصلیں نظر آ رہی تھیں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوا طارق بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ آزاد فضا میں سانس لے رہا تھا۔ یہاں اُس کے لئے کوئی خوف نہیں تھا۔

سرینگر تک پہنچنے کے لئے اُن کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ راولپنڈی سے ہوتے ہوئے آزاد کشمیر میں مظفر آباد پہنچتے اور وہاں سے شاہ کوٹ اور وولر بیراج کی طرف سے ہو کر سرینگر کا رُخ کرتے۔ لیکن اس طرح بہت طویل چکر کاٹنا پڑتا۔ اور اس میں کئی دن لگ جاتے۔ دوسرا راستہ سیالکوٹ کا تھا۔ وہاں سے وہ جموں کی طرف نکل سکتے تھے۔ اور طارق نے اُسی راستے کو ترجیح دی تھی۔

ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ تین بجے سے پہلے سیالکوٹ کے لئے کوئی ٹرین نہیں تھی۔ وہ لوگ ریلوے سٹیشن کے عین سامنے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر پہنچ گئے۔ جہاں سے پندرہ منٹ بعد اُنہیں سیالکوٹ کے لئے بس مل گئی۔ چوھری برکت نے اُنہیں بڑی گرمجوشی سے رُخصت کیا تھا۔

سیالکوٹ میں وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رُکے۔ اُسی شام وہ ایک سرحدی گاؤں میں پہنچ گئے۔ رات کے پچھلے پہر وہ سرحد عبور کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ سرحد سے چند میل کے فاصلے پر رن بیر پورا نامی قصبہ تھا۔ اُنہوں نے قصبے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کسی پرانے مندر کے کھنڈر تھے۔ وہ رات بھر اُسی کھنڈر میں بیٹھے رہے۔ آخری پہر سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نیلم بری طرح کانپ رہی تھی۔

...رق نے اگرچہ اپنا کوٹ بھی اُسے پہنا دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ٹھٹھرتی رہی۔ صبح جب ...وپ پھیلنا شروع ہوئی تو اُن کی جان میں جان آئی۔

یہ سارا علاقہ سطح مرتفع پر مشتمل تھا جو دوسری طرف ہمالیہ کے سب سے چھوٹے سلسلہ کوہ ...شیوالیک رینج" سے جا ملتا تھا۔ دُھوپ اچھی طرح پھیلنے کے بعد وہ کھنڈر سے نکلے اور اُونچے ...نیچے راستوں سے ہوتے ہوئے قصبے میں داخل ہو گئے۔ ایک حلوائی کی چھوٹی سی دُکان سے ...نہوں نے کچوری وغیرہ سے ناشتہ کیا اور بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ یہاں آدھے گھنٹے بعد ...نہیں جموں جانے والی بس مل گئی۔

جموں کی زیادہ آبادی ڈوگروں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ سکھ اور مسلمان بھی آباد تھے لیکن ...ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اُنیسویں صدی کے اوائل میں یہاں ڈوگرا مہاراجہ گلاب سنگھ حکمران ...تھا۔ اُس نے چند ہزار روپوں کے عوض کشمیر کا سودا کیا تھا۔ اس سودے کے ساتھ ہی وادی میں ...رہنے والے مسلمانوں کی قسمت پر بدقسمتی کی مُہر لگ گئی تھی۔

کشمیر کی تاریخ میں گلاب سنگھ کے بعد جو نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے، وہ مہاراجہ ہری سنگھ کا ...ہے۔ 1947ء میں جب برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تو اس کا بنیادی فارمولہ یہ تھا کہ مسلمان ...اکثریت والے علاقے پاکستان میں شامل کر دیئے جائیں۔ اس بنیادی فارمولے کے تحت کشمیر کو ...بھی پاکستان کا حصہ بننا تھا۔ کیونکہ کشمیر مذہبی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے پاکستان ہی کا حصہ ہے۔ ...لیکن اُس وقت کے کشمیری حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے تقسیم ہند کے فارمولے اور ریاست کے ...مسلمانوں کی خواہشات کے برعکس کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا۔ لیکن اس الحاق کو کشمیری ...مسلمانوں نے تسلیم نہیں کیا اور مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف بغاوت کر کے 33 ہزار مربع میل کا ...علاقہ آزاد کرا لیا۔ کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی جاری رہی۔ کشمیری مسلمانوں کی مسلسل ...کامیابیوں سے گھبرا کر بھارت ہی مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے گیا تھا۔ اقوام متحدہ نے 13 ...اگست 1948ء اور پھر 5 جنوری 1949ء کو دو قراردادیں منظور کیں۔ جن میں کشمیر کو متنازعہ علاقہ ...قرار دیا گیا اور دونوں قراردادوں میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کیا گیا۔ 5 جنوری ...1949ء کی قرارداد کے جزو اَلف میں کہا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر کے بھارت یا پاکستان سے ...الحاق کا مسئلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے جمہوری طریقے سے طے پائے گا۔

اقوام متحدہ کی قراردادیں ہمیشہ سے ہی مسئلہ کشمیر کی بنیاد رہی ہیں۔ کیونکہ بھارت پوری دنیا ...کے سامنے ان قراردادوں کو تسلیم کر چکا ہے۔ ان قراردادوں کی وجہ سے کشمیریوں کی سیاسی اور ...عسکری جدوجہد کو کوئی بھی ملک دہشت گردی قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ کشمبری مسلمان اپنے بین

الاقوامی تسلیم شدہ حق کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر بھارت کے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ کشمیری مسلمان بھارت کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں اور ہزاروں مجاہدین مسلح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ کشمیری مسلمانوں میں ایک فیصد افراد بھی ایسے نہیں ہیں جو بھارت کے حامی ہوں۔ اس لئے بھارت اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کشمیر میں رائے شماری ہوئی تو کشمیر، پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کشمیری مسلمانوں کو حق خودارادیت دینے کو تیار نہیں۔ اور طاقت کے بل بوتے پر اس خطے پر قابض ہے۔ کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ کشمیر اُن کا ہے اور ایک نہ ایک دن بھارت کے چنگل سے آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔

بھارت کی ایک پالیسی یہ بھی تھی کہ کشمیر کے مسلمانوں پر اس قدر ظلم توڑے جائیں کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر ریاست سے بھاگ جائیں۔ اور اُن کی جگہ ہندوؤں کو لا کر آباد کیا جائے۔ تاکہ اگر کبھی رائے شماری کرائی بھی جائے تو ہندوؤں کی اکثریت ثابت ہو جائے۔ یہاں آباد ہونے والے ہندوؤں کے لئے اگرچہ بہت سی مراعات کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن بہت کم ہندو خاندان یہاں آباد ہونے کو تیار ہوتے تھے۔ ان ہندوؤں کو بھارتی حکومت کی طرف سے دیگر مراعات کے علاوہ اسلحہ سے بھی مکمل طور پر لیس کیا جاتا تھا۔

یوں تو پوری وادی میں مسلمانوں کو بربریت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ لیکن جموں میں رہنے والے مسلمان، بھارتی ستم ریزیوں کا کچھ زیادہ ہی شکار رہتے تھے۔

طارق ساڑھے چار سال پہلے جموں ہی کے راستے سلیم کے ساتھ بھارت گیا تھا۔ لیکن آج صورتِ حال پہلے سے کہیں بدتر ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے کئی گھر اُجڑ چکے تھے۔ اُن لوگوں کو یا تو ختم کر دیا گیا تھا، یا اپنے گھر بار چھوڑ کر پاکستانی سرحد کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

طارق کو شیراز بابا اور روشا یاد آ گئی۔ وہ رات اُنہوں نے جموں کی نواحی بستی میں واقع ایک مسلمان گھر میں گزاری۔ یہاں اُنہوں نے اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ وہ آج ہی بس کے ذریعے کٹھوعہ سے آئے تھے۔ اُن کا ٹرنک، بس کی چھت پر رکھا ہوا تھا۔ لیکن جب وہ جموں کے لاری اڈے پر بس سے اُترے تو ٹرنک غائب تھا۔ راستے میں اُترنے والا کوئی مسافر غلطی سے یا جان بوجھ کر اُن کا ٹرنک لے گیا تھا جس میں اُن کے صرف کپڑے وغیرہ تھے۔

جموں میں مسلمانوں گھروں کی عام طور پر تلاشی ہوتی رہتی تھی۔ پولیس یا بھارتی فوجی کسی نہ کسی بہانے زبردستی مسلمانوں کے گھروں میں گھس جاتے۔ لیکن غنیمت تھا کہ اُن کی رات خیریت سے گزر گئی۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ اودھم پور جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔

ں نے ٹکٹ اودھم پور کے لئے تھے، لیکن جموں شہر سے گیارہ میل کا فاصلہ ہوتے ہی جب بس چھوٹے سے سٹاپ پر رُکی تو طارق، نیلم کو ساتھ لے کر بس سے اُتر گیا۔ اس بس سٹاپ سے پور جانے والا ایک گورکھا کسان بس میں سوار ہوا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں سائبان کے نیچے بان کی چارپائیاں بچھی تھیں۔ یہ ایک ہندو کا ہوٹل تھا جہاں صرف دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں انجیروں کے باغ تھے۔ دائیں طرف ایک کچا راستہ نظر آ رہا تھا جو باغ سے ہوتا ہوا پہاڑوں طرف چلا گیا تھا۔ دُور پہاڑوں پر چنار کے اُونچے درختوں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی۔

بس چلے جانے کے بعد طارق اور نیلم چند منٹ وہاں کھڑے رہے، پھر طارق نے نیلم کا ہاتھ پکڑا اور سڑک عبور کر کے انجیروں کے باغ میں کچے راستے پر ہو لیا۔

"کہاں جا رہے ہو.....؟ تم نے ٹکٹ تو اودھم پور کے لئے تھے۔" نیلم نے پوچھا۔

"شاید تم بھول گئی ہو کہ میں نے تمہیں شیراز بابا کے بارے میں بتایا تھا۔" طارق نے جواب دیا۔ "دہلی سے ہماری روانگی سے ایک دن پہلے شیراز بابا کو یہ اطلاع بھجوا دی گئی تھی کہ ہم روانہ ہو رہے ہیں۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اگرچہ سیدھا سرینگر جانا تھا۔ مگر گڑبڑ کی وجہ سے ہمیں پروگرام تبدیل کرنا پڑا۔ شیراز بابا کو بھی ہمارے بارے میں اطلاع مل چکی ہو گی۔ ہمیں اُس سے پروگرام کا پتہ چل جائے گا۔"

"تم نے شیراز بابا کی پوتی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ کیا نام تھا اُس کا....."

"روشا۔" طارق نے کہا۔ "بہت بہادر لڑکی ہے۔ میں اُس کی جرات و بے باکی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔"

"چلو اس بہانے میں بھی اُس سے مل لوں گی۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ انجیروں کے باغ سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ آگے اُونچے نیچے ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ دھوپ میں چٹانیں تپ رہی تھیں۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ اُونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے نیلم بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ان سنگلاخ چٹانوں پر کوئی ایسا درخت بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس کے سائے میں وہ کچھ دیر کے لئے رُک جاتے۔

"کتنی دُور جانا ہے طارق.....؟ مجھ سے تو اب بالکل نہیں چلا جا رہا۔" نیلم نے ایک جگہ رُک کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"تقریباً ڈیڑھ کوس۔ اُس چٹان کے پیچھے ہے شیراز بابا کی بستی ہے۔" طارق نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ چٹان کے نیلے پتھر، دُھوپ میں چمک رہے تھے۔

وہ کچھ دیر رُکنے کے بعد پھر چلنے لگے۔ ایک ٹیلے پر سے گھوم کر طارق رُک گیا۔ اُس جگہ راستے کے بائیں جانب ایک بہت گہرا کھڈ نظر آ رہا تھا۔ طارق اُس کھڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ کھڈ تھا جہاں اُس نے بھارتی فوجیوں کو جیپ سمیت جہنم واصل کیا تھا۔ اور پھر وہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، جیپ پر سوار بھارتی فوجی اُس کی تلاش میں شیراز بابا کی بستی میں آئے تھے۔ طارق مویشیوں والے کمرے میں بھوسے کے ڈھیر میں چھپ گیا تھا۔ اور جب روشا کی چیخ سن کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو اُس کا خون کھول اُٹھا تھا۔ ایک بھارتی فوجی، روشا کو کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور روشا چیختے ہوئے اُس کے سینے پر گھونسے برسا رہی تھی۔ طارق نے نہ صرف روشا کو بھارتی فوجیوں کی دست درازی سے بچایا تھا، بلکہ اُنہی کے ہتھیاروں سے اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اور پھر اُن کی لاشیں جیپ میں ڈال کر جیپ کو اُس گہرے کھڈ میں لڑھکا دیا تھا۔

روشا کا معصوم، صبیح و ملیح چہرہ، طارق کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ روشا کے تصور سے وہ اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ اُس کے سینے میں گدگدی کا احساس پھیلتا چلا گیا۔

وہ اُس چٹان کے قریب پہنچ گئے، جس کے دوسری طرف نشیب میں شیراز بابا کی چھوٹی سی بستی تھی۔ چٹان کے اُوپر سے گھوم کر وہ ایک بار پھر رُک گیا۔ دوسری طرف تا حد نگاہ سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ وادی کے نشیب میں درختوں کے جھنڈ کے قریب وہ چھوٹی سی بستی تھی۔ لیکن اُس بستی پر نگاہ پڑتے ہی اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... یہ بستی صرف چند گھروں پر مشتمل تھی۔ اور بیشتر مکان جلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جبکہ بعض مکانوں کی جگہ ملبے کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ ''نیلم.....! جلدی چلو! وہ بستی.....'' وہ جملہ مکمل کئے بغیر نیلم کا ہاتھ پکڑ کر نشیب کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی طرف دوڑا۔

نیلم بھی بستی کے مکانوں کو دیکھ چکی تھی، اس لئے اُسے طارق سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ طارق کے ساتھ دوڑتی رہی۔ کئی مرتبہ وہ گرتے گرتے بچی۔ اُس نے کئی مرتبہ طارق سے ہاتھ چھڑانا چاہا، مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ طارق اُسے ڈھلان پر گھسیٹتا لئے جا رہا تھا۔

چند منٹ بعد ہی وہ بستی کے سامنے پہنچ گئے۔ طارق اس طرح بستی کے جلے ہوئے مکانوں اور ملبے کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ پلکیں جھپکنا بھی بھول گیا تھا۔ نظریں جیسے پتھرا گئی تھیں..... نیلم اُس کا بازو پکڑے اُس کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

''یہ..... یہ سب کیا ہوا طارق.....؟'' نیلم کے ہونٹوں سے سرگوشی سی نکلی۔

طارق جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ نیلم سے اپنا ہاتھ چھڑا کر شیراز بابا کے مکان کی طرف دوڑا۔ ں جلا ہوا تھا۔ تینوں کمروں کی چھتیں گر گئی تھیں۔ ایک ایک چیز جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ کچھ بھی بچا تھا۔ اس کے ساتھ تین مکان اور جلے ہوئے تھے۔ جبکہ باقی دو مکان اس طرح ملبے کا نے ہوئے تھے جیسے اُن پر بلڈوزر چلا دیا گیا ہو۔ جلے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر طارق کو یہ زہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہ افسوس ناک واقعہ چند روز پہلے ہی پیش آیا تھا۔ جلی لکڑی کی بو ابھی تک محسوس ہو رہی تھی۔ طارق، بستی کے تمام مکانوں میں گھومتا رہا۔ اُسے ہوئے مکانوں میں کچھ سوختہ ڈھانچے بھی نظر آئے۔ طارق کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ ی بھیڑیوں نے اُن سب کو زندہ جلا دیا تھا۔ طارق کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ ''مجھے افسوس ہے طارق.....!'' نیلم اُسے بازو سے پکڑ کر درختوں کے جھنڈ میں لے گئی۔

''افسوس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟'' طارق نے جواب دیا۔ ''پوری وادی میں ظلم و بربریت کی یہ داستانیں دُہرائی جا رہی ہیں۔ اور ہم صرف افسوس ہی کر سکتے ہیں۔''

درختوں کے جھنڈ میں ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اُس پر بیٹھ گئے۔ ں جلے ہوئے مکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ اس بستی پر حملہ کرنے ے ہندو بھیڑیوں نے روشا کا کیا حشر کیا ہوگا؟

انہیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ نیلم نے واپس چلنے کے لئے کہا تھا۔ طارق اس طرح بیٹھا رہا تھا جیسے اُس نے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ آدھا گھنٹہ مزید گزر ۔ اور پھر اچانک نیلم ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر چونک گئی..... وہ بوڑھا آدمی تھا۔ داڑھی اور لباس سے وہ کوئی مسلمان ہی لگتا تھا۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ نیلم نے طارق کے ھے کو جھنجھوڑ کر اُس آدمی کی طرف متوجہ کیا تو طارق ایک جھٹکے سے چارپائی سے اُٹھ گیا اور تیز دموں سے چلتا ہوا اُس بوڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بوڑھا بھی شیراز بابا کی اس بستی کا نے والا تھا۔ ساڑھے چار سال قبل دہلی جانے سے پہلے طارق جب ایک دو دن اُس بستی میں ہا تو اس بوڑھے سے بھی طارق کی ملاقات ہوئی تھی۔

''شمس بابا..... یہ کیا ہو گیا؟ یہ سب کچھ کیسے ہوا.....؟ شیراز بابا اور روشا.....؟''

''میرے ساتھ آؤ، میرے جھونپڑے میں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' بوڑھے نے ''میں نے تم لوگوں کو چٹان پر سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تم لوگوں نے شاید کچھ کھایا بھی ہے آؤ..... میرے جھونپڑے میں چلو! آؤ بیٹی۔'' اُس نے نیلم کو اشارہ کیا۔

وہ لوگ ندی کی طرف چل پڑے۔ ندی کے قریب ہی ایک ٹیلے کے پیچھے گھاس پھونس کا

ایک جھونپڑا تھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر عورت اور سات آٹھ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ اُس عورت کو بھی طارق نے پہچان لیا۔ یہ شمس بابا کی بیوی تھی۔ جھونپڑے سے کچھ آگے بھیڑیں چر رہی تھیں۔

''بھاگ بھری! ان کو کچھ کھانے کو دے۔ بھوکے بیٹھے تھے وہاں۔'' شمس بابا نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بھیڑ کے بھنے ہوئے گوشت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بھاگ بھری نے وہی اُن کے سامنے رکھ دیا۔ طارق کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر بوڑھے کے اصرار پر اُس نے گوشت کے چند ٹکڑے کھا لئے۔

''یہ سب کچھ کیسے ہوا شمس بابا......؟'' طارق نے پوچھا۔

''یہ آج سے پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔'' شمس بابا نے کہا۔ ''لبریشن فرنٹ کے چار مجاہدین یہاں آئے تھے۔ دوسرے دن ڈوڈہ جانے والے تھے۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ مختلف علاقوں سے مجاہدین ڈوڈہ کے قریب جمع ہو رہے تھے جہاں وہ بھارتی فوج کے خلاف ایک بڑی کارروائی کرنے والے تھے۔ وہ مجاہدین دوپہر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اس وقت میں اپنی بیوی اور پوتے کے ساتھ جموں جانے والا تھا۔ دوسرے دن جب میں واپس پہنچا تو یہ بستی اس حالت میں تھی۔ جلے ہوئے مکانوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ مجھے کئی لاشیں جلی ہوئی نظر آئیں۔ وہ رات ہم نے یہیں بیٹھ کر روتے ہوئے گزاری۔ میرا خیال تھا کہ بستی کا کوئی آدمی اگر جان بچا کر بھاگ گیا تھا تو شاید واپس آ جائے۔ لیکن کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ سب کو ختم کر دیا گیا تھا۔ تین لاشیں مجھے یہاں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اُن کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔ میں نے اپنی بیوی کی مدد سے اُنہیں دفن کر دیا۔ اُس جگہ اُن کی قبریں ہیں۔'' شمس بابا نے ندی کی طرف اشارہ کیا۔

''دوسرے دن سڑک کے ساتھ بنے ہوئے ہوٹل والا ہندو، بسنت رام یہاں آیا۔ اُس نے بتایا کہ فوجی، روشا اور بستی کی دو اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اُنہوں نے فرنٹ کے ایک مجاہد کو بھی پکڑ لیا تھا، جبکہ ایک مارا گیا تھا۔ اور دو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مجاہدین کو پناہ دینے کے جرم میں اس بستی کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا اور اس کے باسیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا یا زندہ جلا دیا گیا۔''

''وہ فوجی اُس مجاہد اور روشا وغیرہ کو کہاں لے گئے تھے......؟'' طارق نے پوچھا۔

''کچھ پتہ نہیں۔'' بوڑھے نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ طارق کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔

☆

ورج، مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اچانک فضا میں گرر گرر کی آواز سنائی دینے لگی...... یہ بھی بہت دُور سے آئی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی قریب سے۔ طارق کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ گاڑی کی آواز تھی۔ گاڑی کی وہ آواز سن کر بوڑھے کی پیشانی پر بھی سلوٹیں اُبھر آئیں۔ وہ ہ سے اُٹھ کر دوڑتا ہوا ٹیلے پر چڑھ گیا اور پھر بڑی تیزی سے واپس بھی آ گیا۔ اُس کے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔

فوجی جیپ ہے...... اسی طرف آ رہی ہے۔ تم لوگ چھپ جاؤ...... میرے ساتھ آؤ...... کرو!'' بوڑھے نے کہا۔

دونوں اُٹھ کر بوڑھے کے ساتھ دوڑ پڑے۔ ندی کے کنارے ایک چٹان میں ایک غار سا ہا تھا۔ غار کے اندر پانی بھرا ہوا تھا۔ اُس غار کی طوالت کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ لیکن اس نی کی سطح سے تقریباً دو فٹ اُوپر ایک چٹانی شیلف سا بنا ہوا تھا جو اندر دُور تک چلا گیا تھا۔ پانی میں داخل ہو کر اُس شیلف پر چڑھ گیا۔ اور پھر اُس نے نیلم کو بھی اُوپر کھینچ لیا۔ بوڑھا ھونپڑے کی طرف واپس چلا گیا۔

رہ منٹ گزر گئے۔ جیپ کے انجن کی گرر گرر کی آواز سنائی دیتی رہی، پھر یہ آواز بند ہو جیپ غالباً جھونپڑے کے قریب آ کر رُکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد پہلے چیخوں کی آواز اُبھری، نگ کی آواز سنائی دی۔ چیخوں کی آواز، فائرنگ کی آواز میں دب کر رہ گئی۔

رق نے نیلم کو شیلف پر قدرے پیچھے دھکیل دیا اور خود کنارے پر سینے کے بل لیٹ گیا۔ دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بھاری قدموں کی آواز ، جو چٹان کے دہانے پر آ کر رُک گئی......

ہاں......! تم اس غار کے اندر جا کر دیکھو! اس غار کے سوا چھپنے کی اور کوئی جگہ نہیں ہے۔'' ی آواز سنائی دی۔

لیکن اس غار میں تو پانی بھرا ہوا ہے۔'' دوسری آواز سنائی دی۔ وہ غالباً پران تھا۔

زیادہ گہرا نہیں ہے۔ دس قدم اندر تک جا کر دیکھ لو! اگر وہ قابو میں آ گئے تو تمہارے

وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تم جانتے ہو نا! کہ ہر کشمیری دہشت گرد کی گرفتاری پر حکومت ہند کی طرف سے انعام مقرر ہے۔ یہ انعام تم ہی کو ملے گا۔ اندر جاؤ! یہ ٹارچ لے لو۔'' پہلی آواز نے کہا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی اور پھر شڑپ شڑپ کی آواز سنائی دینے لگی۔ طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پران، غار میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ شیلف کے کنارے سے کھسک کر نیلم کے قریب پہنچ گیا۔ نیلم، خوف کے باعث ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔ اچانک غار، فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھا..... طارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پران نے غالباً حفظ ماتقدم کے طور پر غار میں سب مشین گن کا برسٹ مارا تھا۔ اس کے ساتھ ہی غار میں مدھم سی روشنی پھیل گئی اور شڑپ شڑپ کی آواز، دوبارہ سنائی دینے لگی..... پران آگے بڑھ رہا تھا..... طارق ایک بار پھر بڑی احتیاط سے سینے کے بل رینگتا ہوا شیلف کے کنارے پر پہنچ گیا۔ پران اُس سے دو قدم آگے نکل چکا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سب مشین گن تان رکھی تھی اور ٹارچ، بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اُس جگہ پانی، پنڈلیوں سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔

طارق اپنی جگہ سے آگے سرک گیا۔ پران اُس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اور پھر طارق نے اچانک ہی پران پر چھلانگ لگا دی..... اُس کا ایک ہاتھ پران کے منہ پر اور دوسرا سب مشین گن پر پڑا تھا۔ پران کے لئے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو گیا۔ طارق نے اُس کے ہاتھ سے سب مشین گن چھین کر چٹانی شیلف پر ڈال دی اور پران کی گردن دبوچ کر اُسے نیچے گرا لیا۔ پران کا سر، پانی میں ڈوب گیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ مگر طارق نے اُسے اُس وقت تک نہیں چھوڑا، جب تک اُس کی مزاحمت ختم نہیں ہو گئی۔

پران کو پانی میں چھوڑ کر طارق نے شیلف پر سے سب مشین گن اُٹھا لی اور غار کے دہانے کی طرف بڑھنے لگا۔ غار میں تاریکی تھی۔ مگر باہر ہلکی سی روشنی تھی۔ باہر والے اُسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مگر وہ باہر والوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تین آدمی تھے جو غار سے چند گز دُور کھڑے تھے۔ دو فوجی تھے، جنہوں نے سب مشین گنیں سنبھال رکھی تھیں۔ اور تیسرا دھوتی کرتے میں تھا۔ کرتے پر اُس نے نیلے رنگ کا لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ طارق نے اُسے پہچان لیا۔ وہ سڑک کے کنارے پر واقع اُس چھوٹے سے ہوٹل کا ہندو مالک تھا، جہاں صبح طارق اور نیلم، بس سے اُترے تھے۔ طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ فوجیوں کو یہاں لانے والا وہی تھا۔ طارق چند قدم اور آگے آ گیا۔ اب وہ تینوں اُس کی زد میں تھے۔ اُس نے سب مشین گن سیدھی کی اور ٹریگر کھینچ لیا..... دونوں فوجیوں اور دھوتی والے ہندو کی کھوپڑیاں اُڑ گئیں..... وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھے

گئے۔ طارق، تیزی سے غار سے باہر آ گیا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا، اور کوئی نہیں تھا۔ نے نیلم کو آواز دے کر بلا لیا۔

جب وہ جھونپڑے کے قریب پہنچے تو نیلم کے حلق سے بے اختیار خوف ناک چیخ نکل گئی..... ونپڑے کے سامنے بوڑھے شمس بابا، اُس کی بیوی بھاگ بھری اور پوتے کی خون میں لت پت یں پڑی تھیں۔ طارق پر بھی سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اُن تینوں نے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں ن بھارتی فوجیوں کو اُن کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

طارق کو جھونپڑے کے پچھلی طرف سے ایک کدال مل گئی۔ اُس نے ندی کے کنارے ے نرم جگہ پر زمین کھودنا شروع کر دی۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ خاصا گہرا گڑھا کھود چکا اُس نے نیلم کی مدد سے شمس بابا، بھاگ بھری اور اُن کے پوتے کی لاش، گڑھے میں ڈال کر ردی۔ وہ، اُن کے لئے یہی کر سکتے تھے۔

انہیں دفنانے کے بعد طارق، غار کے سامنے بھارتی فوجیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس دونوں فوجیوں کی وردیاں اُتار لیں اور اُن کی برہنہ لاشیں وہیں چھوڑ کر جھونپڑے کے پاس آ حیرت انگیز طور پر وردیوں پر خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا۔ اُس نے ایک وردی نیلم کی طرف ی۔

''جھونپڑے میں جا کر یہ وردی پہن لو! ہم تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس فوجی جیپ یادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کی کوشش کریں گے۔''

یلم اُس کا مطلب سمجھ گئی۔ اُس نے جھونپڑے میں گھس کر اپنے لباس کے اُوپر ہی وہ فوجی اس طرح پہنی کہ اُس کا لباس تقریباً چھپ کر رہ گیا۔ یونیفارم پر فوجی جیکٹ کی وجہ سے کے سینے کے اُبھار بھی کسی حد تک دب گئے تھے۔ بالوں کو سمیٹ کر اُس نے ٹوپی میں چھپا ارق بھی اس دوران آڑ میں ہو کر دوسرے فوجی کی وردی پہن چکا تھا۔ اُس نے بھی وردی باس کے اُوپر ہی پہنی تھی۔ وہ تیار ہو کر جیپ میں سوار ہو گئے۔

کیا یہ لاشیں یہیں پڑی رہیں گی؟'' نیلم نے پوچھا۔

ہاں..... انہیں کتوں اور بھیڑیوں کی خوراک بننے دو!'' طارق نے سٹیئرنگ کے سامنے وئے کہا۔ اُس نے ڈیش بورڈ کے خانے میں ہاتھ ڈال کر کچھ کاغذات نکال لئے اور ہیڈ ٹن کر کے نیچے اُتر آیا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اُس نے کاغذات کا جائزہ لیا۔ یہ ایک تھی۔ جس سے پتہ چلا تھا کہ یہ پٹرولنگ جیپ تھی جو جموں سے اودھم پور کے درمیان تی رہتی تھی۔ اُس جیپ کا تعلق جموں کے ایک فوجی یونٹ سے تھا۔

جن فوجیوں کی وردیاں اُنہوں نے پہنی تھیں، اُن کی جیبوں میں اُن کی پاس بکس بھی تھیں۔ اُس نے دونوں پاس بکس کا جائزہ بھی لے لیا۔ پھر اُس نے سٹیئرنگ کے سامنے انجن سٹارٹ کر دیا۔ نیلم نے دونوں فوجیوں کی سب مشین گنیں بھی اُٹھا کر جیپ میں رکھ لی

پہاڑیوں سے نکل کر وہ پکی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن طارق نے سڑک پر لئے انجیروں کے باغ والا راستہ اختیار کرنے کی بجائے جیپ کو ایک اور کچے راستے پر اس طرح چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں میں ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد جب وہ پ پر پہنچے تو ہندو کے اس ہوٹل سے کئی میل دُور نکل چکے تھے۔ سڑک پر پہنچتے ہی طارق نے رُخ اودھم پور کی طرف موڑ دیا۔

اودھم پور تک راستے میں اُنہیں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ شہر سے تقریباً دو میل طارق نے جیپ روک لی۔ آگے ایک چیک پوسٹ تھی اور طارق جانتا تھا کہ اس چیک پو بڑی سخت چیکنگ ہوتی تھی۔ وہ اگرچہ فوجی جیپ میں تھے اور فوجی وردی میں تھے۔ لیکن معمولی سی بات اُنہیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ طارق دونوں ہاتھ سٹیئرنگ پ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یکایک اُس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور وہ گہری نظروں کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو.....؟'' نیلم نے پوچھا۔

''کپڑے اُتار دو.....!'' طارق بولا۔

''کک.....کیا بک رہے ہو.....؟'' نیلم بدحواس ہو گئی۔

''مم.....میرا مطلب ہے، یہ فوجی وردی اُتار دو! چیک پوسٹ سے گزرنے کی ایک میرے ذہن میں آئی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' طارق نے کہا۔

نیلم پوری طرح اُس کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ لیکن اُس نے بہرحال! طارق کی ہد عمل کرتے ہوئے فوجی وردی اُتار دی۔ وردی کے نیچے اُس کا اپنا لباس موجود تھا۔ طار فوجی وردی جیپ کی سیٹ کے نیچے چھپا دی اور ایک بار پھر نیلم کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب کیا دیکھ رہے ہو.....کیا میرے یہ کپڑے بھی اُتروانا چاہتے ہو؟'' نیلم نے گھورا۔

''ایسی ہی بات ہے.....اگر تم خود کپڑے نہیں اُتارو گی تو یہ کام مجبوراً مجھے خود کرنا پڑے طارق بولا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا.....؟'' نیلم غرائی۔

''یہی سمجھ لو!'' طارق کہتے ہوئے اچانک ہی نیلم پر جھپٹ پڑا۔

نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر طارق جیسے جنون سا طاری ہو چکا تھا۔ وہ نیلم کا لباس نوچ رہا تھا۔ نیلم نے اُسے پیچھے دھکا دینے کی کوشش کی۔ طارق کا ہاتھ اُس کے گریبان پر تھا۔ ایک زوردار جھٹکا لگنے سے نیلم کی قمیض سامنے سے پھٹ گئی.....اور پھر دوسرے ہی لمحے نیلم کا ایک کندھا بھی برہنہ ہو گیا۔ نیلم اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اُس نے طارق کا منہ نوچ لیا۔ اُس کے تیز ناخنوں نے طارق کے چہرے پر کئی خراشیں ڈال دیں۔ جن سے خون رِسنے لگا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں نیلم کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں بھی نکل رہی تھیں۔ اس وقت اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ شاید طارق کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ دہلی سے روانہ ہونے کے بعد سے ایسے کئی مواقع آئے تھے، جب طارق اگر چاہتا تو نہایت آسانی سے اپنی ہوس کی پیاس بجھا سکتا تھا۔ دو تین مواقع تو ایسے بھی آئے تھے کہ وہ ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ لیکن طارق نے کبھی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت تو شاید طارق کا دماغ ہی خراب ہو گیا تھا۔

اور پھر یکایک طارق نے اُسے چھوڑ دیا۔ نیلم نے جیپ سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن طارق نے اُسے پکڑ لیا۔

''آرام سے بیٹھی رہو! ہم آگے چل رہے ہیں۔'' طارق کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔

نیلم نے ایک بار پھر چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ طارق کا انداز ایسا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''یہ کیا حرکت تھی.....؟ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔'' نیلم نے اُسے گھورا اور پھٹی ہوئی قمیض سمیٹ کر اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہ بہت ضروری تھا۔'' طارق، چہرے پر خراشوں سے رِستا ہوا خون پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو سکیم سوچی ہے، اس کے لئے یہ بہت ضروری تھا۔ میرے کہنے پر تم اپنے کپڑے تو اُتار دیتیں مگر یہ سب کچھ نہ ہوتا۔'' اُس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

''سکیم.....کیسی سکیم.....؟'' نیلم نے اُسے گھورا۔

طارق چند لمحے خاموش رہا، پھر اُسے اپنی سکیم سمجھانے لگا۔ نیلم کے ہونٹوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک رسّی پڑی ہوئی تھی۔ طارق نے وہ رسّی اُٹھالی نیلم کے دونوں ہاتھ ڈیش بورڈ کے ساتھ لگے ہوئے ایک پائپ کے ساتھ باندھ دیئے۔ ایک

انچ قطر کا یہ پائپ نجانے کس مقصد سے لگایا گیا تھا؟ لیکن اس وقت طارق کے کام آ گیا تھا۔ نیلم، سیٹ پر اکڑوں سی بیٹھی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ، پائپ سے بندھے ہوئے تھے۔ اُس کا سینہ اور کندھا برہنہ ہو رہا تھا لیکن طارق نے اُس کی طرف دیکھا تک نہیں اور سیدھا ہو کر بڑھے ہوئے انجن سٹارٹ کر دیا.....

چیک پوسٹ کی روشنیاں دُور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ طارق نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ عارضی چیک پوسٹ تھی۔ سڑک کے کنارے دو خیمے لگے ہوئے تھے۔ ایک آہنی زنجیر لگا کر راستہ بند کر دی گئی تھی۔ دو بھارتی فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیریئر قریب کھڑے تھے۔ بیریئر ذرا ہٹ کر ایک مشین گن نصب تھی۔ اُس پر بھی ایک چاق و چوبند فوجی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس چیک پوسٹ پر روشنی کے لئے ایک پورٹیبل جنریٹر استعمال کیا جا رہا تھا جس کے چلنے کی آواز خاصی فضا میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ طارق نے بیریئر کے قریب جیپ روک لی۔ ایک فوجی جیپ کے قریب آ گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ وہ جیپ کی سیٹ پر بندھی ہوئی نیلم کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ پھر اُس نے طارق کی طرف دیکھا۔ اُس کے جسم پر سیکنڈ لیفٹیننٹ کی وردی دیکھ کر اُس کا ایک ہاتھ بے اختیار سلیوٹ کے لئے اُٹھ گیا۔

''اس چیک پوسٹ کا انچارج کون ہے.....؟'' طارق نے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

''سیکنڈ لیفٹیننٹ بھوج کمار..... وہ اس وقت اپنے خیمے میں ہیں سر! لیکن آپ کے چہرے پر خون..... کیا آپ زخمی ہیں سر.....؟'' فوجی نے کہا۔

''چہرے پر معمولی سی خراشیں ہیں۔'' طارق نے جیپ سے اُترتے ہوئے جواب دیا۔ ''اپنے آفیسر کے پاس لے چلو!'' اُس نے نیلم کو بھی کھول کر نیچے اُتار لیا تھا۔ بلبوں کی تیز روشنی میں نیلم کے جسم کے برہنہ حصے کندن کی طرح چمک رہے تھے۔ آس پاس کھڑے ہوئے فوجیوں کی بھوکی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ طارق، نیلم کو دھکے دیتا ہوا اُس خیمے کی طرف لے گیا جس کی طرف فوجی نے اشارہ کیا تھا۔

اُس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ چیک پوسٹ پر متعین فوجی اُس جیپ کو دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ مورچے میں مشین گن پر بیٹھا ہوا فوجی بھی اُٹھ کر کسی طرف چلا گیا تھا، جبکہ دوسرے فوجیوں نے بھی اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکا لی تھیں یا ایک طرف رکھ دی تھیں۔ خیمے تک پہنچتے ہوئے طارق صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ جب وہ خیمے میں داخل ہوا تو چیک پوسٹ کا انچارج اپنے دو جونیئر ماتحتوں کے ساتھ بیٹھا شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔ طارق اور اُس کے ساتھ ایک نیم برہنہ عورت کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔

''میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کرن سنگھ ہوں۔'' طارق اُسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر بول پڑا۔ ''میرا تعلق جموں کی ڈوگرہ یونٹ سے ہے۔ میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ پٹرولنگ پر تھا۔ ہم راستہ بھٹک گئے۔ یہاں سے چند میل دُور اچانک ہی کشمیری دہشت گردوں کے ایک گروہ نے ہم پر حملہ کر دیا جس سے میرے دونوں ماتحت ہلاک ہو گئے۔ حملہ آور دہشت گرد اگرچہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر اُن کی یہ ساتھی میرے ہاتھ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے اسے قابو کیا ہے۔ میرے لئے جموں واپس پہنچنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں قیدی کو لے کر یہاں آ گیا ہوں۔''

''بہت اچھا کیا تم نے لیفٹیننٹ کرن سنگھ!'' بھوج کمار نے کہا۔ نیلم کو نیم برہنہ حالت میں دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک اُبھر آئی تھی۔ ''اس جیسے قیدی کی تو ہمیں شدید ضرورت تھی۔'' اُس نے آگے بڑھ کر نیلم کو دونوں بانہوں سے پکڑ لیا۔ اُس کی ہوس بھری نظریں نیلم کے جسم کے برہنہ حصوں پر رینگ رہی تھیں۔ ''بہت جاندار چیز لائے ہو کرن سنگھ! آج رات ہم جشن منائیں گے۔ اور اس جشن میں تم بھی شریک ہو گے۔''

''اس چیک پوسٹ پر کتنے آدمی ہیں بھوج کمار؟'' طارق نے پوچھا۔

''دس.....!'' بھوج کمار نے جواب دیا۔ ''وہ سب کے سب کئی روز سے پیاسے ہیں۔ آج اُن کی بھی پیاس بجھ جائے گی۔ لیکن پہلے میں۔''

''ہم دونوں۔'' طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مزہ آ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے..... ہم دونوں۔'' بھوج کمار نے کہا۔ پھر اپنے دونوں ماتحتوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم دونوں باہر جاؤ اور اپنی باری کا انتظار کرو۔''

بھوج کمار کے دونوں ماتحت خیمے سے نکل گئے۔ طارق نے خیمے کے دروازے کا پردہ برابر کر دیا۔ بھوج کمار خ نیلم کے جسم کو اس طرح ٹٹول رہا تھا، جیسے قصائی، بکری کو ٹٹولتا ہے۔ خیمے میں ایک طرف پائپ کا سپرنگوں والا سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ بھوج کمار نے نیلم کو پکڑ کر پلنگ پر پٹخ دیا۔ نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ بھوج کمار قہقہہ لگاتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔ اس دوران نیلم، پلنگ سے اُٹھ گئی۔ بھوج کمار نے اُسے دبوچ لیا۔

''چھوڑ دو..... چھوڑ دو مجھے کمینے..... ذلیل!'' نیلم چیخ رہی تھی۔

طارق چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بھوج کمار کی طرف بڑھنے لگا۔ نیلم کی بے تحاشا چیخ و پکار یہ تاثر دینے کے لئے کافی تھی کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ طارق مزید آگے بڑھ کر اچانک ہی بھوج کمار کو گردن سے دبوچ لیا۔ بھوج کمار اس صورت حال سے

گڑبڑا گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر طارق کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ نیلم ایک طرف کھڑی دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی بھوج کمار کی زبان لٹک گئی۔ آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں۔ طارق نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز اُبھری۔ بھوج کمار کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ طارق نے اُسے مزید کچھ دیر تک دبوچے رکھا، پھر پلنگ پر پھینک دیا۔

خیمے میں بھوج کمار کے ذاتی سامان کے علاوہ چند مشین گنیں اور ایمونیشن کی تین پیٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ دو پیٹیوں میں سب مشین گنوں کے میگزین تھے۔ اور ایک میں ہینڈ گرنیڈ بھرے ہوئے تھے۔ طارق نے جیکٹ کی دونوں جیبوں میں دو دو ہینڈ گرنیڈ ٹھونس لئے اور ایک سب مشین گن اُٹھا لی۔ اس دوران نیلم بھی ایک سب مشین گن اُٹھا چکی تھی۔ طارق نے خیمے کے پردے سے جھانک کر دیکھا، کچھ فوجی ایک جگہ پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ دو سڑک پر بیریئر کے قریب کھڑے تھے۔

طارق نے نیلم کو اشارہ کیا۔ وہ خیمے سے نکل کر رینگتے ہوئے پچھلی طرف چلے گئے۔ دوسرے خیمے کے اُوپر سے گھوم کر طارق اس طرف پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں ریت کی بوریوں سے بنے ہوئے مورچے میں بھاری مشین گن نصب تھی۔ نیلم بھی سب مشین گن سنبھالے اُس کے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔ وہ ابھی مورچے سے پانچ گز دُور تھے کہ ایک فوجی نے نیلم کو دیکھ لیا۔ اُس کے ساتھ ہی وہ چیخ اُٹھا۔

''ارے..... وہ بھاگ رہی ہے..... پکڑو اُسے.....!''

اس سے پہلے کہ دوسرے فوجی کچھ سمجھ سکتے، طارق اور نیلم نے فائر کھول دیا۔ خاموش فضا فائرنگ کی خوف ناک آواز سے گونج اُٹھی۔ اُس کے ساتھ ہی چند چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ دو تین فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اُنہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ طارق نے ہوا مشین گن کی طرف چھلانگ لگا دی اور پھر دوسرے ہی لمحے مشین گن، بجلی کی طرح کڑکنے لگی..... طارق، مشین گن کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے فائر کر رہا تھا۔ مشین گن کا بیلٹ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ اس دوران نیلم بھی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ نیلم نے طارق کی جیکٹ کی جیب سے ایک ہینڈ گرنیڈ نکالا، دانتوں سے اُس کی پن کھینچی اور ہینڈ گرنیڈ پوری قوت سے اُس طرف اُچھال دیا، جہاں سے اُن پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ کان پھاڑ دینے والا ایک زوردار دھماکہ ہوا اور فائرنگ کرنے والوں کے پرخچے اُڑ گئے..... طارق نے ایک ہینڈ گرنیڈ، خیموں کی طرف اُچھال دیا..... دوسرے خیمے میں غالباً اسلحہ بارود بھرا ہوا تھا۔ پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ طارق اور

ریت کی بوریوں کے پیچھے دبکے رہے۔ آخر کار دھماکے بتدریج کم ہونے لگے۔

''نیلم..... بھاگو جیپ کی طرف! وہ ابھی تک محفوظ ہے۔'' طارق نے کہا۔ اور پھر وہ دونوں مورچے سے نکل کر جیپ کی طرف دوڑے۔ جیپ سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اُس سے کچھ آگے چٹان نما ایک بہت بڑا پتھر تھا۔ جیپ اور خیموں کے درمیان اگر وہ پتھر نہ ہوتا تو جیپ بھی تباہ ہو چکی ہوتی۔ طارق نے سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہی انجن سٹارٹ کر دیا..... نیلم بھی پھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور جیپ ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ بیریئر سے کئی گز آگے آ جانے کے بعد نیلم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کیمپ میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اِکا دُکا دھماکے اب بھی ہو رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ سب کے سب ختم ہو گئے۔'' نیلم نے پیچھے سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان خون آشام بھیڑیوں کو ختم ہونا ہی چاہئے تھا۔'' طارق نے کہتے ہوئے نیلم کی طرف دیکھا۔ خیمے میں لیفٹیننٹ بھوج کمار سے دھینگا مشتی میں نیلم کی قمیض کچھ اور پھٹ گئی تھی۔ وہ بنیان شرٹ کی طرح سامنے سے بالکل کھلی ہوئی تھی اور اُس کا سینہ اور پیٹ بالکل برہنہ ہو رہا تھا۔ مگر نیلم کو شاید ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ڈیش بورڈ کی مدھم سی روشنی میں طارق چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر ایک دم سنبھل گیا۔ ''تم پچھلی سیٹ پر جا کر یونیفارم پہن لو! تمہاری قمیض تو بالکل پھٹ چکی ہے۔ میرا خیال ہے، اسے اب اُتار ہی دو!'' اُس نے کہا۔

نیلم کو یکایک اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ اُس نے پھٹی ہوئی قمیض کے دونوں پلوؤں کو سمیٹ کر پچھلی سیٹ پر آ گئی۔ بھارتی فوجی وردی، سیٹ کے نیچے موجود تھی۔ اُس نے وردی نکالی اور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہننے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ اگلی سیٹ پر آ گئی۔

''یہ دھماکے آس پاس بھی سنے گئے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ فوج کا کوئی دستہ صورتِ حال کا جائزہ کرنے کے لئے روانہ ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں شہر کی طرف سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، ہمیں شہر سے پہلو بچا کر نکل جانا چاہئے۔'' طارق نے کہا۔

''اگر ان پہاڑوں میں راستہ بھٹک گئے تو.....؟'' نیلم نے خدشہ ظاہر کیا۔

''یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر راستہ کہیں نہ کہیں ضرور جاتا ہے۔ ہر سفر کی ایک منزل ضرور ہوتی ہے۔'' طارق بولا۔

''اور وہ منزل خواہ موت کا بھیانک جبڑا ہی کیوں نہ ہو۔'' نیلم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہہ دیا۔ ''لیکن میرے خیال میں ہمارے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مجاہدین ہمیں

بھارتی فوجی سمجھ کر ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ اگر بھارتی فوجیوں نے بھی اس جیپ کی تلاش شروع دی تو ہمارے لئے دونوں طرف سے خطرہ ہوگا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم جلد سے جلد جیپ سے نجات حاصل کر لیں۔''

''اس جیپ سے تو ہم اُس وقت تک فائدہ اُٹھائیں گے، جب تک اس کی ٹینکی میں تیل ایک بھی قطرہ موجود ہے۔ اور میرے خیال میں اس میں ابھی اتنا تیل موجود ہے کہ ہم ساٹھ میل کا فاصلہ طے کر سکیں۔'' طارق نے جواب دیا۔

''وہ دیکھو! نشیب میں دائیں طرف۔'' نیلم نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

طارق نے گردن گھما کر اُس طرف دیکھا۔ وہ دو گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں تھیں طارق کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ فوجی ٹرک تھے جو چٹانوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر اسی طرف رہے تھے۔ اُس نے فوراً ہی جیپ کے ہیڈ لیمپس بجھا دیئے اور رفتار کم کر کے متجسس نگاہوں دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ بائیں طرف چٹانوں میں اُسے ایک تنگ سا راستہ نظر آ گیا۔ اُس جیپ کو اُس راستے پر موڑ دیا اور تقریباً بیس گز آگے جا کر ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے جیپ روک دی اور نیلم کو اشارہ کرتے ہوئے اپنی سب مشین گن سنبھالے نیچے کود گیا۔ نیلم نے بھی گن اُٹھا کر جیپ سے چھلانگ لگا دی۔

''اس طرف..... میرے ساتھ آؤ!'' طارق نے کہا۔

وہ دونوں تاریکی میں بڑے بڑے پتھروں میں چکراتے ہوئے جیپ سے تقریباً بیس گز دُور ایک چٹان پر ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے جیپ بھی اُن کی نظروں میں تھی اور سڑک سے آنے والا وہ تنگ سا راستہ بھی۔ ویسے طارق کو یقین تھا کہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے جیپ کو نہیں دیکھا سکتا تھا۔

وہ دونوں اُن متحرک روشنیوں کو دیکھنے لگے جو لحہ بہ لحہ قریب پہنچ رہی تھیں..... فضا میں گرر گرر کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ آواز خاصی بھاری تھی۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہ ٹرک ہی تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد دو فوجی ٹرک اُن کے سامنے سڑک پر سے گزر گئے۔ دونوں ٹرکوں آگے بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ فوجیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ دونوں ٹرک جب تقریباً سو گز آگے نکل کر ایک موڑ پر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو وہ دونوں چٹان سے اُتر جیپ پر آ گئے۔ اور چند سیکنڈ بعد جیپ ایک بار پھر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

اب نشیب میں شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اُس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں

آخر کار طارق نے جیپ کا رُخ دائیں طرف ایک کچے راستے کی طرف گھما دیا۔ یہ راستہ ہم پور کے اُوپر سے گھومتا ہوا دوبارہ چینن کی طرف جانے والی سڑک سے مل گیا تھا۔ اس رح اگرچہ کئی میل کا چکر پڑ گیا تھا۔ لیکن وہ خطرے سے محفوظ تھے۔

چینن نامی چھوٹے سے اُس شہر کو بھی اُنہوں نے اسی طرح پیچھے چھوڑ دیا۔ اب اُن کا رُخ ہائے چناب کی طرف تھا۔ ابھی اُنہوں نے چینن سے چند ہی میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ جیپ انجن کھانسنے لگا۔ طارق گیئر بدل بدل کر انجن کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی اُس نظر ڈیش بورڈ پر پڑی، اُس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ فیول بتانے والی سوئی پر ساکت ہو چکی تھی۔ جیپ کی رفتار خود بخود کم ہوتی چلی گئی۔ اور آخر کار رُک گئی.....

''کیا ہوا.....؟'' نیلم نے پوچھا۔

''پٹرول ختم ہو گیا۔'' طارق نے جواب دیا۔

''اب کیا ہوگا.....؟'' نیلم کے لہجے میں تشویش تھی۔

''پیدل مارچ..... اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟'' طارق نے کہا۔

''میرا خیال ہے، دریائے چناب کا پُل چند میل سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ اگر ہم دریا تک جائیں تو ڈوڈہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی دُشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ تے کا تعین ہے۔'' طارق نے کہا۔

''کیوں نہ اسی راستے پر چلتے رہیں؟'' نیلم نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے..... چلو!'' طارق نے جواب دیا۔ اُن دونوں نے اپنی اپنی سب مشین گنیں اُٹھا لندھوں پر لٹکائیں اور جیپ سے اُتر کر آگے چلنے لگے۔ طارق کی جیب میں دو عدد ہینڈ گرنیڈ تھے جنہیں اُس نے بڑی احتیاط سے سنبھال رکھا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیم ہانپ گئی۔ اُونچے نیچے راستوں پر چلنا اُس کے لئے خاصا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ کندھے پر ہوئی سب مشین گن بھی اب اُسے بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔ طارق نے گن لے کر اپنے رے کندھے پر لٹکا لی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ اور طے ہو گیا۔ کے لئے اب ایک قدم اُٹھانا بھی محال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ آخر کار وہ جگہ ڈھیر ہو گئی۔ طارق بھی اُس کے قریب بیٹھ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اُس کھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ وہ کوئی بہت ہی مدھم سی روشنی تھی۔ جو نشیب میں نظر آ رہی

''نیلم..... وہ دیکھو! نشیب میں روشنی نظر آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی کاشتکار کا مکان

ہے۔ ہمت سے کام لو! وہاں پہنچ کر ہمیں محفوظ جگہ مل سکتی ہے۔'' طارق نے کہا۔

نیلم نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔ ٹمٹماتی ہوئی روشنی خاصی دُور نظر آ رہی تھی۔ ''اب مجھ سے ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جائے گا۔'' نیلم نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ''ذرا رُک جاؤ! مجھے دم لینے دو۔''

''اگر کہو تو میں تمہیں کندھے پر اُٹھا لوں.....؟'' طارق بولا۔

''نہیں..... بس! چند منٹ رُک جاؤ۔'' نیلم نے کہا۔

دس منٹ گزر گئے..... نیلم کا سانس اب قدرے معمول پر آ چکا تھا۔ طارق نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ فضا میں ایک مخصوص بھینی بھینی سی مہک رچی ہوئی تھی۔ یہ دھان کے پودوں کی خوشبو تھی۔ ریاست میں کہیں کہیں دھان بھی کاشت ہوتا تھا۔ اس موسم میں آس پاس کی فضا میں مسحور کن مہک رچی رہتی تھی۔

وہ نشیب میں پہنچ گئے۔ روشنی اب تقریباً سو گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ نیلم ایک بار پھر لڑکھڑانے لگی۔ طارق اُسے سہارا دے کر تقریباً گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ ''ہمت کرو نیلم! اب زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا۔ وہ دیکھو! روشنی بالکل قریب نظر آ رہی ہے۔'' طارق نے اُسے حوصلہ دلایا۔

''تم چلے جاؤ..... مجھے یہیں چھوڑ دو۔ پلیز!'' نیلم کراہی۔

طارق رُک گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نیلم کو گھسیٹنے لگا۔ روشنی اب صرف بیس گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ طارق رُک گیا۔ نیلم نیچے گر کر ہانپنے لگی۔ اُس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ طارق سیدھا ہو کر روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کسی مکان کی کھڑکی تھی جس میں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا تو تاریکی میں دو مکانوں کے ہیولے نظر آئے۔ ایک مکان تو وہی تھا، جس کی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ اور دوسرا مکان اُس سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا۔

طارق، نیلم کے قریب بیٹھ گیا۔ دس منٹ گزر گئے۔ نیلم اب چلنے کے قابل ہو گئی تھی۔ طارق نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور اُس کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ مکان کی طرف چلنے لگا۔ اس طرح آگے بڑھنا اگرچہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن نیلم کی حالت دیکھتے ہوئے اُس نے ساری احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

ابھی اُنہوں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بیک وقت دائیں اور بائیں طرف سے آہٹ سنائی دی..... طارق نے دائیں طرف دیکھا۔ اُسی لمحے ایک خوف ناک غراہٹ اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا لو! اور اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ورنہ چھلنی کر دیئے جاؤ گے..... تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔''

نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ جبکہ طارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا تھا۔ اُس نے گردن گھما کر دائیں، بائیں اور پیچھے دیکھا..... تین آدمی دائیں طرف تھے، تین بائیں اور دو پیچھے..... اُن سب کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔ جن کے رُخ اُنہی کی طرف تھے۔ سب کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ پیچھے کھڑے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی۔ اور پھر اُن کے جسموں پر بھارتی فوج کی وردیاں دیکھ کر سب کے ہونٹوں سے سیٹیاں نکل گئیں۔

''اوہ..... تو تم لوگوں کو اطلاع مل چکی ہے۔ لیکن فکر مت کرو..... ہم نمٹ لیں گے۔'' دائیں طرف سے ایک آدمی نے کہا۔ پھر اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''شمروز! ان کے کندھوں سے رائفلیں اُتار لو۔ اور انہیں اندر لے چلو۔ ان سے یہ پوچھنا ہے کہ ان کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ اور کتنی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں؟''

پیچھے کھڑے ہوئے شمروز نے اُن کے کندھوں سے سب مشین گنیں اُتار لیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے طارق کے کولہے پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ طارق بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

وہ لوگ اُنہیں رائفلوں کی زد پر لئے مکان کے ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ وہی کمرہ تھا، جس کی کھڑکی سے روشنی دیکھ کر وہ اس طرف آئے تھے۔ کھڑکی میں ایک لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ روشنی میں نیلم کو دیکھتے ہی وہ لوگ بری طرح چونک گئے۔ نیلم کی ٹوپی راستے میں کہیں گر گئی تھی۔ اور اس کے سیاہ ریشمی بال، پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

''اوہ.....!'' ایک آدمی نے کہا۔ ''تو تم لوگ عورتوں کو بھی میدانِ جنگ میں لے آئے ہو۔''

''ہم، وہ نہیں ہیں، جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔'' طارق نے کہا۔

''ابھی دس منٹ میں پتہ چل جائے گا کہ تم لوگ کون ہو..... شمروز! انہیں دوسرے کمرے میں لے چلو۔'' اُس آدمی نے کہا۔ وہ غالباً اُن کا لیڈر تھا۔ اور طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ مجاہدین تھے۔

وہ لوگ اُنہیں دھکیلتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئے۔ اب تک جو لوگ طارق کے سامنے آئے تھے، اُن کی تعداد دس تھی۔ اور اُن میں سے کسی نے بھی ابھی تک اپنا چہرہ بے نقاب نہیں کیا تھا۔ سب کے چہروں پر مفلر یا رومال بندھے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں برہنہ تھیں۔

سات آدمی پہلے کمرے میں رہ گئے تھے۔ جبکہ تین اُن کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئے تھے۔ اُن میں ایک تو وہی تھا، جسے شمروز کے نام سے پکارا گیا تھا۔ دوسرا وہ، جو اب تک احکامات جاری کرتا رہا تھا۔ وہی مجاہدین کی اُس پارٹی کا لیڈر تھا۔ اُسے اب تک صرف ایک مرتبہ گوہر علی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ تینوں اُنہیں آٹومیٹک رائفلوں کی زد پر لئے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اُس میں صرف ایک روشندان کے علاوہ کوئی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ صرف وہی ایک دروازہ تھا، جو ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا۔ یہ مکان مکمل طور پر لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اُس کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔ فرش پر ایک فٹ چوڑے اور تین تین فٹ لمبے تختے جڑے ہوئے تھے۔ بعض تختے ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے۔

''کیا تم لوگ شرافت سے بتانا پسند کرو گے یا اس کے لئے ہمیں کچھ کوشش کرنا پڑے گی؟'' پارٹی کے لیڈر گوہر نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آخر میں اُس کی نظریں، طارق کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم، وہ نہیں ہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔'' طارق نے جواب دیا۔

''تو پھر بتاؤ! تم لوگ کون ہو.....؟'' گوہر نے اُسے گھورا۔

''میرا نام طارق سعید ہے..... میں باغ کا رہنے والا ہوں۔ اور میرا تعلق لبریشن فرنٹ سے ہے۔ اگر تمہاری پارٹی کا تعلق بھی لبریشن فرنٹ سے ہے تو تم بابا رحمان سے اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ اگر لبریشن فرنٹ کے علاوہ کسی اور تنظیم سے تعلق رکھتے ہو تو بھی میرے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ تمام تنظیموں کا مقصد ایک ہی ہے..... کشمیر کی آزادی.....!'' طارق نے کہا۔

''کیا نام بتایا تم نے.....؟'' طارق نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''طارق سعید۔'' طارق نے جواب دیا۔

''میرا تعلق حزب المجاہدین سے ہے۔ لیکن دوسری تنظیموں سے بھی ہمارا رابطہ ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کے بارے میں معلومات بھی رکھتے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، طارق نامی ایک نوجوان کو لبریشن فرنٹ نے ایک اہم مشن پر دہلی بھیجا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ میں اس وقت اُس کا نام بھول رہا ہوں۔ اس بات کو تقریباً ساڑھے چار سال ہو چکے ہیں۔ وہ دونوں دہلی پہنچنے کے چند روز بعد گرفتار ہو گئے تھے۔''

''اُس کا نام سلیم تھا۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''ہم چار سال تک دہلی کی تہاڑ جیل میں

رہے۔ پھر فرار کی کوشش میں میرا دوست سلیم شہید ہو گیا۔ اور میں دہلی میں موجود لبریشن فرنٹ کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔ پھر مجھے سرینگر پہنچنے کے لئے کہا گیا۔ جس روز ہم دہلی سے فرار ہوئے، اُسی روز فرنٹ کے دہلی کے خفیہ اڈے پر چھاپہ پڑا اور ہمارے بہت سے ساتھی شہید ہو گئے..... میں کچھ ہمدردوں کی مدد سے امرتسر کے راستے پاکستان کی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تین چار روز پہلے ہم جموں پہنچے تھے۔ جموں سے چند میل دُور ایک چھوٹی سی بستی.....''

''ٹھیک ہے..... چلو! مان لیا کہ تم طارق سعید ہو۔ لیکن یہ عورت کون ہے..... اور بھارتی فوج کی یہ وردی.....'' گوہر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' طارق نے کہا۔ اور جموں سے روانگی سے لے کر اب تک کے واقعات کی تفصیل بتا دی۔

''اوہ..... تو وہ چوکی تم دونوں نے اُڑائی ہے.....؟'' گوہر چونک گیا۔

''ہاں.....'' طارق نے مختصر سا جواب دیا۔

''ہمارے چند ساتھی یہاں آنے والے ہیں۔ ہمیں دراصل! اُنہی کا انتظار تھا۔ آنے والی پارٹی میں دو نوجوان ایسے بھی ہیں، جو پانچ سال پہلے لبریشن فرنٹ میں تھے۔ اگر اُنہوں نے تمہیں شناخت کر لیا تو ہم تم سے اپنے رویئے کی معافی مانگ لیں گے۔ بصورتِ دیگر تم اپنے انجام کا تصور بھی نہیں کر سکو گے۔ اس وقت تک تم دونوں کو اس کمرے میں رہنا ہو گا۔ اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچو گے۔''

''ٹھیک ہے.....!'' طارق نے کہا۔ ''لیکن کیا ہمیں کچھ کھانے کو مل سکتا ہے.....؟ ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بھوک اور تھکن سے میری ساتھی کی حالت بہت بری ہو رہی ہے۔''

''اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔'' گوہر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال! دیکھتا ہوں، اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟''

وہ تینوں کمرے سے نکل گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ نیلم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بھوک اور تھکن سے واقعی اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ تھکن کا غلبہ زیادہ تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ طارق بھی اُس کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہو گئے۔ اُن میں ایک تو شمروز تھا جس نے رائفل سنبھال رکھی تھی۔ اور دوسرے نے اُبلے ہوئے چاولوں سے بھرا ہوا ایک طشت اُٹھا رکھا تھا۔ اُس کے ساتھ دو پلیٹیں اور ایک پیالے میں شوربہ سا تھا۔

''جلدی میں یہ چاول اُبال دیئے ہیں۔ اور یہ رات کے کھانے سے بچا ہوا تھوڑا سا شوربہ تھا۔ اس سے گزارہ کرلو'' شمروز نے کہا۔

طارق نے نیلم کو جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ شمروز کا ساتھی، پانی کا جگ بھی دے گیا تھا۔ اُن دونوں کے باہر جانے کے بعد طارق اور نیلم نے چاول کھائے۔ شوربہ اگرچہ بہت ہی بدمزہ تھا۔ لیکن اُنہوں نے کل صبح ناشتے کے بعد سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس وقت یہ اُبلے ہوئے چاول اور بدمزہ شوربہ بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

مزید آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اور پھر دوسرے کمرے میں باتوں اور قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور تین چار آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن میں ایک شمروز تھا دوسرا گوہر اور باقی دو کی آنکھوں سے طارق نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اجنبی تھے۔ اُن سب کے چہرے اب بھی نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

''اسے پہچانتے ہو گلریز.....؟'' گوہر نے اپنے ساتھ آنے والے ایک نقاب پوش سے کہا۔ اُس کا اشارہ، طارق کی طرف تھا۔

''ارے طارق.....!'' گلریز اُسے دیکھتے ہی اُچھل پڑا۔ ''تم نے اگرچہ داڑھی رکھ لی ہے۔ لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ لیکن تمہارے بارے میں تو میں نے سنا تھا کہ تم دہلی میں پکڑے گئے تھے اور تمہیں تہاڑ جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔''

''کسی جیل کی دیواریں مجاہدین کو محصور نہیں رکھ سکتیں۔'' طارق نے جواب دیا۔ اُس کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا تھا۔ گلریز کا نام اگرچہ اُس کے لئے جانا پہچانا تھا۔ مگر وہ اُس کا چہرہ ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا۔

گلریز نے چہرے پر لپٹا ہوا رُومال ہٹا دیا۔ طارق نے اُسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ لبریشن فرنٹ میں اُس کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اور دونوں بھارتی فوجیوں کے خلاف کئی کارروائیوں میں حصہ لے چکے تھے۔ گلریز دونوں بانہیں پھیلا کر آگے بڑھا اور طارق اُس سے لپٹ گیا۔ گوہر اور اُس کے ساتھیوں نے بھی اب چہروں سے نقاب اُتار دیئے اور وہ سب باری باری طارق سے معانقہ کرنے لگے۔ گوہر اُس پارٹی کا انچارج تھا۔ اُس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پارٹی کے دوسرے لڑکے بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ اب اُن کی مجموعی تعداد اٹھارہ تھی اور اُن میں کوئی بھی بیس اکیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ یہ سب کشمیری مجاہدین تھے جو اپنے وطن کی آزادی کے لئے سروں سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے تھے۔ یہ اُن کے کھیلنے اور پڑھنے کے دن تھے۔ لیکن اُنہوں نے کندھوں پر رائفلوں اور مشین گنوں کا بوجھ اُٹھا رکھا تھا۔

اُنہوں نے کسی ملٹری اکیڈمی سے تربیت حاصل نہیں کی تھی، کسی جنرل نے اُنہیں ٹریننگ نہیں دی تھی۔ لیکن اُنہوں نے وادی کشمیر میں بھارتی فوجیوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ یہ سرپھرے نوعمر لڑکے، بھارتی فوجی قافلوں یا چوکیوں پر بجلی بن کر گرتے اور قہر بن کر اُنہیں تباہ و برباد کرتے ہوئے نکل جاتے.....

وہ لوگ کچھ دیر تک طارق سے اُس کے بارے میں پوچھتے رہے۔ طارق نے اُن سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب کچھ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب طارق نے بتایا کہ اودھم پور کے قریب فوجی چوکی اُس نے اور نیلم نے تباہ کی تھی تو گلریز اُچھل پڑا۔

''حیرت انگیز.....!'' وہ بولا۔ ''یہ ایک یا دو آدمیوں کا کام نہیں تھا۔ اُس چوکی پر دس بارہ فوجی تھے۔ جو سب کے سب ختم ہو گئے اور گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ بھارتی فوجیوں کا خیال ہے کہ مجاہدین کی کسی بہت بڑی پارٹی نے اس چوکی پر چھاپہ مارا تھا۔ وہ آس پاس کے علاقوں میں مجاہدین کو تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن تم لوگ اتنی جلدی یہاں تک کیسے پہنچ گئے.....؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم نے جموں کی ایک نواحی بستی میں چند بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر کے یہ وردیاں اور جیپ حاصل کی تھی۔'' طارق نے بتایا۔

''اوہ.....! تو وہ جیپ تمہاری تھی؟'' گلریز بولا۔

''کون سی جیپ.....؟'' گوہر نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہاں سے چند میل دُور ہمیں ایک جیپ کھڑی ہوئی ملی تھی۔ ہم یہ سمجھے تھے کہ بھارتی فوجی آس پاس کہیں موجود ہیں۔ ہم پہلے تو گھات لگائے بیٹھے رہے، پھر جیپ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ جیپ کسی طرح سٹارٹ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار ہم نے اُسے ایک گہرے کھڈ میں دھکیل دیا۔ تاکہ بھارتی فوجی بھی اسے استعمال نہ کر سکیں۔'' گلریز نے کہا۔

''جیپ میں پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہم نے اُسے چھوڑ دیا۔'' طارق نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے..... کوئی خاص ہم.....؟''

گلریز اور گوہر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر گوہر نے کہا۔ ''ڈوڈہ میں بھارتی فوج نے ایک نئی چوکی قائم کی ہے، جہاں گولہ بارود کی بہت بڑی مقدار جمع کی گئی ہے۔ اُسے علاقے کا مرکزی اسلحہ ڈپو بنایا گیا ہے۔ جہاں سے قرب و جوار کی چوکیوں اور فوج کی گشتی پارٹیوں کو اسلحہ سپلائی کیا جاتا ہے۔ آج ہم اُس اسلحہ ڈپو پر ریڈ کرنے والے ہیں۔''

''کس وقت.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''صبح چار بجے۔'' گوہر نے بتایا۔''ہمیں گلریز اور اس کے ساتھیوں کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔''

''کیا مجھے اس مہم میں شریک ہونے کی اجازت دی جاسکتی ہے.....؟'' طارق نے کہا۔

''ہمیں خوشی ہوگی۔ لیکن تمہاری یہ ساتھی.....'' گوہر نے نیلم کی طرف دیکھا۔

''اسے عورت جان کر کمزور مت سمجھو۔'' طارق نے کہا۔''ادھم پور والی چوکی تباہ کرنے میں نیلم نے بڑی ذہانت اور دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ویسے بھی میں اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ اسے میرے ساتھ ہی سرینگر پہنچنا ہے۔''

''ٹھیک ہے.....تم اپنی ذمہ داری پر اسے ساتھ لے سکتے ہو۔'' گوہر نے جواب دیا۔

''شکریہ.....لیکن ہمارے لئے کپڑے.....؟''

''کپڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔'' گوہر نے اُس کی بات کاٹ دی۔

چند منٹ بعد اُن کے لئے کپڑوں کا انتظام کر دیا گیا۔ نیلم کے لئے بھی مردانہ جوڑا فراہم کیا گیا تھا۔ پھر گوہر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اُس کمرے میں ایک جگہ فرش کے تختے کو اُدھیڑنے لگا تین تختے اُدھیڑے گئے اس طرح تین مربع فٹ کا خلا سا بن گیا۔ تختوں کے نیچے زمین پر اتنی ہی لمبی چوڑی سیمنٹ کی ایک سل تھی۔ جسے بڑی احتیاط سے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اُس کے نیچے تہ خانہ تھا۔ گوہر کے اشارے پر دو آدمی تہ خانے میں اُتر گئے۔

کچھ ہی دیر بعد کمرے میں اسلحے کا ڈھیر لگ گیا.....یہ اسلحہ اُس تہ خانے سے نکالا گیا تھا۔ اُن میں چار راکٹ لانچر، متعدد راکٹ، ہینڈ گرنیڈ اور آٹو میٹک رائفلوں اور سب مشین گنوں کے کئی میگزین تھے، جنہیں پارٹی کے آدمیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ طارق اور نیلم کو بھی ایک ایک سب مشین گن، فاضل میگزین اور دو دو ہینڈ گرنیڈ دے دیئے گئے۔ نیلم اب پہلے کی طرح چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے اور دو ڈھائی گھنٹوں کے آرام سے اُسے بہت سہارا ملا تھا۔

گوہر ہی اُس چھاپہ مار پارٹی کا لیڈر تھا۔ اُس نے سب کو حملے کا منصوبہ سمجھایا اور پھر سب لوگ دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں مکان سے نکلنے لگے۔ اُس وقت رات کے تین بجے تھے اور اُن کا رُخ دریائے چناب کی طرف تھا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کر کے وہ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ پُل وہاں سے بائیں طرف تقریباً ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ ظاہر ہے، وہ پُل کی طرف جانے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔ اُنہیں یہیں سے دریا پار کرنا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ڈوڈہ شہر آباد تھا۔

دریا کا کنارہ خاصا ڈھلواں تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک کر کے ڈھلان پر اُترتے

رہے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہونے کی وجہ سے دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ وہ پتھروں پر سے ہوتے ہوئے چلتے رہے۔ کہیں کہیں اُنہیں پنڈلی تک پانی میں چلنا پڑا۔ وسط میں ایک جگہ پانی، کمر تک گہرا تھا اور یہاں بہاؤ بھی تیز تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر قطار میں چلتے رہے۔ قطار میں شمروز سب سے آگے تھا۔

دوسرے کنارے کی ڈھلان پر وہ رُک گئے۔ یہاں بڑے بڑے پتھر تھے۔ گوہر نے ایک پتھر کی آڑ میں کھڑے ہو کر پنسل ٹارچ روشن کر لی اور دریا کی بالائی سمت رُخ کر کے روشنی کے سگنل دینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد دوسری طرف سے بھی روشنی کے سگنل دیئے جانے لگے۔

''آؤ.....!'' گوہر نے ٹارچ بجھا کر جیب میں ڈال لی۔ وہ سب گوہر کے پیچھے اُس طرف چلنے لگے، جہاں سے روشنی کے سگنل دیئے گئے تھے۔ پانچ منٹ میں وہ اُس جگہ پہنچ گئے۔ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں ایک نقاب پوش مجاہد اُن کا منتظر تھا۔

''کیا پوزیشن ہے ایوب.....؟'' گوہر نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

''شہر میں داخلے کے تمام راستوں پر ناکہ بندی ہے۔ اسلحہ ڈپو اور کیمپ، شہر کے بائیں طرف پہاڑی کے دامن میں ہے۔ ہم دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پچھلی طرف سے پہاڑی پر چڑھ سکتے ہیں۔ لیکن اس طرف بھی پٹرولنگ ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔'' ایوب نے جواب دیا۔

وہ لوگ دریا سے نکل کر کنارے پر آگئے اور ایوب کی رہنمائی میں چلنے لگے۔ اُنہیں تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ آخر کار وہ اُس پہاڑی کے قریب پہنچ گئے، جس کے دامن میں فوجی کیمپ تھا۔ اس سے آگے شہر پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی پر بھی کہیں کہیں روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ کشمیریوں کے مکانات تھے جنہیں فوج نے خالی کروا کے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ پہاڑی زیادہ بلند نہیں تھی۔ ایوب کی اطلاع کے مطابق اس پہاڑی کے پچھلی طرف بھی گشت ہوتا تھا۔ لیکن گوہر کو یقین تھا کہ پہاڑی کے اُوپر بھی کوئی نہ کوئی چوکی ضرور ہوگی۔

وہ لوگ پہاڑی کی پشت پر پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد پتھریلے راستے پر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی..... وہ لوگ تاریکی میں دبکے اُس سمت دیکھتے رہے، جس سمت سے آوازیں آرہی تھیں۔ چند منٹ بعد چار فوجی باتیں کرتے ہوئے اُن کے سامنے تقریباً دس گز کے فاصلے سے گزر گئے۔ اُن میں سے دو سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔

''چلو.....!'' گوہر نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

وہ سب پہاڑی کی بلندی کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ یہ پہاڑی پانچ سو فٹ

سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ گوہر کا یہ اندازہ درست نکلا کہ پہاڑی کی چوٹی پر بھی ایک نگران چوکی موجود تھی۔ چوٹی پر بہت بڑی ہموار جگہ تھی، جہاں یہ چوکی قائم کی گئی تھی۔ ایک طرف لکڑی کے دو چھوٹے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ جبکہ ایک جگہ ریت کی بوریاں رکھ کر مورچہ سا بنا دیا گیا تھا اور وہاں دو بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ دونوں مشین گنوں پر گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ دو محافظ کندھوں پر سب مشین گنیں لٹکائے ٹہل رہے تھے۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے گوہر کے ایک ساتھی کے پیر کے نیچے سے پتھر نکل گیا اور پُرشور آواز سے ڈھلان پر لڑھکنے لگا۔ ''کون ہے وہاں.....؟ رُک جاؤ!'' فضا میں ایک محافظ کی آواز گونجی۔

گوہر کے دو آدمی محافظوں کی نظر میں آ گئے تھے۔ محافظوں نے فائرنگ شروع کر دی..... گوہر کے دونوں ساتھی فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ دونوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے اور وہ ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے.....

''فائر.....!'' گوہر چیخا۔

مختلف پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے مجاہدین نے فائرنگ شروع کر دی..... بھارتیوں کی دونوں بھاری مشین گنیں بھی بیک وقت دہاڑنے لگیں..... طارق جس پتھر کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اُس پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ نیلم بھی طارق کے ساتھ تھی۔ ''تم فائرنگ جاری رکھو..... میں اس طرف سے اُوپر جانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' طارق نے نیلم سے کہا اور پتھروں کی آڑ میں رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

ایک جگہ طارق رُک گیا۔ وہ جس پتھر کے پیچھے چھپا ہوا تھا، مشین گنوں والا مورچہ وہاں سے تقریباً پندرہ گز اُوپر تھا۔ اُس نے جیپ سے ہینڈ گرنیڈ نکالا، اُس کی پن کھینچی اور کھڑے ہو کر اُسے پوری قوت سے مورچے کی طرف اُچھال دیا..... ہینڈ گرنیڈ پھینکتے ہی وہ نیچے لیٹ گیا۔ اُسی لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔ گرنیڈ، مورچے کے باہر گرا تھا۔ طارق نے ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر دوسرا ہینڈ گرنیڈ اُچھال دیا..... یہ گرنیڈ، مورچے کے اندر گرا۔ ایک اور دھماکہ ہوا اور مورچہ کسی پرندے کے گھونسلے کی طرح بکھر گیا۔ مشین گنوں اور گن مینوں کی لاشوں کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔ مجاہدین، اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے چوکی پر پہنچ گئے۔ چوکی کے ایک دو محافظ زندہ بچ گئے تھے اور اپنی جان بچانے کے لئے بڑی تیزی سے دوسری طرف کی ڈھلان پر دوڑ رہے تھے۔ مجاہدین نے اُن پر فائرنگ جاری رکھی..... پہاڑی کے دامن میں فوجی کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ کیمپ سے اُوپر والی چوکی تک آنے کے لئے پہاڑی پر بل کھاتا ایک کشادہ راستہ موجود تھا جس پر بھاری ٹرک چل سکتے تھے۔ کئی گاڑیوں کے ہیڈ

لیمپس کی روشنیاں اس وقت بھی پہاڑی کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر نظر آ رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ بھارتی فوجی اُوپر آ رہے تھے.....

''شمروز.....!'' فضا میں گوہر کی آواز گونجی۔ ''راکٹ فائر کرو!''

وہ مجاہدین، جن کے پاس راکٹ لانچر تھے، پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد بیک وقت چار راکٹ فائر ہوئے تو فوجی کیمپ پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔

ٹھیک اُسی وقت پہاڑی پر دائیں اور بائیں سمت سے فائرنگ شروع ہو گئی..... کچھ بھارتی فوجی اُن اطراف سے پہاڑی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اُنہوں نے مجاہدین کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے فائر کھول دیئے تھے.....

کیمپ میں مسلسل کان پھاڑ دینے والے خوف ناک دھماکے گونج رہے تھے۔ گوہر نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اُن کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مجاہدین گھیرا توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے مختلف سمتوں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ طارق اور نیلم، گوہر کے ساتھ تھے۔ وہ پہاڑی کے دوسری طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی دوران گوہر کے ایک اور ساتھی کی خوف ناک چیخ گونجی اور وہ ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس معرکے میں یہ تیسرا مجاہد شہید ہوا تھا۔

طارق، نیلم کا ہاتھ پکڑے اُسے ڈھلان پر کھینچتا ہوا جا رہا تھا۔ نیلم نے اب تک مردوں ہی کی طرح بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک عورت ہی نہیں، ایک دلیر اور جسامت مجاہدہ بھی ہے۔

ڈھلان پر دوڑتے ہوئے اچانک طارق کا پیر، رپٹ گیا..... نیلم نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن وہ خود بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دونوں ڈھلان پر لڑھکنے لگے..... اور بالآخر ایک پتھر کے ساتھ ٹکرا کر رُک گئے۔ طارق اور نیلم ایک دوسرے کے نیچے اُوپر تھے۔ طارق نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن اُسی وقت ایک خوف ناک غراہٹ اُس کی سماعت سے ٹکرائی..... ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا.....!''

طارق اور نیلم نے بیک وقت اُوپر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اُنہیں یوں محسوس ہوا، جیسے دل ڈوب رہے ہوں..... اُن کے سامنے تین بھارتی فوجی سب مشین گنیں تانے کھڑے تھے۔ ''اگر تم چاہیں تو تم دونوں کے جسموں میں اتنی گولیاں اُتار دیں کہ زخموں کا شمار مشکل ہو جائے۔ لیکن ہم تمہیں زندہ رکھیں گے۔ تاکہ تمہارے ساتھیوں کے ٹھکانے معلوم ہو سکیں۔'' ایک فوجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

نیلم اور طارق ابھی تک زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے دوسری طرف کیمپ میں ابھی تک مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ اچانک دائیں طرف آہٹ سن کر وہ تینوں فوجی اُس طرف گھوم گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے، فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ تینوں فوجی خون میں لت پت ہو کر گرے۔ اُن کے جسم چھلنی ہو گئے تھے۔ ایک فوجی، نیلم کے اُوپر گرا تھا۔ اُس کے زخموں سے بہنے والے خون نے نیلم کے لباس کو بھی تر کر دیا تھا۔ نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''طارق! اس طرف..... ہری اپ.....!'' دائیں طرف سے ایک سرگوشی اُبھری۔

طارق اُس آواز کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔ لیکن ظاہر تھا، وہ اُنہی کا کوئی ساتھی تھا۔ اُس نے بھارتی فوجی کی لاش کو گھسیٹ کر نیلم کے اُوپر سے ہٹایا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر آواز کی سمت دوڑا۔

وہ گلریز تھا۔ جس نے بروقت کارروائی کر کے اُنہیں بچا لیا تھا۔ گلریز نے اُنہیں اشارہ کیا اور وہ تینوں پہاڑی ڈھلان پر ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

☆

وہ اٹنت ناگ سے صرف سات میل کے فاصلے پر تھے، جہاں اُنہوں نے ایک چرواہے کے جھونپڑے میں پناہ لے رکھی تھی۔ ڈوڈہ سے یہاں تک پہنچنے میں اُنہیں دو دن لگے تھے۔ اس رات ڈوڈہ میں اُن کی کارروائی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی۔ اُس کارروائی میں ستائیس بھارتی فوجی ہلاک اور بیسیوں زخمی ہوئے تھے۔ جبکہ گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ مجاہدین میں سے تین نے جام شہادت نوش کیا تھا اور دو زخمی ہو گئے تھے۔ جنہیں اُن کے ساتھی اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

دن چڑھتے ہی بھارتی فوجیوں نے شکاری کتوں کی طرح مجاہدین کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ڈوڈہ کے قرب و جوار کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ظلم و بربریت کے وہ مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے کہ پوری وادی کانپ اُٹھی تھی۔ بیسیوں بے گناہوں کو مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ لیکن بھارتی درندے

مجاہدین میں سے کسی ایک کا بھی سراغ نہیں لگا سکے تھے۔

نیلم، طارق اور گلریز، دن کی روشنی پھیلنے تک پہاڑوں میں چلتے رہے تھے۔ وہ دُشوار گزار پہاڑوں میں کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جگہ رُک گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا غار تھا جہاں اُنہوں نے پناہ لی تھی۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ کوس دُور نشیب میں ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس بستی تک پہنچنے کا راستہ بھی خاصا دُشوار گزار تھا۔ کسی گاڑی کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آمد و رفت گدھوں، خچروں اور گھوڑوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ گلریز کو یقین تھا کہ دو چار روز تک بھارتی فوجیوں کی کوئی ٹولی عام گزرگاہ سے ہٹ کر ان دُشوار گزار راستوں پر آنے کی ہمت نہیں کرے گی۔

گلریز، طارق اور نیلم کو غار میں چھوڑ کر بستی سے کھانے پینے کی چیزیں لے آیا تھا۔ وہ تینوں ہی طرح تھک گئے تھے۔ رات بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پیٹ بھرنے کے بعد تینوں غار میں پڑے دوپہر تک سوتے رہے۔ دوپہر کے بعد گلریز، بستی سے تین خچر لے آیا اور اسی طرح وہ اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔

بستیوں سے بچ کر دُشوار گزار راستوں پر سفر کرتے ہوئے وہ شام سے ذرا پہلے اٹنت ناگ سے تقریباً تین میل دُور ایک بستی میں پہنچے تھے۔ اُنہوں نے خچر بستی میں چھوڑ دیئے اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر پیدل ہی چل پڑے تھے۔ ایک اُونچی پہاڑی پر واقع چرواہے کے اس جھونپڑے کے بارے میں گلریز پہلے ہی سے جانتا تھا۔ اسی لئے ایک بہت ہی تنگ سی گھاٹی سے گزرتے ہوئے وہ سیدھا یہاں آیا تھا۔ اس جھونپڑے سے تقریباً بیس گز دُور پہاڑ میں ایک تنگ سی دراڑ تھی جو اندر دُور تک چلی گئی تھی۔ گلریز کو اطمینان تھا کہ اگر کسی وقت بھارتی فوجی اُس طرف آ بھی گئے تو وہ اس پہاڑی دراڑ میں پناہ لے سکتے ہیں۔ یہ تنگ سی دراڑ، بل کھاتی ہوئی پہاڑ کے سینے میں بہت دُور تک چلی گئی تھی۔

چرواہے کے اس جھونپڑے کی طرف آتے ہوئے اُنہیں بستی سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اٹنت ناگ کی صورتِ حال بہتر نہیں ہے۔ شہر اور اس کے گرد و نواح میں کئی روز سے بھارتی فوجیوں اور مجاہدین میں جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ اس صورتِ حال میں گلریز نے شہر میں داخل ہونا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ طارق راستے میں اُسے بتا چکا تھا کہ وہ دہلی سے کیوں آیا ہے؟ اُس کے لئے سرینگر پہنچنا بے حد ضروری تھا اور گلریز نے گویا اُن دونوں کو صحیح سلامت سرینگر پہنچانے کی ذمہ داری لے لی تھی۔ اس لئے وہ اُن کے معاملے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

گلریز نے دوسرے دن صبح چرواہے کو کھانے پینے کا سامان لینے کے لئے بستی بھیج دیا۔ چرواہا

اگرچہ خچر پر گیا تھا اور بستی کا فاصلہ چار میل سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اُس کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی تھی۔ گلریز اور طارق کو چرواہے سے تازہ ترین صورتِ حال کا بھی پتہ چل گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق گزشتہ رات اور آج رات اننت ناگ، بٹا کوٹ، سرینگر، سوتور، گلمرگ، بارہ مولہ اور سوپور میں مجاہدین اور بھارتی فوجیوں میں زبردست جھڑپیں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے اُن تمام علاقوں میں کرفیو لگا دیا گیا تھا اور بھارتی فوجی دستے مجاہدین کی تلاش میں نواحی بستیوں میں چھاپے مار رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے اُن بستی والوں کو، جہاں چرواہا کھانے پینے کا سامان لینے گیا تھا، اطلاع ملی تھی کہ ایک فوجی دستہ اُس طرف بھی آ رہا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی بستی کی دُکانیں بند ہوگئی تھیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے تھے۔

گلریز اور طارق کے لئے یہ اطلاع خاصی تشویش ناک تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ کرفیو کھلنے تک وہ اننت ناگ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور دوسری بات جو سب سے زیادہ تشویش ناک تھی، وہ یہ تھی کہ بھارتی فوجی، مجاہدین کی تلاش میں اس طرف بھی آ سکتے تھے۔ وہ ان بھارتی بھیڑیوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جب وہ ٹولیوں کی صورت میں شکار پر نکلتے تھے تو ظلم و بربریت کی نئی داستانیں رقم ہوتی تھیں۔

پہاڑ کے دامن سے اُوپر آنے والا راستہ صاف نظر آتا تھا۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ باری باری اس راستے کی نگرانی کریں گے۔

وہ دن اور رات خیریت سے گزر گئی۔ بھارتی فوجی اگر بستی میں آئے بھی تھے تو اُنہوں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ البتہ دوسرے دن صبح سویرے جب طارق جھونپڑے کے قریب ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا راستے کی نگرانی کے فرائض انجام دے رہا تھا، وادی میں بہت دُور ایک جگہ سے دُھواں اُٹھتے دیکھ کر چونک گیا۔ گاڑھا، سیاہ دُھواں، بادلوں کی صورت میں اُوپر کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ طارق کو اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ دُھواں وہاں سے چار میل دُور واقع بستی سے اُٹھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بھارتی فوجی صبح سویرے ہی بستی میں پہنچ گئے تھے اور اُنہوں نے اپنی بربریت کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔

چند منٹ بعد نشیب میں ایک جگہ ایک فوجی جیپ رُکتے دیکھ کر طارق چونک گیا۔ جس جگہ جیپ رُکی تھی، وہ ایک دوراہا تھا۔ وہاں سے ایک کچی سڑک گوند اور رامبن کی طرف اور دوسری سڑک کل گام اور ناگابل سے ہوتی ہوئی سرینگر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ فوجی جیپ بستی کی طرف سے آ کر رُکی تھی۔

طارق، پتھر کی آڑ میں رینگتا ہوا جھونپڑے میں پہنچ گیا۔ نیلم ایک کونے میں کمبل میں سمٹی

ہی تھی۔ دوسری طرف گلریز لیٹا ہوا تھا۔ وہ بیدار ہو گیا تھا۔ لیکن کمبل سے نکلنے کو شاید اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بوڑھا چرواہا، جھونپڑے کے پچھلی طرف چولہا جلانے کے لئے لکڑیاں جمع کر رہا تھا۔

''خیریت..... اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو.....؟'' گلریز نے طارق کو بدحواسی میں جھونپڑے میں داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''پہاڑ کے دامن میں ایک فوجی جیپ آ کر رُکی ہے۔ اُس میں چار فوجی ہیں۔ اور وہ لوگ جیپ سے اُتر کر اسی طرف آ رہے ہیں۔'' طارق نے بتایا۔

گلریز ایک جھٹکے سے اُٹھ کر جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ طارق جھنجھوڑ کر نیلم کو جگانے لگا۔ نیلم اس طرح جگائے جانے سے بدحواس سی ہوگئی تھی۔ جب طارق نے اُسے بھارتی فوجیوں کے بارے میں بتایا تو اُس کے ذہن پر طاری نیند کا سارا خمار اُڑ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گئی اور بکھرے ہوئے تمام کمبل اُٹھا کر ایک کونے میں ڈال دیئے۔ دو منٹ بعد گلریز واپس آ گیا۔

''اپنی چیزیں سمیٹو..... جلدی کرو! پہاڑ کی دراڑ میں۔'' گلریز نے کہا۔

اُن تینوں نے اپنی اپنی رائفلیں اُٹھا لیں اور رینگتے ہوئے پہاڑی دراڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ گلریز نے بوڑھے چرواہے کو کچھ ہدایات دے دی تھیں۔ اُس نے سب سے پہلے بھیڑوں والے باڑے کا دروازہ کھول دیا اور پھر لکڑیاں جمع کرنے لگا۔

پہاڑ کی وہ دراڑ تقریباً دو فٹ چوڑی تھی۔ سب سے پہلے نیلم اندر داخل ہوئی، پھر طارق اور آخر میں گلریز..... یہ دراڑ تقریباً دس فٹ تک سیدھی چلی گئی تھی، پھر دائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ چھ سات منٹ کے بعد یہ دراڑ پھر بائیں طرف مُڑ گئی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، دراڑ مزید تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ مزید آگے بڑھنے کے لئے اُن کے جسم دیواروں کے ساتھ بری طرح رگڑ کھانے لگے۔ اس جگہ دراڑ تقریباً ایک فٹ چوڑی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اُس جگہ سے نکل سکے تھے۔ آگے چل کر یہ دراڑ ایک دم کشادہ ہوگئی۔ اور آخر کار وہ ایک کشادہ غار میں پہنچ گئے۔ اس غار میں گھٹن کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ دائیں طرف ایک جگہ بہت مدھم سی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

''یہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔'' گلریز نے کہا۔ ''فوجی اوّل تو دراڑ میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اگر اُن میں سے کوئی دراڑ میں داخل ہوا بھی تو زیادہ آگے نہیں بڑھے گا۔ تم لوگ یہیں رُکو! میں دیکھتا ہوں۔ اُس طرف شاید کوئی راستہ ہے۔''

گلریز، غار کے اُس حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر

وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ پھر اُوپر دیکھا۔ اُس کے سر کے عین اُوپر کافی بلندی پر چٹان میں ایک چھوٹا سا دہانہ نظر آ رہا تھا جیسے چھت میں کوئی روشندان ہو۔ یہ روشنی وہیں سے آ رہی تھی۔ اگر سورج سر پر ہوتا تو دُھوپ کی کرنیں بھی غار میں آ سکتی تھیں۔

گلریز اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسے دائیں طرف ایک تنگ سا راستہ نظر آیا۔ وہ اُس راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ تنگ سا راستہ آخر کار کھلی جگہ پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ یہ جگہ جھونپڑے سے تقریباً پچیس فٹ بلند تھی اور یہاں سے چرواہے کا جھونپڑا اور نشیب میں دُور تک پھیلی ہوئی وادی صاف نظر آ رہی تھی۔ لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ جھونپڑے یا کسی اور جگہ سے غار کے اُس دہانے کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ سامنے موجود ایک بہت بڑے چٹانی پتھر سے دہانہ چھپ گیا تھا۔

اچانک ایک چیخ سن کر گلریز چونک گیا..... اُس نے چٹانی پتھر کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ بوڑھا چرواہا، پشت کے بل زمین پر پڑا تھا اور ایک فوجی دونوں ہاتھوں سے پوری قوت کے ساتھ اُس کا دایاں پیر مروڑ رہا تھا۔ دو فوجیوں نے بوڑھے کو گرفت میں لے رکھا تھا جبکہ چوتھا فوجی اُن کے قریب کھڑا تھا۔ بوڑھے کا چہرہ اور لباس لہولہان ہو رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ چند منٹ میں اُس پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا۔ وہ لوگ، بوڑھے کی چیخوں کی آواز غالباً اس لئے نہیں سن سکے تھے کہ وہ پہاڑ کے اندر تھے اور باہر کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

بوڑھے کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ اُس کا پیر چھوڑ دیا گیا۔ غالباً اُس سے کوئی سوال پوچھا گیا تھا جس پر بوڑھا زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ ایک فوجی نے رائفل کا رُخ بوڑھے کے سینے کی طرف کر دیا۔ بوڑھا اس وقت بھی نفی میں سر ہلاتا رہا۔ اور پھر فائر کی آواز سے فضا گونج اُٹھی..... بھارتی فوجی کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی نے بوڑھے کشمیری کے سینے میں شگاف ڈال دیا تھا۔

گلریز یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اُس نے بھارتی فوجیوں کی طرف دیکھا۔ وہ چاروں ایک جگہ جمع تھے اور جھونپڑے سے نکالے ہوئے سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔ گلریز نے اپنی سب مشین گن سیدھی کر لی اور دانت کچکچاتے ہوئے فائر کھول دیا۔ بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے یا بھاگنے کا موقع تک نہیں مل سکا۔ فائرنگ کے ساتھ اُن چاروں کی چیخیں فضا میں گونجیں اور وہ چاروں ڈھیر ہو گئے۔

گلریز دوبارہ غار میں اُتر گیا۔ اُس نے طارق اور نیلم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور وہ تینوں غار سے باہر آ گئے۔ بھارتی فوجیوں کی وردیاں اُتار کر اُن کی لاشیں ایک گہرے کھڈ میں

ڈھکیل دی گئیں۔ اور بوڑھے کی لاش کو جھونپڑے کے قریب ہی دفن کر دیا گیا۔

''تم لوگ یہ وردیاں پہن لو! ہم لوگ شام کے وقت اننت ناگ میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ میں جیپ کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔ تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکیں۔'' گلریز نے کہا اور تیزی سے ڈھلان پر اُترتا چلا گیا۔

گلریز تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس دوران نیلم اور طارق، پہاڑ کی کھوہ میں چھپے رہے۔ گلریز کو آتے دیکھ کر وہ سامنے آ گئے۔

''میں نے جیپ کو ایک ایسی جگہ چھپا دیا ہے، جہاں اُن کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن تم لوگوں نے وردیاں نہیں پہنیں۔'' گلریز نے کہا۔

''یہاں سے نکلنا تو شام کو ہے۔ روانگی سے پہلے پہن لیں گے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....!'' گلریز یہ کہتے ہوئے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اُنہیں بوڑھے چرواہے کی موت کا بے حد افسوس تھا جس نے اپنی جان دے دی تھی لیکن بھارتی فوجیوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ تینوں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ دیر تک بوڑھے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ نشیب میں بھی دیکھ لیتے جہاں چٹانوں کے پیچھے بستی سے اب بھی دُھواں اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

دوپہر بیت گئی۔ چار بجے کے قریب وہ چرواہے کے جھونپڑے سے نکل آئے۔ اُنہوں نے اپنے کپڑوں کے اُوپر ہی بھارتی فوجی وردیاں چڑھا لی تھیں۔ نشیب میں ایک جگہ وہ رُک گئے۔ گلریز نے اُنہیں وہیں انتظار کرنے کو کہا اور خود دوڑتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ جیپ پر واپس لوٹا۔ نیلم اور طارق پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور جیپ، سڑک پر آ کر اننت ناگ کی طرف دوڑنے لگی۔ نیلم اور طارق نے سب مشین گنیں سنبھال رکھی تھیں۔ جبکہ گلریز کی سب مشین گن اُس کے قریب ہی دوسری سیٹ پر پڑی تھی جسے وہ آسانی سے کسی بھی لمحے اُٹھا سکتا تھا۔

جیپ کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اندیشہ اس بات کا تھا کہ راستے میں کشمیری مسلمان اُنہیں بھارتی فوجی سمجھ کر اُن پر حملہ نہ کر دیں۔ بوڑھے چرواہے کے جھونپڑے سے اننت ناگ کا فاصلہ تین میل تھا۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں شہر کی بیرونی چوکی پر پہنچ گئے۔ یہاں فوج نے راستہ بلاک کر رکھا تھا۔ شہر میں مختلف مقامات سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چوکی پر فوجی محافظوں نے اُنہیں روک لیا۔

''آپ شہر میں مت جائیے سر!'' ایک محافظ نے گلریز کے جسم پر لیفٹیننٹ کی وردی دیکھ کر سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں جگہ جگہ ہنگامے ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے کرفیو کا وقفہ ختم

کر دینا پڑا۔ اس کے باوجود فسادی، ہنگامہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے کہ ہم فسادیوں سے ڈر کر اپنی ڈیوٹی نہ دیں.....؟'' گلریز بولا۔

''نو سر.....! میرا مطلب یہ نہیں۔'' وہ فوجی گڑبڑا گیا۔

''تو پھر ہٹاؤ بیریئر!'' گلریز نے بارُعب لہجے میں کہا۔ ''ہمیں شہر کے مرکزی بازار میں پہنچنے کا حکم ملا ہے۔''

''یس سر.....!'' فوجی نے سلیوٹ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اُنہوں نے فوراً ہی سڑک پر سے رُکاوٹ ہٹا دی۔

گلریز نے ایک زوردار جھٹکے سے جیپ کو آگے بڑھا دیا۔ پہلا بڑا چوراہا عبور کرتے ہی اُس نے جیپ کو تیزی سے ایک چھوٹی سی سڑک پر گھما دیا۔ چوراہے سے ذرا آگے بڑی سڑک پر بھارتی فوجیوں اور کشمیری مجاہدین میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

''تم لوگ وردیاں اُتار کر سیٹوں سے نیچے جھک جاؤ!'' گلریز نے جیپ کو ایک اور سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔

نیلم اور طارق نے اُس کی ہدایت پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جیپ تیزی سے مختلف سڑکوں پر گھومتی رہی۔ ہنگامے پورے شہر میں تھے۔ مرکزی چوراہے پر سب سے زیادہ شور تھا۔ فائرنگ کی زیادہ آوازیں اُسی طرف سے آ رہی تھیں۔ شہر میں کئی جگہوں سے دُھواں بھی اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ایک جگہ وہ مجاہدین کے گھیرے میں آتے آتے رہ گئے۔ اُن کی قسمت ہی اچھی تھی کہ وہ بچ نکلے تھے۔ اگر مجاہدین کی طرف سے پھینکا ہوا پٹرول بم جیپ پر گرتا تو جیپ کے ساتھ اُن کے بھی پرخچے اُڑ جاتے۔ گلریز نے ایک گلی کے موڑ پر جیپ روک لی۔ اُس نے ایک منٹ کے اندر اندر اپنی یونیفارم اُتار کر پھینک دی اور ساتھ والی سیٹ سے سب مشین گن اُٹھا کر جیپ سے چھلانگ لگا دی۔ نیلم اور طارق بھی جیپ سے اُتر آئے تھے۔ وہ تینوں تیزی سے گلی میں دوڑنے لگے۔ تقریباً بیس گز آگے ایک اور گلی کے موڑ پر اُنہیں رُک جانا پڑا۔ موڑ کے دوسری طرف والی گلی سے بہت سے لوگوں کے دوڑنے، چیخنے اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد پندرہ بیس آدمی اُس گلی سے نکل کر دوڑتے ہوئے سامنے آ گئے۔ وہ سب کشمیری تھے۔ اُسی شہر کے رہنے والے..... اُنہوں نے یہیں کی مٹی سے جنم لیا تھا۔ انہی گلیوں میں کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ اور اب یہی زمین اُن پر تنگ کی جا رہی تھی۔ اُن میں سے کوئی بھی اٹھارہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ کسی کے ہاتھ میں ہاکی تھی تو کسی کے ہاتھ میں چھڑی۔ ہاکیوں اور

چھڑیوں کے علاوہ کسی کے پاس کوئی اور ہتھیار نہیں تھا۔ بھارتی فوجی فائرنگ کرتے ہوئے اُن کے تعاقب میں آ رہے تھے۔

گلریز نے نیلم اور طارق کو اشارہ کیا اور وہ تینوں دوڑتے ہوئے موڑ پر آ گئے۔ دوسری گلی میں دو کشمیری نوجوان زخمی پڑے چیخ رہے تھے۔ اور کم از کم سات بھارتی فوجی آٹومیٹک رائفلیں سنبھالے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اُن بھیڑیوں کو دیکھتے ہی گلریز، طارق اور نیلم نے فائر کھول دیا۔ آن کی آن میں وہ تمام فوجی خون میں لت پت زمین پر گرے اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ختم ہو گئے.....

گلی میں دوڑتے ہوئے کشمیری نوجوان رُک گئے تھے۔ وہ واپس پلٹے۔ اُن میں سے کچھ نے بھارتی فوجیوں کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا، کچھ نے اپنے زخمی ساتھیوں کو اُٹھایا اور ساتھ والی گلی میں دوڑتے چلے گئے۔

نیلم اور طارق بھی گلریز کے پیچھے مختلف گلیوں میں دوڑتے رہے۔ یہ شہر کا قدیم علاقہ تھا۔ گلیاں خاصی پُرپیچ تھیں۔ کہیں اُنہیں بلندی پر چڑھنا پڑتا اور کہیں نشیب میں اُترنا پڑتا۔ آخرکار وہ ایک ایسی تنگ سی گلی میں داخل ہو گئے جو آگے جا کر ختم ہو گئی تھی۔ گلی کے اختتام پر ایک ٹیلہ سا تھا جس پر پہنچنے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ اُس ٹیلے پر بھی مکان بنے ہوئے تھے۔ گلریز ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ اُس نے دروازے پر مخصوص انداز میں تین مرتبہ دستک دی۔ اس کے فوراً ہی بعد دروازہ کھل گیا اور وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا تھا.....

☆

شہر میں تین دن تک خون ریز ہنگامے جاری رہے۔ گلی کوچوں میں مسلح بھارتی فوجی دستوں سے جھڑپوں میں بہت سے کشمیری مسلمان شہید اور درجنوں زخمی ہو چکے تھے۔ جبکہ مختلف مقامات پر بیسیوں بھارتی فوجی، مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے۔

گلریز، نیلم اور طارق کو اس مکان میں چھوڑ کر اُسی رات غائب ہو گیا تھا۔ اُس مکان میں ایک ستر سالہ بوڑھے کے علاوہ دو عورتیں تھیں۔ بوڑھے کا نام عثمان تھا۔ وہ اگرچہ خاصا بوڑھا تھا، لیکن اُس کا حوصلہ جوانوں سے زیادہ بلند تھا۔ عورتوں میں سے ایک کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ عثمان کی بہو رضیہ تھی جس کا شوہر دو سال پہلے بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو چکا تھا۔ دوسری عورت کا نام غزالہ تھا۔ اُس کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ بوڑھے عثمان کی بیٹی تھی جس کی منگنی ہو چکی تھی۔ لیکن اُس کا منگیتر پچھلے چند مہینوں سے لاپتہ

تھا۔ اُس کے بارے میں وقتاً فوقتاً مختلف باتیں سننے میں آتی رہتی تھیں۔ کبھی تو یہ سننے میں آتا کہ وہ بھارتی فوجیوں کی قید میں ہے اور اُسے چند دیگر مجاہدین کے ساتھ کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا ہے۔ کبھی یہ سننے میں آتا کہ اُسے تشدد کر کے شہید کیا جا چکا ہے۔ غزالہ کو بہرحال! یقین تھا کہ اُس کا منگیتر زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور واپس آئے گا۔

تین دن سے اگرچہ شہر میں کسی وقفے کے بغیر کرفیو جاری تھا۔ لیکن اس کے باوجود شہر کے مختلف علاقوں میں ہنگامے بھی جاری رہے تھے۔ کرفیو یا کوئی اور قانون اب ان کشمیری مجاہدین کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا طوفان بن چکے تھے، جسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

گلریز کے جانے کے بعد اُس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ طارق نے اس دوران باہر نکلنے کی کوشش کی تھی، مگر بوڑھے عثمان نے اُسے سختی سے روک دیا تھا۔

''گلریز، مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔'' عثمان نے کہا۔ ''تمہارا زندہ سلامت سرینگر پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ تمہاری حفاظت ہم پر فرض ہے۔ ایک دو دن رُک جاؤ! حالات پُرسکون ہوتے ہی تمہیں سرینگر روانہ کر دیا جائے گا۔''

طارق گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ عثمان سے کوئی بحث نہیں کر سکتا تھا۔ اگر نیلم اُس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ عثمان کو بتائے بغیر چپکے سے نکل جاتا۔ سرینگر کے راستے اُس کے لئے اجنبی نہیں تھے۔ اُس کی تو زندگی ہی اس وادی کے نشیب و فراز میں گھومتے ہوئے گزری تھی۔ وہ نیلم کی وجہ سے مجبور تھا۔ نیلم کو بحفاظت گلمرگ پہنچانا اُس کی ذمہ داری تھی۔ وہ اُسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ چوتھے دن کی شام تھی۔ اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ رضیہ آنگن کے ایک کونے میں چولہے کے پاس بیٹھی کھانا تیار کر رہی تھی۔ غزالہ اور نیلم قریب ہی ایک جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ عثمان بابا گھر پر نہیں تھے۔ طارق چھت پر تھا۔ اُس دو منزلہ مکان کی تعمیر میں زیادہ تر لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ اُوپر کی منزل تو مکمل طور پر لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ نیلم، رات کو نیچے غزالہ کے کمرے میں سوتی تھی۔ جبکہ طارق کو اُوپر کی منزل پر کمرہ دے دیا گیا تھا۔ اُوپر بھی دو کمرے تھے اور اُن کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ طارق اپنے کمرے میں بیٹھا ریڈیو پر کوئی ایسا سٹیشن سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں سے خبریں آ رہی ہوں۔ لیکن اُس وقت شاید کسی بھی سٹیشن پر خبروں کا پروگرام نہیں تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا قدرے آگے کو جھکا میز پر رکھے ہوئے ریڈیو کا بٹن گھما رہا تھا کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... دھماکہ اس قدر زوردار تھا کہ فضا تک لرز اُٹھی۔ مکان کی دیواریں یوں لرز اُٹھیں جیسے اُس کے اُوپر آ گریں گی۔

یوں لگتا تھا، جیسے یہ دھماکہ بہت قریب ہوا ہو۔ طارق دوڑ کر کمرے سے نکل آیا اور صحن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آس پاس بھی دو منزلہ مکان تھے۔ وہ تختوں کی سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا اپنے کمرے کی چھت پر پہنچ گیا۔

دائیں طرف غالباً شہر کے مرکزی چوراہے سے شعلوں اور دُھویں کے بادل اُٹھتے نظر آ رہے تھے۔ دھماکے کی بازگشت اگرچہ ختم ہو چکی تھی لیکن فائرنگ کی آوازوں سے فضا ابھی تک گونج رہی تھی۔ طارق چھت پر کھڑا تشویش آمیز نگاہوں سے شعلوں اور دُھویں کے بادلوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چھت سے اُتر کر نچلے صحن میں آ گیا۔ غزالہ وغیرہ بھی کچھ بدحواس سی نظر آ رہی تھیں۔

''کیا ہوا..... یہ دھماکہ کہاں ہوا ہے.....؟'' رضیہ نے پوچھا۔

''دھماکہ غالباً مرکزی چوراہے پر ہوا ہے۔ شعلے اور دُھواں اُسی طرف سے اُٹھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔'' طارق نے بتایا۔

''خدا خیر کرے۔ ایسا زبردست دھماکہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔'' رضیہ بولی۔

''میں معلوم کر کے آتا ہوں۔'' طارق نے کہا اور اُوپر اپنے کمرے سے اپنی سب مشین گن لے آیا۔ اُس نے بیرونی دروازے کی طرف دو تین قدم ہی اُٹھائے تھے کہ گلی میں دوڑتے ہوئے قدموں اور شور کی آوازیں سنائی دیں..... اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بھی گونجنے لگی تھیں۔

رضیہ ایک جھٹکے سے چولہے کے سامنے سے اُٹھ گئی۔ غزالہ دوڑ کر اندر سے رائفلیں نکال لائی۔ اُس نے ایک رائفل نیلم کے ہاتھ میں تھما دی اور ایک رضیہ کی طرف اُچھال دی۔ رضیہ نے بڑے ماہرانہ انداز میں رائفل کو ہوا ہی میں پکڑ لیا۔ ٹھیک اُسی لمحے دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو نوعمر لڑکے اندر داخل ہوئے۔ اُن میں سے ایک کی عمر سولہ اور دوسرے کی اٹھارہ سال کے قریب رہی ہو گی۔ اُن میں سے ایک کے پاس پستول تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خنجر.....

''کیا ہوا فضل.....! یہ دھماکہ کہاں ہوا تھا؟'' رضیہ نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ وہ یقیناً اُن دونوں کو جانتی تھی۔

''ہم نے..... ہم نے.....'' فضل ہانپتے ہوئے بولا۔ ''فوج کے اسلحے کا ڈپو اُڑا دیا ہے۔ آج رات فوج نے شہر کے مرکزی چوراہے پر بہت بڑا مورچہ بنا کر وہاں گولہ بارود کے انبار لگا دیئے تھے۔ ہم صبح ہی سے موقع کی تاک میں تھے۔ اور آخر کار اس وقت ہمیں موقع مل گیا۔ صادق اور اسمٰعیل بھارتی فوج کی فائرنگ سے شہید ہو گئے ہیں۔ رحمت، رشید اور اکرم دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ میں اور ابراہیم اس طرف آ گئے۔ تین چار فوجی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔''

طارق دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ صرف سات نوعمر لڑکوں نے بھارتی فوج کے اسلحے کا ڈپو اڑا دیا تھا۔ یہ سب کے سب نوعمر تھے۔ لیکن اُن کا جذبہ جہاد جوان تھا۔ اُنہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا جس کے لئے شیر کا جگر چاہئے۔ طارق یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ کیا اس قوم کو طاقت کے بل بوتے پر غلام بنا کر رکھا جا سکتا ہے، جس کے نوعمر لڑکے بھی سر پر کفن باندھے آتش نمرود میں کود پڑنے کو ہر وقت تیار رہتے ہوں؟ اُسے فخر تھا کہ یہ اُس کی قوم کے بچے تھے۔

''تم لوگ یہیں رُکو! میں باہر جا رہا ہوں۔'' طارق دروازے کی طرف لپکا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' فضل نے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ رضیہ نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اپنی رائفل اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر وہ دوڑ کر کمرے سے ایک اور رائفل لے آئی۔ غزالہ اور نیلم دوڑتی ہوئی اُوپر کی منزل پر چلی گئیں۔ ایک کمرے کے سامنے گلی کی طرف تین فٹ چوڑی بالکونی نکلی ہوئی تھی۔ وہ اس بالکونی میں مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئیں۔ یہاں سے گلی پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ رضیہ نے دوسرے لڑکے کے ساتھ مل کر نچلے دروازے پر مورچہ سنبھال لیا تھا۔

طارق اور فضل گلی میں نکل آئے۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر تمام گھروں کے دروازے بند ہو گئے تھے اور گلی سنسان ہو گئی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن تاریکی اتنی گہری نہیں تھی کہ چند گز کے فاصلے تک نہ دیکھا جا سکتا۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے اُس جگہ پہنچ گئے جہاں دوسری گلی میں جانے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ وہ سیڑھیوں پر رُک گئے اور متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

''فوجی یہیں کسی گلی میں ہوں گے۔ وہ شاید ہمیں اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھ سکے تھے۔'' فضل نے کہا۔

طارق ابھی کوئی جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ نشیبی گلی کے ایک مکان سے نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ چیخوں کی وہ آوازیں کم از کم دو عورتوں کی تھیں۔ طارق اور فضل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اُترتے چلے گئے۔ نیچے اُترتے ہی وہ دائیں طرف کی گلی میں مُڑ گئے۔

چیخوں کی آوازیں اسی گلی کے تیسرے مکان سے آ رہی تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ طارق سب مشین گن سنبھالے دندناتا ہوا اندر گھس گیا..... وہ تین بھارتی فوجی تھے۔ اُن میں سے دو تو دو نوجوان لڑکیوں کو گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک لڑکی کی عمر تیرہ اور دوسری کی سولہ سترہ برس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اُن دونوں کے لباس تار تار ہو چکے تھے اور وہ تقریباً

برہنہ ہو رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا مرد ایک کونے میں کھڑے چیخ رہے تھے۔ تیسرے فوجی نے اُنہیں آٹومیٹک رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔

''انہیں چھوڑ دو کتو.....!'' طارق دھاڑا۔

تیسرے بھارتی فوجی نے بدحواس ہو کر فائر کھول دیا۔ اُسے شاید اس مداخلت کی توقع نہیں تھی۔ اُس کی سب مشین گن سے نکلے ہوئے برسٹ نے بوڑھے کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ طارق نے اُس فوجی کو باڑ پر رکھ لیا جس نے بوڑھے کا جسم چھلنی کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا جسم بھی چھلنی ہو چکا تھا۔ دوسرے فوجی بھی لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنی اپنی رائفلیں سنبھالنے لگے۔ اُن میں سے ایک تو طارق کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ لیکن دوسرا چھلانگ لگا کر دروازے کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ طارق سنبھلتا، بھارتی فوجی دروازے کے باہر گلی میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ لیکن باہر فضل موجود تھا۔ بھارتی فوجی کو چند قدم سے زیادہ بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ فضل کی رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے اُسے چھلنی کر دیا۔ فضل نے دوڑ کر اُس کی رائفل اُٹھا لی۔

دونوں لڑکیاں زمین پر پڑی ابھی تک چیخ رہی تھیں۔ طارق نے آگے بڑھ کر باری باری اُن دونوں کو اُٹھایا۔ ''جب تک تمہارے بھائی زندہ ہیں، کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ جاؤ! اندر جا کر کپڑے پہن لو۔'' طارق نے کہا۔

لڑکیوں نے ابھی تک بوڑھے کی لاش کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کمرے میں جانے کے لئے جیسے ہی مُڑیں، اُن کی نظریں لاش پر پڑ گئیں۔ وہ چیخ کو بوڑھے کی لاش سے لپٹ گئیں۔ طارق نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح گم صم کھڑی تھی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ طارق باہر کی طرف دوڑ گیا۔ اُس نے پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹا کر اُنہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ فوراً ہی کچھ عورتیں اس گھر میں پہنچ گئیں۔ گلی کے لوگ بھی اس گھر کے سامنے جمع ہونے لگے۔ بھارتی فوجیوں کی لاشیں اُٹھا کر باہر گلی میں ڈال دی گئیں جنہیں چند نوجوان اُٹھا کر لے گئے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ طارق وہیں کھڑا تھا۔ پھر ایک نوجوان نے وہاں پہنچ کر اطلاع دی کہ بھارتی فوج کا ایک دستہ اسی طرف آ رہا ہے۔ اُس علاقے کے لوگوں نے ہر گلی کے موڑ پر مورچے سنبھال لئے۔ نوجوانوں نے طارق اور فضل کے ہاتھوں مرنے والے تینوں فوجیوں کی لاشیں گلیوں کے باہر سڑک پر ڈال دی تھیں۔

بھارتی فوجی دو ٹرکوں پر آئے تھے۔ ٹرک، سڑک پر رُک گئے۔ فوجیوں نے جب ہر گلی میں کیمریوں کو مورچہ بند دیکھا تو اُنہوں نے خاموشی سے اپنے ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا کر ایک ٹرک

میں ڈالیں اور واپس چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی فضا نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی فلک شگاف آوازوں سے گونج اُٹھی۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ کم از کم شہر کے اس علاقے میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ کشمیری مسلمان رات بھر گلیوں میں مورچہ بند ہو کر بیٹھے رہے اور بھارتی فوجیوں کو اُن کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

علی الصبح عثمان بابا گھر پہنچ گیا۔ وہ کل شام سے پہلے شہر کے دوسرے علاقے میں گیا تھا اور اس طرف ہنگامہ ہونے کی وجہ سے واپس نہیں آ سکا تھا۔

شہر میں ہنگامے آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگے۔ تین دن اور گزر گئے۔ اب کرفیو میں وقفہ بھی دیا جانے لگا تھا۔ ایک روز گلریز بھی واپس آ گیا۔ اُس کے کہنے کے مطابق وہ بٹا کوٹ گیا ہوا تھا۔ گلریز اُسی روز نیلم اور طارق کو لے کر بٹا کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہنگامے پوری وادی میں ہو رہے تھے۔ کشمیر کا کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں بھارتی فوجی آگ و خون کا کھیل نہ کھیل رہے ہوں۔ بے گناہ کشمیریوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ لیکن پینتالیس سال بعد پہلی مرتبہ کشمیری مسلمانوں نے بھی پوری قوت سے اپنی ہستی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پوری شد و مد کے ساتھ بھارتی پولیس اور فوجیوں کے مظالم کا سامنا کر رہے تھے۔ اب وہ ہندوؤں کے لئے تر نوالہ بننے کو تیار نہیں تھے۔

بٹا کوٹ میں بھی ہنگامے ہو رہے تھے۔ یہاں بھی کشمیری مسلمان کرفیو کی پابندیاں توڑ کر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ فوج کے ساتھ جھڑپوں میں صرف بٹا کوٹ شہر میں چھ مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے تھے۔ بھارتی فوجی بربریت کا بدترین مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ اندھا دُھند فائرنگ کرتے ہوئے ہنگاموں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ شاید اس حقیقت کو بھول گئے تھے کہ ہر موقع پر بے جا طاقت کا استعمال خود اپنے لئے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ طاقت کے اس بے جا استعمال سے بھارتی فوجی خود بھی نقصان اُٹھا رہے تھے۔ کشمیری مسلمان اب طاقت کا جواب طاقت سے دے رہے تھے۔ صرف بٹا کوٹ شہر میں صبح سے شام تک گیارہ بھارتی فوجی، کشمیری مجاہدین کے ہاتھوں کتے کی موت مارے جا چکے تھے۔

بٹا کوٹ میں رات کو بھی ہنگامے جاری رہے۔ رات کے آخری پہر مجاہدین نے شہر سے چند میل دُور اُس بھارتی فوجی قافلے پر حملہ کر دیا، جو سرینگر سے آ رہا تھا۔ اُس قافلے میں پانچ بڑے ٹرک اور دو جیپیں شامل تھیں۔ دو ٹرکوں میں گولہ بارود اور تین میں فوجی تھے۔ جیپوں میں بھی چھ چھ فوجی سوار تھے۔ یہ قافلہ جیسے ہی ایک تنگ سے پہاڑی درے میں داخل ہوا، پہلے سے گھات لگا

بیٹھے ہوئے مجاہدین نے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے قافلے پر حملہ کر دیا..... یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے تک کا موقع نہیں مل سکا۔ مجاہدین کے اس حملے میں دونوں ٹرکوں پر لدے ہوئے گولہ بارود کا ذخیرہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ جبکہ سات فوجی بھی جہنم واصل ہو گئے۔ مجاہدین اپنی کارروائی مکمل کرتے ہی رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے تھے۔

بٹا کوٹ میں اُنہوں نے چند گھنٹے ہی قیام کیا۔ اور پھر سوتور کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ ایسے دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے، جہاں بھارتی فوجی دستوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ نہیں تھا۔

سرینگر سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع سوتور شہر بھی ہنگاموں کی لپیٹ میں تھا۔ وہ لوگ شام کے وقت شہر کے نواح میں پہنچے تھے۔ اندھیرا پھیلنے تک وہ جنگل میں چھپے رہے اور پھر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی شہر میں داخل ہو گئے۔ اُنہیں شہر میں زیادہ اندر تک نہیں آنا پڑا۔ اُن کی منزل وہ مکان تھا، جو ایک پہاڑی ڈھلان پر واقع تھا۔ مکان ایک مسطح چٹان پر بنایا گیا تھا۔ چٹان کی دو دیواریں عمودی چٹان پر مشتمل تھیں۔ مکان کی تعمیر سے پہلے اُن چٹانی دیواروں کو تراش کر ہموار کر لیا گیا تھا۔ اس مکان کی تعمیر میں بھی زیادہ تر لکڑی ہی استعمال کی گئی تھی۔ اور یہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس کے آس پاس اور بھی مکان تھے۔ اُن ٹیلوں سے نشیب میں شہر کی طرف آمد و رفت کے لئے ڈھلوانی راستے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چٹانوں کو کاٹ کر پیلی سیڑھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔

وہ مکان کے ایک کمرے میں پہنچے تو وہاں پانچ چھ آدمیوں کو دیکھ کر طارق چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اُن میں تین کو تو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اُس کے لبریشن فرنٹ کے ساتھی تھے۔ دو سے اُس کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن ایک چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح اُچھل پڑا۔ وہ رحمان بابا تھا..... لبریشن فرنٹ کا سربراہ..... رحمان بابا کا نام فرنٹ کی اکثر مہمات اور آپریشنز کے ہیڈ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

رحمان بابا کی عمر اسّی سے کچھ اُوپر ہی تھی۔ سفید داڑھی، سر کے بال سفید اور بھویں تک برف کی طرح سفید تھیں۔ لیکن اس عمر میں بھی اُس کی صحت قابل رشک تھی۔ چہرے پر سیب کی سی سرخی اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی جن سے عزم و ولولہ جھلکتا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم سے اب تک رحمان بابا کی زندگی اپنے وطن کی آزادی کے لئے جہاد کرتے ہوئے گزری تھی۔ اُس کے جسم پر زخموں کے لاتعداد نشان تھے۔ زخموں کے یہ نشان رحمان بابا کے لئے بہادری اور

شجاعت کے وہ تمغے تھے، جنہیں وہ بڑے فخر سے دکھایا کرتا تھا۔

رحمان بابا نے آگے بڑھ کر طارق کو سینے سے لگا لیا۔ ''تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہو رہی ہے طارق!'' وہ بولا۔ ''تم نے دہلی میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ کشمیر کی آزادی کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ اور بیٹی.....!'' اُس نے طارق کو ہٹا کر نیلم کو سینے سے لگا لیا۔ ''دخترانِ کشمیر کو تم پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ جس قوم میں تم جیسی بیٹیاں ہوں، اُسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔''

کمرے میں موجود دوسرے مجاہدین نے بھی طارق سے بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا اور نیلم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اودھم پور میں تم دونوں نے فوجی چوکی جس طرح تباہ کی تھی، وہ قابل تعریف ہے۔'' ایک مجاہد نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق اور نیلم خاموش رہے۔ اس دوران قہوہ آ گیا۔ اور وہ لوگ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے تازہ ترین صورتِ حال پر گفتگو کرتے رہے۔ اور آخر کار دس بجے کے قریب یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ رحمان بابا نے ان تمام مجاہدین کو صبح آٹھ بجے اسی مکان میں طلب کر لیا تھا۔ تاکہ آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔

طارق اور نیلم کے لئے اسی مکان میں رات گزارنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ رحمان بابا بھی یہیں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ ایک اندرونی کمرے میں آ گئے۔ اُن کا میزبان طاہر علی بھی اُن کے ساتھ تھا۔ طارق نے وہ کاغذات نکال کر رحمان بابا کے سامنے رکھ دیئے جنہیں اُس نے اب تک اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا ہوا تھا۔

''ان کاغذات کا مطالعہ میں بعد میں اطمینان سے کروں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ! کہ اُن کی پلاننگ کیا ہے؟'' رحمان بابا نے کہا۔

''بھارت کی حکومت نے دراصل دو طرح کی پلاننگ کی ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''ایک منصوبہ ان کاغذات میں ہے۔ اور یہ کاغذات حاصل کرنے کے لئے نیلم نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر نیلم نہ ہوتی تو یہ کاغذات ہمیں کبھی نہیں مل سکتے تھے۔''

''مجھے نیلم کی کارکردگی پر فخر ہے۔ اس کی ذہانت اور جذبہ جہاد سے متاثر ہو کر ہی میں نے پانچ سال پہلے اسے دہلی بھیجا تھا۔ مجھے اسی وقت یقین تھا کہ نیلم ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔'' رحمان بابا نے کہا۔

''اور دوسرا منصوبہ بھارت نے اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کے تعاون سے شروع کیا ہے؟''

ں کی تفصیل ان کاغذات میں موجود ہے۔'' طارق نے کاغذات کی طرف اشارہ کیا۔ ''دہلی میں سرائیلی انٹیلی جنس موساد کے تعاون سے قائم ہونے والے ٹریننگ کیمپ کی تباہی کے بعد اگرچہ بھارت اور اسرائیل نے اس منصوبے کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن درحقیقت! چند تبدیلیوں کے ساتھ اُن کا یہ منصوبہ تیاری کے مرحلے طے کرتا رہا۔ یہ کاغذات حاصل کرنے میں دہلی کے گلاب دین نامی ایک مسلمان نوجوان نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ لیکن افسوس! کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ میرے اور نیلم کے دہلی سے فرار کے بعد پولیس نے شاہ رُخ کے اڈے پر چھاپہ مارا تھا تو گلاب دین بھی پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔

''مجھے اس سلسلے میں تمام تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔'' رحمان بابا نے کہا۔ ''ہمیں اپنے اُن ساتھیوں کے بچھڑنے کا افسوس ہے۔''

''بہرحال.....!'' طارق نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''نیلم کے ذریعے حاصل ہونے والے کاغذات میں جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے، اس کے مطابق بھارت کی حکومت وادی کشمیر میں تھرڈ آپریشن کے نام سے ایک نئی سازش کو عملی جامہ پہنانے والی ہے۔ یہ تو ساری دنیا ہی جانتی ہے کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادیں ہی وہ مضبوط بنیادیں ہیں جن کی وجہ سے مسئلہ کشمیر اب تک زندہ ہے۔ لیکن اب بھارت ان قراردادوں سے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ بھارت نے اپنے حامی امریکی اور مغربی ممبرانِ پارلیمنٹ کے ذریعے اقوامِ متحدہ کی ان قراردادوں کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع کر رکھی ہے۔ دوسری طرف کشمیر میں بھی تھرڈ آپریشن کے نام سے مہم شروع کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ اس تھرڈ آپریشن کا مقصد یہ ہے کہ پاکستانیوں اور کشمیریوں کا ایک ایسا طبقہ تیار کیا جائے جو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے دستبرداری کی مہم چلائے اور خودمختار کشمیر کا نعرہ بلند کیا جائے۔ بھارت اس تھرڈ آپریشن کے ذریعے جو مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے، ان میں خاص خاص یہ ہیں۔ نمبر ایک..... مسئلہ کشمیر پر پاکستانی اور کشمیریوں کی یکسوئی کو متاثر کیا جائے۔ نمبر دو..... کشمیریوں کی تحریک جہاد کو مسلم اُمہ کے جہاد کی بجائے نیشنلزم کی تحریک میں بدل دیا جائے۔ تاکہ پوری دنیا کے مسلمان اس جہاد میں حصہ لینے سے محروم ہو جائیں اور کشمیری مسلمان تنہا رہ جائیں۔ نمبر تین..... کشمیریوں کی جہادی اور سیاسی قیادت کو باہم دست و گریباں کر دیا جائے۔ اور نمبر چار..... کشمیریوں کو پاکستان کی مدد سے محروم کر دیا جائے۔ جب کشمیری عوام علیحدگی کی بات کریں گے تو پاکستان کے عوام سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ وہ کشمیریوں کی مدد کیوں کریں؟ یہ ہیں وہ مقاصد جو بھارت تھرڈ آپریشن کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' رحمان بابا نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے اس منصوبے ''تھرڈ آپریشن'' پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔ ہمارے بعض لیڈر نادانستہ طور پر اور بعض بھارت کے آلہ کار بن کر خود مختار کشمیر کا نعرہ بلند کر چکے ہیں۔ یہ وہ لیڈر ہیں جو ڈیڑھ اینٹ کی اپنی اپنی مسجدیں الگ بنائے بیٹھے ہیں۔ اُن کے پیچھے مٹھی بھر خوشامدیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ یہ تو خود اپنے آپ سے مایوس ہو چکے ہیں۔ نادانستگی میں خود مختار کشمیر کا نعرہ لگا کر وہ بھارت کے مؤقف کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ان خود ساختہ لیڈروں کو اپنی سیاسی دُکان چمکانے کے سوا اور کسی بات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ انہیں نہ کشمیر سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ کشمیریوں سے۔ ایک نام نہاد لیڈر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کشمیر کو کم از کم پانچ سال تک کے لئے اقوامِ متحدہ کے زیرِ انتظام دے دیا جائے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے انحراف کیا گیا تو کشمیر کا مسئلہ کبھی حل نہ ہو سکے گا۔ جو قومیں اپنے حق کے لئے لڑنا، مرنا اور دشمن کے سامنے ڈٹ جانا نہیں جانتیں، وہ آزادی کے چراغ کو کبھی روشن نہیں رکھ سکتیں۔ اس لئے تحریک آزادی سے متعلق ہر شخص کو جاننا چاہئے کہ کشمیر کا حل اقوامِ متحدہ کی قراردادوں ہی کے مطابق ہوگا۔ اور اگر ایک مرتبہ بھی ان قراردادوں سے انحراف کیا گیا تو پھر مسئلہ کشمیر کی عالمی مسلمہ حیثیت ختم ہو جائے گی۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں رحمان بابا!'' طارق نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''لیکن کیا ان نام نہاد لیڈروں کو سمجھایا نہیں جا سکتا کہ وہ اس طرح کے اعلانات کر کے کشمیریوں کے کاز کو نقصان پہنچا رہے ہیں؟''

''یہ بہت مشکل ہے بیٹا!'' رحمان بابا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''ماضی میں اس قسم کی کئی کوششیں ہو چکی ہیں کہ تمام لیڈر ایک پرچم تلے جمع ہو کر اپنی تنظیموں کو آپس میں ضم کر کے ایک طاقت بن جائیں۔ مگر سب اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ ان کی شیرازہ بندی ممکن نظر نہیں آتی۔ ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہی سب سے بڑا لیڈر ہے۔ اور وہ کسی دوسرے کے مشورے کو قبول کرنا بھی اپنے لئے توہین سمجھتا ہے۔ میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ اگر تمام تنظیمیں متحد ہو کر بھارتی استعمار کا مقابلہ کریں تو بھارتی حکمرانوں کے پاس گھٹنے ٹیکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں متحد کیسے کیا جائے؟'' طارق بولا۔

''اس کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔'' رحمان بابا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن بہرحال! ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔''

''بھارتی حکومت کا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ اسرائیل سے تربیت یافتہ گوریلوں کو پوری وادی

میں پھیلا دیا جائے اور دہشت گردی اور تخریب کاری کے ذریعے کشمیری عوام کے حوصلے پست کئے جائیں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کچھ مقامی باشندوں کو بھی لالچ یا مختلف قسم کی ترغیبات دے کر آلہ کار بنایا جائے گا۔ ایسے بعض لوگوں کے نام ان کاغذات میں موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... میں آج رات ان کاغذات کا تفصیلی مطالعہ کروں گا۔ صبح آٹھ بجے یہ مسئلہ سب کے سامنے میٹنگ میں رکھا جائے گا۔ اب تم لوگ آرام کرو! بہت تھکے ہوئے ہو۔ صبح ملاقات ہوگی۔'' رحمان بابا کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔

رحمان بابا اُوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ طارق اور نیلم کے لئے نچلی منزل پر الگ الگ کمروں کے انتظامات تھے۔ وہ اپنے کمروں میں جاتے ہی بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔

طارق کو صبح سات بجے جگا دیا تھا۔ آٹھ بجے تمام مہمان آ گئے۔ یہ نوجوان دراصل لبریشن فرنٹ کی ذیلی تنظیموں کے سربراہ تھے۔ اور اُن کی تنظیمیں کشمیر کے مختلف شہروں میں بھارتی استعمار کے خلاف سرگرمِ عمل تھیں۔

رحمان بابا نے مسئلے کو بڑی خوب صورتی سے اُن کے سامنے پیش کیا۔ اُن میں کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ اور آخر کار یہ طے پایا کہ تمام تنظیموں کے لیڈروں سے ایک بار پھر مذاکرات کر کے اُنہیں متحد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور اگر اس مقصد میں کامیابی نہ ہو تو لبریشن فرنٹ اپنے پروگرام پر عمل جاری رکھے۔ اس میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ ان لوگوں کی نگرانی شروع کر دی جائے، جن کے نام بھارتی منصوبے میں شامل ہیں۔

اس میٹنگ میں مختلف تنظیموں کے لیڈروں کے نام ایک خط کا مضمون بھی تیار کر لیا گیا۔ اس خط کے ذریعے ان تمام لیڈروں کو تین دن بعد حضرت بل میں میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

''ٹھیک ہے علی رضا!'' رحمان بابا نے ایک نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ خط تیار کر کے آج شام کو سرینگر میں مجھ سے مل لینا۔ میں دستخط کر دُوں گا۔ تمام خطوط اپنے آدمیوں کے ہاتھ آج شام ہی کو روانہ کر دو۔ اب تم لوگ جاؤ! میں بھی تقریباً ایک گھنٹے بعد یہاں سے رُخصت ہو جاؤں گا۔''

یہ گویا میٹنگ ختم ہونے کا اعلان تھا۔ تمام مجاہدین ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہو گئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد طارق اور نیلم بھی رحمان بابا کے ساتھ اس مکان سے رُخصت ہو گئے۔

سوتور سے سرینگر کا فاصلہ تیس پینتیس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اگر عام راستہ اختیار کرتے تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں سرینگر پہنچ سکتے تھے۔ لیکن رحمان بابا، بھارت اور سرینگر کی کٹھ پتلی حکومت کو سب سے زیادہ مطلوب آدمی تھا۔ اُس کے سر کی قیمت مقرر تھی۔ اس لئے اُنہوں نے عام راستہ اختیار کرنے کی بجائے اُونچے پہاڑوں میں وہ دُشوار گزار راستہ اختیار کیا، جہاں بھارتی فوج کے کسی گشتی دستے سے ٹکراؤ کا امکان نہیں تھا۔ چار مسلح مجاہدین بھی رحمان بابا کی حفاظت کے لئے ساتھ تھے۔

وہ لوگ دُشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے چار بجے کے لگ بھگ سرینگر پہنچے۔ نیلم کو دو آدمیوں کی حفاظت میں فوراً ہی گلمرگ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جبکہ طارق، رحمان بابا کے ساتھ ہی رہ گیا۔

سری نگر، دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ شہر کے دونوں حصوں کو آپس میں ملانے کے لئے دریا پر کئی پُل ہیں۔ شہر کے مغربی حصے میں ڈل جھیل ہے۔ جس کے ساتھ ہی واقع پہاڑی پر تختِ سلیمان اور شنکر اچاریہ کا مندر ہے۔ پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے کے بل کھاتی ہوئی ایک پختہ سڑک کے علاوہ پیدل چلنے کے لئے بھی کئی راستے ہیں۔ ڈل جھیل کے چاروں طرف بلیوارڈ روڈ ہے۔ اس سرکلر روڈ سے شہر کے مختلف علاقوں کو سڑکیں نکلتی ہیں۔ ڈل جھیل پر ہر وقت لاتعداد ہاؤس بوٹس، ڈونگے اور شکارے موجود رہتے ہیں۔ ہاؤس بوٹس باہر سے آنے والے سیاحوں کے لئے رہائش فراہم کرتی ہیں جس سے رہائشی ہوٹلوں کی کمی کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔

وہ لوگ مشرقی سمت سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے وہ لوگ بند روڈ پر پہنچ گئے۔ یہاں قریب ہی سرینگر کلب تھا۔ اور یہ علاقہ وزراء، بڑے بڑے سرکاری افسروں اور شہر کے رئیسوں کے بڑے بڑے بنگلوں پر مشتمل تھا۔ بیشتر سیاستدانوں کے بنگلے بھی اسی علاقے میں تھے۔ یہ مسلمان سیاستدان اپنے محل نما بنگلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے جبکہ عام کشمیری نانِ شبینہ تک کے محتاج تھے اور بھارتی پولیس اور فوج کے مظالم سہہ رہے تھے۔

وہ لوگ اُس علاقے سے نکل کر ایسے علاقے میں پہنچ گئے، جہاں گنجان آبادی تھی۔ مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے آخر کار وہ ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ وہ اُس مکان میں چند منٹ سے زیادہ نہیں رُکے۔ اس مرتبہ رحمان بابا کو ایک سٹریچر پر لٹا دیا گیا تھا۔ جسم پر کمبل لپٹا ہوا تھا۔ دو آدمیوں نے سٹریچر اُٹھا رکھا تھا۔ طارق اور دو آدمی، سٹریچر کے ساتھ چل رہے تھے۔

شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک آمد و رفت کے لئے دریائے جہلم کے ساتوں پُلوں پر فوج کا قبضہ تھا۔ آنے جانے والوں کی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ اُنہیں بھی روک لیا گیا۔ طارق نے روتے ہوئے فوجی آفیسر کو بتایا کہ اُس کا بوڑھا دادا، گردے کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ وہ اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ فوجی آفیسر نے کمبل ہٹا کر دیکھا، رحمان بابا کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے۔ فوجی آفیسر نے ترس کھاتے ہوئے اُنہیں جانے کی اجازت دے دی۔ یہ پہلا فوجی آفیسر تھا، جس نے کسی مسلمان پر ترس کھایا تھا۔

میرا قدر پُل عبور کر کے وہ کچھ دُور سٹریچر اُٹھائے چلتے رہے، پھر ایک جگہ رُک گئے۔ سٹریچر نیچے رکھتے ہی رحمان بابا اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور وہ لوگ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے پرانے شہر کی طرف چلنے لگے۔ وہ ایک سڑک کے موڑ پر پہنچے ہی تھے کہ ایک تیز رفتار فوجی جیپ، بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ اُن کے پیچھے آ کر رُکی۔ چار فوجی اُچھل کر جیپ سے نیچے آ گئے..... اُنہوں نے اُن سب کو رائفلوں کی زد پر لے لیا۔

''تم ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے رحمان بابا.....!'' پارٹی کے انچارج فوجی آفیسر نے رحمان بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق کو یوں لگا، جیسے اُس کے سر پر بم پھٹا ہو۔ وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔

☆

اُن چاروں کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ طارق اگرچہ کئی مواقع پر اس سے بھی زیادہ خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ لیکن اس طرح کا خوف کبھی اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ تین فوجیوں کی سب مشین گنیں اُن کی طرف تنی ہوئی تھیں۔ چوتھے فوجی کے ہاتھ میں ریوالور تھا، جس کا رُخ رحمان بابا کی طرف تھا۔ رحمان بابا کے دوسرے ساتھی بھی دہشت زدہ سے کھڑے تھے۔

''تم لوگوں کو شاید غلطی ہوئی ہے آفیسر!'' رحمان بابا نے فوجی آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ مجھ سے مشابہت رکھنے والا کوئی اور آدمی بھی اس دنیا میں موجود ہو۔ لیکن میں، وہ نہیں ہوں، جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔''

''ہمیں کوئی غلطی نہیں ہوئی..... ہم اچھی طرح جانتے ہیں، تم کون ہو۔'' آفیسر کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ ''چیک پوسٹ پر بتایا گیا تھا کہ تم گردے کی تکلیف میں مبتلا ہو۔ لیکن یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں نے تمہیں سٹریچر سے اُتر کر اس طرح تیز تیز چلتے ہوئے دیکھ لیا۔ گردے کی تکلیف میں مبتلا کوئی بوڑھا شخص اس طرح نہیں چل سکتا۔

''میں بوڑھا ضرور ہوں۔ لیکن اس طرح چارپائی یا سٹریچر پر لیٹنا میں نے کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود میں اپنے پیروں پر چل سکتا ہوں۔ تکلیف زیادہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے مجھے زبردستی سٹریچر پر ڈال دیا تھا۔

''اگر غلط فہمی بھی ہو تو تم لوگ اُس وقت تک ہماری کسٹڈی میں رہو گے، جب تک ہماری غلط فہمی دُور نہیں ہو جاتی۔ تم لوگوں کے بارے میں، خاص طور سے تمہارے بارے میں۔'' اُس نے رحمان بابا کی طرف اشارہ کیا۔ ''تحقیقات کی جائے گی۔ اگر واقعی تم وہ نہیں ہو، جو ہم سمجھ رہے ہیں تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے..... ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' رحمان بابا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا اور معنی خیز نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

اُس وقت تک شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لیکن جس جگہ وہ کھڑے تھے، وہاں سڑک کے موڑ پر کھمبے پر جلنے والے بلب کی روشنی تھی۔ سڑک تقریباً سنسان ہی تھی۔ جب سے مجاہدین کی سرگرمیوں میں تیزی آئی تھی اور پولیس اور بھارتی فوج کے مظالم میں اضافہ ہوا تھا، شہر کے لوگ سرِ شام گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ کرفیو اور ہنگامے زندگی کا معمول بن چکے تھے۔ عام دنوں میں شام سے ذرا پہلے اور اس کے بعد شہر کی ویرانی، کرفیو یا ہڑتال کا منظر ہی پیش کرتی تھی۔ اس وقت بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔ فوجی آفیسر کی بات سن کر رحمان بابا کے چہرے پر مایوسی سی اُبھر آئی۔ لیکن پھر اچانک ہی فوجی آفیسر کے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے وہ چیخا۔

''ارے رُک جاؤ! گولی مت چلانا۔''

یہ ایک پرانا نفسیاتی حربہ تھا جو اس وقت بھی سو فیصد کامیاب رہا۔ آفیسر اور تینوں فوجیوں نے بیک وقت پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اور یہ چھوٹی سی غلطی ہی اُن کی زندگیوں کے چراغ گل کر گئی۔ رحمان بابا نے فوجی آفیسر اور طارق وغیرہ نے بیک وقت تینوں فوجیوں پر چھلانگ لگا دی اور پلک جھپکنے میں بازی پلٹ گئی۔ اب فوجی، رحمان بابا اور اُس کے آدمیوں کی زد میں تھے۔ رحمان بابا نے آفیسر پر ریوالور تان رکھا تھا۔

''تمہیں ہمارے بارے میں تحقیقات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری غلط فہمی ابھی دُور کئے دیتا ہوں۔'' رحمان بابا نے کہا۔ ''میں وہی ہوں، جو تم سمجھ رہے تھے۔ میری بہت تلاش ہے تم لوگوں کو۔ میرے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ لیکن رحمان کسی ایک شخص کا نام نہیں ہے۔ وادی کشمیر کا بچہ بچہ رحمان ہے۔ جو تم جیسے بھیڑیوں کے لئے عذاب الٰہی ثابت ہو گا۔ تم لوگوں کو ایک نہ ایک دن اس وادی سے رُخصت ہونا پڑے گا۔ لیکن جانے سے پہلے اس خون کا حساب

دینا ہو گا جو تم لوگوں نے معصوم اور بے گناہوں کے گلے کاٹ کر بہایا ہے۔ ہم لوگ تو پینتالیس برس سے ایک قیامت سے گزر رہے ہیں۔ لیکن اب تم لوگوں کا بھی یومِ حساب آن پہنچا ہے۔''

رحمان بابا خاموش ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کا رُخ فوجی آفیسر کے سینے کی طرف تھا۔ باقی فوجیوں کو بھی طارق اور اُس کے دو ساتھیوں نے سب مشین گنوں کی زد پر لے لیا تھا۔ وہ چاروں تھر تھر کانپ رہے تھے۔

''موت کو اپنے سامنے دیکھ کر تھر تھر کیوں کانپنے لگے.....؟'' رحمان بابا نے کہا۔ ''اب شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ موت کا چہرہ کتنا بھیانک ہوتا ہے۔ تم جیسے لوگ طاقت کے نشے میں چور ہو کر دوسروں پر ظلم تو بہت کرتے ہیں۔ جسے وہ بہادری سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت! وہ بہادری نہیں، بزدلی ہے۔ اور جب تم جیسا ظالم شخص، موت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے جیسے اس وقت تم کانپ رہے ہو۔ لیکن میں تم لوگوں کو زیادہ دیر تک خوف میں مبتلا نہیں رکھوں گا۔'' رحمان بابا ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ اور پھر اُس نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا..... طارق اور اُس کے دو ساتھیوں نے بھی سب مشین گنوں کے ٹرائیگر دبا دیئے۔ آفیسر کے ساتھ فوجی بھی چھلنی ہو کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔

''بھاگو! ہری اَپ.....!'' رحمان بابا چیخا۔ ''چیک پوسٹ سے فوجی گاڑیوں کو یہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔

وہ ابھی بھاگنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ میر اقدر رپُل کی طرف سے ایک تیز رفتار فوجی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ ٹرک پر ہیوی مشین گن فٹ تھی۔ گن مین نے دُور ہی سے فائر کھول دیا..... بدقسمتی سے ایک گولی رحمان بابا کے ایک ساتھی کو لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا..... رحمان بابا، طارق اور اُس کے دوسرے ساتھیوں نے کشادہ گلی میں چھلانگ لگا دی۔ اسی اثناء میں ٹرک سے چلائی جانے والی مشین گن کی ایک گولی موڑ پر کھڑی ہوئی فوجی جیپ کے فیول ٹینک پر لگی۔ دوسرے ہی لمحے ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور جیپ کے پرخچے اُڑ گئے۔ جیپ کے جلتے ہوئے ٹکڑے ہوا میں اُڑتے ہوئے دُور دُور تک پھیل گئے۔

جیپ کے دھماکے سے پھٹنے سے اُن لوگوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ رحمان بابا کی عمر اگرچہ اسّی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن وہ جوانوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ طارق اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ یہ لوگ جس سڑک پر دوڑ رہے تھے، وہ کافی کشادہ تھی۔ یہی سڑک آگے جا کر ڈل جھیل کے قریب بلیوارڈ روڈ سے مل گئی تھی۔ لیکن یہ لوگ اُس سڑک پر دوڑتے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ سامنے سے کسی بھی وقت پولیس یا فوج کی کسی پارٹی سے سامنا ہو سکتا تھا۔ اس سڑک

کے دائیں بائیں بہت سی چھوٹی سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ رحمان بابا نے طارق کو اپنے ساتھ رہنے کو کہا اور دیگر ساتھیوں کو چیخ کر حکم دیا کہ وہ مختلف سمتوں میں نکل جائیں۔

طارق، رحمان بابا کے ساتھ بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک پر مُڑ گیا۔ اُسے ایک کشادہ بازار کہا جا سکتا تھا۔ بیشتر دُکانیں پہلے ہی سے بند تھیں۔ جو اِکا دُکا کھلی تھیں، وہ بھی دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ اور بازار میں موجود لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔

فوجی ٹرک، بازار کے موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ ٹرک پر لگی مشین گن سے مسلسل فائرنگ کی جا رہی تھی۔ جس سے بازار میں دو آدمی جاں بحق ہو گئے۔ طارق اور رحمان بابا ایک گلی میں گھس گئے۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک اور تنگ سی گلی میں گھس گئے۔ یہ گلی گھاٹی کی طرح اُوپر کو چلی گئی تھی۔ اور سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ وہ اُن سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے ایک اور موڑ پر پہنچ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت، ایک مکان کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ عورت رحمان بابا یا طارق کو نہیں پہچانتی تھی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ مجاہدین ہیں اور پولیس یا فوج کے کتے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کشمیر کا بچہ بچہ مجاہدین سے تعاون کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لہٰذا وہ عورت بھی اُن دونوں کو دیکھتے ہی چیخی۔

''اندر آ جاؤ.....!''

رحمان بابا اور طارق، مکان میں گھس گئے۔ عورت نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

''گھر میں کوئی مرد ہے.....؟'' رحمان بابا نے پوچھا۔ مسلسل دوڑتے رہنے سے اُس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔

''نہیں..... میں اکیلی ہوں۔ میرا شوہر اور بیٹا سوپور گئے ہوئے ہیں۔ اگر تم لوگوں کو اسلحہ چاہئے تو.....''

''کس قسم کا اسلحہ ہے.....؟'' رحمان بابا نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''رائفلیں، راکٹ، دستی بم اور گولیاں۔ میرا شوہر اور بیٹا مجاہدین کی تنظیم میں ہیں۔ اور یہ اسلحہ.....''

''ہمیں دکھاؤ! وہ اسلحہ کہاں رکھا ہے.....؟'' رحمان بابا نے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔

وہ عورت اُنہیں ایک اندرونی کمرے میں لے گئی جہاں اسلحے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ رحمان بابا نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا اور ایک آٹومیٹک رائفل اور دو دستی بم اُٹھا لئے۔ طارق نے بھی دو دستی بم اُٹھا لئے۔ اور وہ کمرے سے نکل آئے۔

''چھت پر جانے کا راستہ کس طرف ہے.....؟'' رحمان بابا نے عورت سے پوچھا۔

''اُس طرف.....!'' عورت نے اشارہ کیا۔

وہ دونوں عورت کے ساتھ دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ بازار کی طرف سے مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اس علاقے کے لوگ مقابلے پر آ گئے تھے۔ فوجی یا پولیس والے ویسے بھی تنگ گلیوں میں گھسنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسی جگہوں پر رہتے تھے، جہاں سے اُنہیں بوقت ضرورت بھاگنے کا موقع مل سکے۔

طارق اور رحمان بابا مکانوں کی چھتوں پر دوڑتے ہوئے بازار کی سمت والے آخری مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ بازار میں اس وقت دو فوجی ٹرک تھے۔ اور تقریباً ڈیڑھ درجن فوجی، ٹرکوں اور مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھالے چاروں طرف اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔ دونوں ٹرکوں پر نصب ہیوی مشین گنوں سے بھی مسلسل فائرنگ کی جا رہی تھی۔ جبکہ مختلف گلیوں اور مکانوں کی چھتوں سے جوابی فائرنگ ہو رہی تھی۔

طارق اور رحمان بابا نے چھت پر پوزیشن سنبھال لی اور ایک ٹرک کی آڑ میں کھڑے ہوئے فوجیوں پر فائرنگ کرنے لگے۔ ایک فوجی، طارق کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اُس ٹرک پر لگی ہوئی مشین گن فوراً ہی اس طرف گھوم گئی اور اُس مکان کی چھت کی طرف فائرنگ کی جانے لگی.....

طارق نے ایک دستی بم کی پن کھینچ لی اور موقع پاتے ہی بم کو ٹرک کی طرف اُچھال دیا۔ دستی بم، ٹرک میں گرا۔ دوسرے ہی لمحے اتنا زوردار دھماکہ ہوا کہ فضا تک لرز اُٹھی..... ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مشین گن اور تین فوجیوں کے بھی چیتھڑے اُڑ گئے۔ باقی فوجی دوسرے ٹرک کی طرف بھاگے۔ طارق نے دوسرا دستی بم بھی گلی میں اُچھال دیا۔ وہ بم دوسرے ٹرک سے کافی دُور گرا تھا۔ اُس بم سے صرف ایک فوجی ہلاک ہو سکا تھا۔ البتہ ٹرک، حرکت میں آ گیا۔ باقی فوجی، ٹرک کی طرف دوڑے۔ اُن فوجیوں کے سوار ہوتے ہی ٹرک کی رفتار تیز ہو گئی۔ دوڑتے ہوئے ٹرک سے اگرچہ مسلسل فائرنگ کی جا رہی تھی۔ لیکن یہ فائرنگ خوف اور بدحواسی میں ہو رہی تھی۔ اور فائرنگ کرنے والوں کے سامنے کوئی ٹارگٹ نہیں تھا۔

ٹرک، بازار سے نکل گیا۔ اس علاقے کے باشندے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے مکانوں اور اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر بازار کی سڑک پر آ گئے۔ شہیدوں کی لاشیں فوراً ہی اُٹھا دی گئیں اور جہنم واصل ہونے والے بھارتی فوجیوں کی لاشیں گھسیٹ کر بڑی سڑک پر ڈال دی گئیں۔

رحمان بابا، طارق اور اُس علاقے کے باشندوں نے بہادری اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں کو اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں تھا کہ وہ اس کامیابی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ اُنہیں یقین تھا کہ اب اس علاقے پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ وہ لوگ مورچہ بندی کرنے لگے۔ جن کے پاس فالتو اسلحہ تھا، وہ دوسروں کو دے دیا گیا۔

طارق اور رحمان بابا اُس مکان سے نکل آئے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے جب اُس عورت کو پتہ چلا کہ وہ رحمان بابا ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے مجھے، آپ کی خدمت کا موقع دیا رحمان بابا!'' عورت نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کاش! مجھے آپ کی مزید خدمت کا موقع ملتا۔''

''مجھے خوشی ہے کہ کشمیر نے تم جیسی بہادر اور دلیر بیٹیوں کو جنم دیا ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملا، میں تم سے ضرور ملاقات کروں گا بیٹی! ویسے بھی میں نے اپنی میزبان کا نام ابھی تک نہیں پوچھا۔'' رحمان بابا نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ریشم ہے رحمان بابا!'' عورت نے جواب دیا۔ میرا شوہر اور بیٹا بھی لبریشن فرنٹ میں ہیں۔ وہ کمانڈر رحیم کے ماتحت ہیں۔ اور ان دنوں سوپور میں ہیں۔''

''آفرین ہے۔'' رحمان بابا نے کہا۔ ''جس قوم میں تم جیسے لوگ موجود ہوں، اُس قوم کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔''

ریشم کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ شادی کم عمری ہی میں ہوگئی تھی۔ اُس کا صرف ایک ہی بیٹا تھا، جو اُس وقت بیس سال کا ہو چکا تھا اور باپ کے ساتھ بھارتی درندوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

☆

ریشم کے گھر سے نکل کر رحمان بابا اور طارق، گلیوں ہی گلیوں میں ہوتے ہوئے سرینگر کے بالائی حصے کی طرف نکل گئے۔ اُس وقت پورے شہر میں ہنگامے برپا ہو چکے تھے۔ فوج نے اپنے آدمیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے بے گناہوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔

وہ دونوں کئی میل کا فاصلہ طے کر کے ڈل اور ناگن جھیل کے دوسری طرف ہری پربت پہنچ گئے۔ اُس پہاڑی کی چوٹی پر ایک قدیم قلعہ بنا ہوا ہے۔ اس کے قریب ہی تخت سلیمان اور شنکر اچاریہ مندر بھی ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے اگرچہ بل کھاتی ہوئی ایک پختہ سڑک بھی ہے۔ لیکن پیدل آمد و رفت کے لئے لاتعداد پگڈنڈی نما راستے بھی موجود ہیں۔ اس پہاڑی پر لاتعداد رہائشی مکانات بھی ہیں۔

رحمان بابا اب بری طرح ہانپ رہا تھا۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے وہ سانس لینے کے لئے کئی جگہ رُکے تھے۔ وہ رات کی تاریکی سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے یہاں تک نہ پہنچ سکتے۔

آخر کار وہ ایک مکان کے سامنے رُک گئے۔ رحمان بابا کے کہنے پر طارق نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک بوڑھے آدمی نے کھولا تھا۔ پہلے تو وہ طارق کو دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔ پھر رحمان بابا کو دیکھتے ہی بری طرح چونک گیا۔ وہ رحمان بابا کو سہارا دے کر فوراً اندر لے گیا۔

رات بھر شہر کے مختلف علاقوں سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ طارق حالانکہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ لیکن اُسے ایک لمحے کو بھی نیند نہیں آسکی تھی۔ وہ بار بار مکان کی چھت پر جا کر شہر کی طرف دیکھنے لگتا۔

جب صبح ہوئی تو اُس وقت بھی طارق، چھت پر بیٹھا شہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی نرم سنہری کرنوں میں پہاڑ کی چوٹی سے سامنے پھیلی ہوئی وادی کا منظر بے حد دلفریب تھا۔ ہری پربت کے قدموں میں ڈل جھیل، ناگن جھیل، اُونچی نیچی گھاٹیوں پر پھیلا ہوا شہر نشاط باغ، شالیمار باغ اور جنوب میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دریائے جہلم..... قدرت نے وادی کو حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ مگر زر اور زمین کی ہوس نے وادی کے حسن کو گہنا

دیا تھا۔ شہر میں ایک دو مقامات پر اور وادی میں کئی جگہوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ یہ دُھواں اُن کشمیری مسلمانوں کے گھروں سے اُٹھ رہا تھا، جنہیں گزشتہ رات پولیس اور فوج کے ہندو بھیڑیوں نے نذرِ آتش کیا تھا۔

رات بھر کی بھاگ دوڑ سے رحمان بابا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اُس مکان کا مالک رئیس احمد، لبریشن فرنٹ کا ایک سرگرم رُکن تھا۔ وہ رات بھر رحمان بابا کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے ایک آدمی کو شہر بھیج دیا تھا کہ کسی ڈاکٹر کو بلا کر رحمان بابا کو دکھایا جا سکے۔ وہ آدمی دو گھنٹوں بعد اکیلا ہی واپس آیا۔ اُس نے بتایا کہ پورا شہر بند پڑا ہے۔ کہیں کوئی دُکان نہیں کھلی۔ پولیس اور فوج کے ظلم پر احتجاجاً لوگوں نے اپنی دُکانیں نہیں کھولیں۔ اور سرکاری ملازمین دفتروں سے چھٹی کر کے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

''ڈاکٹر احمد کے گھر چلے جاتے۔'' میزبان نے کہا۔

''گیا تھا۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔ ''لیکن گزشتہ رات پولیس، ڈاکٹر احمد اور اُس گلی سے تین چار آدمیوں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔''

''اوہ.....!'' میزبان گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

''میں جا کر پتہ کرتا ہوں۔'' طارق نے کہا۔ ''بلیوارڈ روڈ کے ساتھ ہی میرے ایک دوست کا مکان ہے۔ اعظم نے باقاعدہ ڈاکٹری تو نہیں پڑھی، لیکن وہ باغ میں کئی سال تک ایک ڈاکٹر کے پاس کمپاؤڈر کی حیثیت سے کام کر چکا ہے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کا تو اُسے اچھا خاصا تجربہ ہے۔ میرے دہلی جانے سے پہلے وہ سرینگر آ گیا تھا۔ اُن دنوں یہاں اُس کے والد کی دُکان تھی۔ میں جا کر پتہ کرتا ہوں۔ اگر وہ یہیں ہوا تو میرے ساتھ آنے سے انکار نہیں کرے گا۔''

''لیکن میرے خیال میں تمہارا باہر نکلنا درست نہیں ہوگا۔'' میزبان نے کہا۔

''کیوں.....؟'' طارق نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''گزشتہ رات یہ ہنگامے تم لوگوں کی وجہ سے ہوئے تھے۔ پولیس اور فوج تمہاری تلاش میں ہوگی۔'' میزبان نے کہا۔

''گزشتہ رات جن لوگوں نے ہمیں دیکھا تھا، اُنہیں ہم نے وہیں ختم کر دیا تھا۔ اب مجھے کون پہچان سکتا ہے؟ میں ضرور جاؤں گا۔ رحمان بابا کی جان مجھ سے زیادہ قیمتی ہے۔'' طارق نے کہا۔

''ٹھیک ہے.....!'' میزبان نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر تم بضد ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔''

چند منٹ بعد طارق گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا پہاڑی سے اُترنے لگا۔

وہ پہاڑی پر سے ہی دیکھ چکا تھا کہ جھیل کے چاروں طرف بلیوارڈ روڈ پر فوجی گاڑیوں اور جیپوں کی بھرمار تھی۔ لیکن اُسے بلیوارڈ پر آنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچتے ہی وہ دائیں طرف کی سڑک پر مُڑ گیا جس کے دونوں طرف بنگلہ نما مکانات بنے ہوئے تھے۔ چنار کے قد آور درخت اُن مکانوں پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ وہ مکانوں کے سامنے درختوں کے نیچے تیز تیز چلتا ہوا ایک دوسری سڑک پر مُڑ گیا۔

مطلوبہ گلی تک پہنچنے کے لئے اُسے طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ اُس گلی میں مُڑتے ہی اُس نے بلیوارڈ کی طرف دیکھا۔ اُس سے تقریباً دو سو گز دُور بلیوارڈ روڈ پر چند فوجی کھڑے تھے۔ طارق تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس تنگ سی گلی میں داخل ہوگیا۔

وہ کئی سال بعد سرینگر آیا تھا۔ مطلوبہ گلی میں تو وہ پہنچ گیا تھا، لیکن مکان کی شناخت بھول گیا تھا۔ یوں بھی اس عرصے میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ وہ گلی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گلی سنسان تھی۔ کوئی نظر بھی نہیں آ رہا تھا، جس سے اعظم کے مکان کے بارے میں دریافت کیا جا سکتا۔ گلی کے وسط میں پہنچ کر وہ رُک گیا اور چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر ایک مکان کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ دوسری مرتبہ دستک دینے پر اُوپری منزل والے کمرے کی کھڑکی کھلی، ایک آدمی نے پہلے نیچے دیکھا، پھر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

''کون ہو بھائی..... کس سے ملنا ہے؟'' اُس شخص نے پوچھا۔

طارق نے گردن اُٹھا کر اُوپر دیکھا۔ ''مجھے اپنے ایک دوست اعظم کی تلاش ہے۔ چند سال پہلے وہ باغ میں ہوا کرتا تھا۔ میں کئی سال پہلے ایک مرتبہ یہاں آیا تھا۔ لیکن اب مکان کی شناخت نہیں رہی۔''

''تم ڈاکٹر اعظم کی بات تو نہیں کر رہے؟'' اُوپر سے پوچھا گیا۔

''ہاں..... وہی۔'' طارق نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اعظم نے میڈیکل کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اُس نے سب کچھ ایک ڈاکٹر کے پاس کام کرتے ہوئے سیکھا تھا اور باغ میں وہ ڈاکٹر ہی کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔

''دائیں طرف ایک مکان چھوڑ کر اُس سے آگے والا مکان ہے۔ لیکن.....'' وہ شخص مزید کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''لیکن کیا.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اُس شخص نے کہنے کے ساتھ ہی کھڑکی بند کر دی۔

طارق چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ اور پھر آگے بڑھ کر تیسرے مکان کے دروازے پر ہولے

سے دستک دی۔ دوسری بار دستک دینے پر لکڑی کے بھاری دروازے میں ایک مربع انچ کے لگ بھگ ایک چھوٹی سی کھڑکی کھل گئی اور ایک آنکھ اُس کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ طارق نے نہ تو اس چھوٹی سی کھڑکی کے کھلنے کی آواز سنی تھی اور نہ ہی اُس آنکھ کو جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ تیسری مرتبہ دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے ایک لرزتی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم..... کس سے ملنا ہے؟''

''میں، باغ سے آیا ہوں۔ اعظم کا دوست ہوں۔ اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی بیساکھیوں کے سہارے چل رہا ہو۔ ایک بار پھر کسی نے دروازے کی اُس ننھی سی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، اور پھر دروازہ کھل گیا۔

''آؤ..... اندر آ جاؤ میرے بھائی!'' اُس نسوانی آواز نے کہا۔

طارق دروازہ پوری طرح کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ آگے ایک مختصر سی ڈیوڑھی تھی۔ اور دروازے کے عین سامنے ڈیوڑھی میں ایک آدمی بیساکھیوں کے سہارے کھڑا تھا۔ لیکن اُس کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفل تھی جس کا رُخ دروازے ہی کی طرف تھا۔ اور طارق، رائفل کی زد میں تھا۔ طارق نے اُسے پہچاننے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ اعظم تھا..... اعظم نے بھی طارق کو پہچان کر رائفل نیچے پھینک دی اور دونوں بانہیں پھیلا دیں..... طارق دوڑ کر اُس سے لپٹ گیا۔ اُسی وقت دروازے بند ہونے کی آواز سن کر طارق نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ دروازہ بند کرنے والی ایک لڑکی تھی۔ اُس کی عمر سولہ سترہ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ دُبلی پتلی، بے حد حسین لڑکی تھی۔

''یہ میری چھوٹی بہن گلنار ہے۔'' اعظم نے کہا۔ ''اور گلنار! یہ میرا دوست ہے۔ طارق۔ جاؤ! اماں سے کہو، میرا پرانا دوست آیا ہے۔ کچھ قہوے وغیرہ کا بندوبست کریں۔ ہم بیٹھک میں جا رہے ہیں۔''

''یہ..... یہ تمہیں کیا ہوا ہے اعظم.....؟'' طارق نے اُس کی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ دائیں ٹانگ گھٹنے کے اُوپر سے کٹی ہوئی تھی۔

''آؤ! بیٹھک میں چلتے ہیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔'' اعظم نے کہا۔

وہ بیٹھک میں آ گئے۔ اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اعظم نے بتایا کہ سرینگر آنے کے بعد وہ مجاہدین کی ایک تنظیم میں شامل ہو گیا تھا۔ چار سال تک اُس نے بھارتی درندوں کے خلاف بے شمار کارروائیوں میں حصہ لیا۔ پچھلے سال بارہ مولہ میں بھارتی فوج کے خلاف ایک

کارروائی کے دوران اُس کے گھٹنے پر گولی لگی تھی۔ اُس کے ساتھی اُسے اُٹھا کر مظفر آباد لے گئے تھے۔ جہاں ہسپتال میں اُس کی ٹانگ کاٹ دی گئی۔ دو مہینے ہسپتال میں رہنے کے بعد جب وہ بیساکھیوں کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو کسی نہ کسی طرح سرینگر واپس آ گیا۔ اب وہ عملی طور پر تو جہاد میں حصہ نہیں لے سکتا۔ لیکن بیمار مجاہدین کا علاج کر کے اپنے جذبات کی تسکین کر لیتا ہے۔

''تمہارے والد اور چھوٹا بھائی کہاں ہیں.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''والد کا تو دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اور میرا چھوٹا بھائی قاسم اپنا حق مانگنے کے جرم میں بھگت رہا ہے۔'' اعظم نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں.....!'' طارق نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''قاسم بھی میری طرح تنظیم کا ایک سرگرم رُکن ہے۔ ایک ہفتہ پہلے سرینگر ہی میں فوج کے ساتھ ایک جھڑپ کے دوران پکڑا گیا تھا۔ اور اس وقت کسی ٹارچر سیل میں سختیاں جھیل رہا ہو گا۔'' اعظم نے بتایا۔

اُسی وقت گلنار قہوہ لے کر آ گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کی ماں بھی تھی جس نے سر پر سیاہ پٹی باندھ رکھی تھی۔ اُس نے طارق کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی باتیں کرتی رہی، پھر گلنار کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''اعظم! میں اس وقت تمہارے پاس ایک خاص مقصد کے تحت آیا تھا۔ لیکن شاید تم.....'' وہ اس کی ٹانگوں کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''کہو..... خاموش کیوں ہو گئے؟'' اعظم بولا۔

''رحمان بابا کو جانتے ہو.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کشمیر میں مجاہدین کی سب سے بڑی تنظیم لبریشن فرنٹ کے سربراہ کو کون نہیں جانتا؟ اُن کی ساری زندگی جہاد میں گزری ہے۔ سنا ہے، گزشتہ رات رحمان بابا اور اُن کے ساتھیوں کی فوج کی ایک گشتی پارٹی سے جھڑپ ہو گئی تھی۔ اور پھر پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیکن تم رحمان بابا کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو.....؟'' اعظم نے کہا۔

''رات کو میں بھی رحمان بابا کے ساتھ تھا۔'' طارق نے جواب دیا۔

''کیا.....؟'' اعظم اُچھل پڑا۔

''رحمان بابا کی طبیعت خراب ہے۔ پورا شہر بند پڑا ہے۔ کوئی ڈاکٹر دستیاب نہیں ہے۔ میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ لیکن.....'' وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر اعظم کی

کٹی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھنے لگا۔

''رحمان بابا زخمی ہیں کیا.....؟'' اعظم نے پوچھا۔

''نہیں.....!'' طارق نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ کل شام سوتور سے سرینگر آئے تھے۔ اور سرینگر میں داخل ہوتے ہوئے فوج سے جھڑپ ہوگئی۔ تم جانتے ہو، رحمان بابا بوڑھا آدمی ہے۔ تھکن سے شاید طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ رات بھر تیز بخار رہا ہے۔''

''رحمان بابا عمر کے لحاظ سے بوڑھا ہے۔ لیکن اُس کے عزائم جوان ہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے کشمیر کے اس عظیم سپوت کی خدمت کا موقع ملا ہے تو میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' اعظم نے کہا۔ اُس کے لہجے میں ایک عجیب سا جوش تھا۔

''لیکن.....!''

''تم موٹر سائیکل چلا سکتے ہو.....؟'' اعظم نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں.....!'' طارق نے مختصر سا جواب دیا۔

''ڈیوڑھی میں قاسم کی موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ تم مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے چلو۔ میں رحمان بابا کا علاج کروں گا۔ یہ میرے لئے ایک بڑی سعادت ہوگی اور میں اس سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ تم یہیں بیٹھو! میں ضروری دوائیں، تھیلے میں ڈال لوں۔'' اعظم اُٹھ کر بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

طارق خاموش بیٹھا کمرے کی مختلف چیزوں کو گھورتا رہا۔ وہ اعظم کے جذبہ جہاد سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ ایک بھائی اسی جرم میں سزا بھگت رہا تھا۔ خود وہ اپنی ٹانگ سے محروم ہوگیا تھا۔ لیکن اُس کے جذبے اور ولولے میں کمی نہیں آئی تھی۔

اعظم چند منٹ بعد واپس آگیا۔ اُس نے ہاتھ میں کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا بھی لٹکا رکھا تھا جس میں غالباً دوائیں وغیرہ تھیں۔ وہ طارق کو اشارہ کرتا ہوا ڈیوڑھی میں آگیا۔ ڈیوڑھی میں سیاہ رنگ کی ہنڈا موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اندر آتے ہوئے طارق نے غالباً موٹر سائیکل پر توجہ نہیں دی تھی۔ چابی، موٹر سائیکل میں لگی ہوئی تھی۔ اُسی وقت گلنار بھی ڈیوڑھی میں آگئی۔ طارق موٹر سائیکل کو موڑ کر دروازے سے باہر لے آیا۔ اعظم بھی باہر آگیا۔ گلنار اُس وقت تک دروازے میں کھڑی رہی، جب تک وہ دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے روانہ نہیں ہوگئے۔ پھر اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

طارق، موٹر سائیکل کو مختلف گلیوں میں سے گھماتا ہوا، اُس سڑک پر آگیا، جہاں چناروں کے سائے میں بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ اُس سڑک پر ایک موڑ گھومتے ہی پولیس کی ایک وین

سامنے آگئی..... وین کے پچھلے حصے میں چھ مسلح پولیس والے سوار تھے۔ جبکہ ڈرائیور کے ساتھ پولیس پارٹی کا انچارج بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک وین سڑک پر اس طرح رُک گئی کہ طارق کو بھی موٹر سائیکل روک لینا پڑی۔ تین پولیس والے فوراً ہی نیچے اُتر آئے۔ اُنہوں نے طارق اور اعظم پر بندوقیں تان لیں..... پولیس پارٹی کا انچارج بھی وین سے اُتر آیا۔

''اے..... نیچے اُترو! نوابوں کی طرح موٹر سائیکل پر بیٹھے ہو۔'' ایک پولیس والا دہاڑا۔

اعظم اپنی بیساکھیاں سنبھالتا ہوا موٹر سائیکل سے اُتر گیا۔ لیکن وہ ایک ٹانگ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ طارق جلدی سے موٹر سائیکل سے اُتر آیا اور اعظم کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

پولیس پارٹی کا انچارج غور سے اعظم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا جو آگے بڑھ کر دونوں کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ لیکن اُس کے پاس سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔

''اس تھیلے میں کیا ہے.....؟'' انچارج نے اعظم کی بغل میں لٹکے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''میری دوائیں ہیں۔'' اعظم نے تھیلا، کندھے سے اُتار کر آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دونوں اس وقت بڑی اچھی اداکاری کر رہے تھے۔ لگتا تھا، جیسے خوف سے اُن کی جان نکلی جا رہی ہو۔ پولیس آفیسر نے تھیلے میں جھانکا۔ اُس میں دواؤں کے علاوہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں تھی۔ آفیسر نے تھیلا واپس کر دیا اور اپنے سپاہیوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے خیال میں یہ دونوں ایسے بزدل نوجوان تھے، جن سے کسی تخریبی کارروائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر اُسے یہ علم ہو جاتا کہ لنگڑے کے ساتھ داڑھی والا نوجوان طارق ہے۔ جس نے دہلی میں تباہی مچا دی تھی اور جموں کے قریب اودھم پور کی فوجی چوکی کو تباہ کیا تھا تو اُس کی گرفتاری پر نہ صرف ایک دم کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی جاتی بلکہ انعامی رقم سے اُس کے بینک بیلنس میں بھی لاکھوں کا اضافہ ہو جاتا۔ طارق اور اعظم اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے، جب تک پولیس وین موڑ گھوم کر نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

''وحشی..... بھیڑیئے۔'' اعظم بڑبڑایا۔

''بچ گئے۔ اگر اُنہیں کسی قسم کا شبہ ہو جاتا تو دھر لئے گئے تھے۔'' طارق نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے میں یہاں اُن کی لاشیں بچھا دیتا طارق بھائی!'' اعظم نے کہا۔ ''لنگڑا ہوں تو کیا

ہوا؟ میری یہ بیساکھیاں دیکھی ہیں تم نے؟ یہ بیساکھیاں نہیں، مشین گنیں ہیں۔ ایک منٹ میں سب کو بھون کر رکھ دیتا۔''

طارق اُس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اعظم کی دونوں بیساکھیاں ضرورت کے وقت مشین گنوں ہی کا کام دے سکتی تھیں۔ یہ بیساکھیاں اعظم نے مظفر آباد میں خاص طور سے بنوائی تھیں۔ اندر آٹو میٹک رائفلیں تھیں اور اُوپر کھوکھلے بانس چڑھے ہوئے تھے۔

اعظم کے بیٹھتے ہی طارق نے موٹر سائیکل آگے بڑھادی۔ پہاڑی سڑک پر ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے وہ آخر کار مکان پر پہنچ گئے۔ رحمان بابا کو اس وقت تیز بخار تھا اور اُس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اعظم نے رحمان بابا کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ اس عمر میں قوتِ برداشت سے زیادہ مشقت نے ان کی یہ حالت کر دی ہے۔ انہیں دو تین روز تک مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میں انجکشن دے دیتا ہوں۔ بخار اُتر جائے گا۔ جب تک رحمان بابا ٹھیک نہیں ہو جائیں گے، میں یہیں رہوں گا۔''

اعظم نے رحمان بابا کو انجکشن لگا دیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد رحمان بابا پُرسکون نیند سو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد طارق نے رحمان بابا کی پیشانی کو چھو کر دیکھا، بخار اُتر گیا تھا۔

شام ہونے تک رحمان بابا کا بخار بالکل اُتر گیا۔ اعظم نے اُسے دو گولیاں کھلا دیں۔ اس بخار نے رحمان بابا کو بالکل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کمزوری بے حد بڑھ گئی تھی۔ طارق کا خیال تھا کہ اب وہ کئی روز تک بستر سے نہیں اُٹھ سکے گا۔

رات کا کھانا طارق اور اعظم نے رحمان بابا کے کمرے میں بیٹھ کر کھایا تھا۔ اُن کا میزبان ہاشم بھی موجود تھا۔ رحمان بابا بھی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُن میں شہر کی تازہ ترین صورتِ حال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اب تک ملنے والی اطلاعات کے مطابق پولیس اور فوج صبح ہی سے رحمان بابا اور اُن کے اُن ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھی، جنہوں نے کل رات ایک فوجی جیپ اور ٹرک کی تباہی کے علاوہ متعدد فوجیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ تلاشی کا یہ کام اُس علاقے سے شروع ہوا تھا، جہاں سے رات کو ہنگامے شروع ہوئے تھے۔ اور جہاں آخری مرتبہ رحمان بابا کو دیکھا گیا تھا۔ اور پھر تلاشی کا یہ سلسلہ پورے شہر میں پھیل گیا تھا۔ پولیس اور فوج اب تک لاتعداد افراد کو گرفتار کر چکی تھی۔ لیکن وہ رحمان بابا کے ساتھیوں میں سے کسی کا بھی سراغ نہیں لگا سکے۔

''یہ سلسلہ کب تک چلے گا رحمان بابا؟'' اعظم نے کہا۔ ''کیا یہ ممکن نہیں کہ وادی میں حریت

ہندوؤں کی تمام تنظیمیں متحد ہو کر غاصبوں کے خلاف کارروائی کریں؟ ہماری تنظیمیں خود آپس میں بیت و گریباں ہیں۔ ہماری طاقت بکھری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غاصب ہندو ہمیں اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اگر ہماری تنظیمیں متحد ہو جائیں تو غلامی کا یہ طوق اُتار کر پھینکا جا سکتا ہے۔ اور غاصبوں کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔''

''یہی تو دُکھ ہے کہ ہم میں اتفاق و اتحاد نہیں ہے۔'' رحمان بابا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس وقت ہمیں سب سے زیادہ ضرورت آپس کے اتحاد اور اتفاق کی ہے۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور دشمن ہماری اس ناچاقی سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔''

''بھارتی عفریت تو ہشت پا کی طرح پھیل رہا ہے۔'' اعظم نے کہا۔ ''بھارتی حکومت نے فوج کو مزید وسیع اختیارات دے دیئے ہیں۔ پانچ نئے قوانین کے تحت جن میں نیشنل سکیورٹی ایکٹ اور آرمڈ فورسز سپیشل ایکٹ قابلِ ذکر ہیں۔ کشمیر میں فوج کو اتنے وسیع اختیارات مل چکے ہیں کہ وہ جس کو چاہے گولی سے اُڑا دے، جس گھر کو چاہے جلا کر راکھ کر دے۔ اُن سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔ وادی کشمیر ان پانچ چنگیزی قوانین کے سائے میں دہشت و بربریت کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ان چنگیزی قوانین کے خلاف نہ صرف عالمی رائے عامہ نے صدائے احتجاج بلند کی ہے بلکہ خود بھارتی دانشور بھی ان قوانین کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ہندوستانی حکمران، کشمیریوں کی نسل کشی پر کمربستہ نظر آ رہے ہیں۔ کشمیریوں کا قصور یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور بھارت سے اپنے بنیادی حق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہی وہ پانچ چنگیزی قوانین ہیں، جن کے سہارے بھارتی فوج، وادی کشمیر میں آگ اور خون کی ہولی کھیل رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کو بار بار کشمیری عوام کے خون سے کھیلی جانے والی ہولی سے آگاہ کیا گیا۔ لیکن اس ادارے پر بھی مسلم دشمنوں کا قبضہ ہے۔ اقوامِ متحدہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کے لئے امریکہ کے ذریعے عراق کی تو اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔ لیکن اُسے وادی کشمیر میں بے گناہوں کے خون کی بہتی ہوئی ندیاں نظر نہیں آتیں۔'' اعظم ایک لمحے کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''حالات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بھارت، کشمیر کی مکمل تباہی، کشمیری نوجوانوں کی پوری نسل کے خاتمے اور کشمیریوں کے جذبہ آزادی کو کچلنے کے لئے تمام مکروہ ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ چانکیہ کے پیروکار تو کشمیری مسلمانوں پر مظالم توڑنے پر کمربستہ ہیں۔ لیکن مسلم

ممالک خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں کہ آگے بڑھ کر بھارت کو اس درازدستی اور بدمستی سے روک دے۔ مگر ان مشکلات کے باوجود کشمیریوں کے حوصلے بلند ہیں۔''

''ہاں.....!'' رحمان بابا نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''یہ جذبے، ولولے اور حوصلے ہی ہمارا سرمایہ اور ہتھیار ہیں۔ اور ہم ہتھیار کبھی نہیں ڈالیں گے۔''

''اگر کشمیری مسلمانوں میں یہ جذبہ اور حوصلہ نہ ہوتا تو اب تک سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا۔'' اعظم نے کہا۔ ''گزشتہ دو برسوں میں وادی میں جو کچھ بھی ہوا، اس سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ سرینگر، اننت ناگ، کپواڑہ، سوپور، بانڈی پور، گلمرگ، بارہ مولا۔ بٹ مالو، غرض ہر بستی آگ اور دُھویں سے سلگ رہی ہے۔ ٹارچر سیلوں میں مسلمان نوجوانوں کو ایسی ایسی اذیتیں دی جا رہی ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال تلاش کرنا مشکل ہے۔ پچھلے دو سال کے اعداد و شمار کے مطابق اب تک وادی میں 34515 مجاہدین کو شہید کیا جا چکا ہے۔ جبکہ 55242 افراد کو زخمی اور معذور کیا جا چکا ہے۔ ہندواڑہ میں دو سو معصوم طلبہ کو زندہ جلا دیا گیا۔ راجستھان کے کیمپوں میں 15530 کشمیری مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جبکہ 21425 نوجوانوں کو کشمیر ہی کے مختلف کیمپوں میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ 41550 نوجوانوں کو مختلف جیلوں کے ٹارچر سیلوں میں ہر طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ 725 خواتین شہید ہو چکی ہیں۔ 355 بچے زخمی ہو کر علاج نہ ہونے کی وجہ سے لقمہ اجل بن گئے۔ 5500 مکانات اور دُکانیں جلا دی گئیں۔ جلائے گئے ہسپتالوں اور سکولوں کی تعداد میں 565 ہو چکی ہے۔ انسان اور عمارتیں تو کیا، حیوانوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ 1345 مویشی زندہ جلائے جا چکے ہیں۔ 1220 ملین ڈالر کی خوراک کو بھی نذرِ آتش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ 1120 ملین ڈالر کے باغات اور جنگلات بھی جلائے جا چکے ہیں۔ کیا یہ اعداد و شمار اقوام متحدہ، عالمی امن کے اداروں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کے لئے کافی نہیں ہیں؟ وادی میں بسنے والے مقہور انسانوں کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ استصواب رائے کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مانگتے ہیں۔'' اعظم خاموش ہو گیا۔ کمرے کی فضا پر گویا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ رحمان بابا کے چہرے کے تاثرات ہر لحظہ بدل رہے تھے۔

''تم نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس میں ایک فیصد بھی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔'' آخر کار رحمان بابا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جو اعداد و شمار بتائے ہیں، وہ بھی بالکل درست ہیں۔ بلکہ اب تک ان میں مزید اضافہ ہو چکا ہو گا۔ اگر ہم میں اتفاق ہوتا تو اس قوم کو اتنا نقصان نہ اُٹھانا پڑتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اگر ہم متحد ہو جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ میں نے وادی کے تمام لیڈروں کو ملاقات کے لئے

لایا ہے۔ یہ تمام اعداد و شمار اُنہیں بھی معلوم ہوں گے۔ کل میں ایک اور کوشش کروں گا کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات ختم کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو ہم ان غاصب حکمرانوں کو چند گھنٹوں کے اندر اندر یہاں سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔''

''آپ نے کل میٹنگ بلائی ہے..... کہاں؟'' اعظم نے پوچھا۔

''کل رات..... حضرت بل میں۔'' رحمان بابا نے جواب دیا۔

''لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میٹنگ میں کوئی نہیں آئے گا۔'' اعظم نے کہا۔ ''ماضی میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے گرد چار خوشامدی جمع کر لئے ہیں، چاہتا ہے کہ اُسے لیڈر تسلیم کر لیا جائے۔''

''اگر کسی میں اتنی صلاحیت ہو تو ہمیں اُس کے پیچھے چلنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' رحمان بابا نے جواب دیا۔

''اگر ان لوگوں میں قیادت کی صلاحیت ہوتی تو کشمیر بہت عرصہ پہلے آزاد ہو چکا ہوتا۔ مگر ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو محض نعرے لگا لینے کو ہی لیڈر شپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے نام نہاد لیڈر بکاؤ مال ہیں۔ یہ لوگ بار بار اپنے ہی دشمن کے ہاتھ بک جاتے ہیں۔ بعض لیڈر آج کل خود مختار کشمیر کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ اور یہ بات تو کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ خود مختار کشمیر کا نعرہ لگانے والے کشمیر اور کشمیریوں کے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ ہماری بقاء صرف اور صرف پاکستان کے ساتھ رہنے میں ہے۔ خود مختاری کا نعرہ لگا کر ہمیں نیپال یا بھوٹان بن کر رہنا ہو گا۔'' اعظم بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' رحمان بابا نے جواب دیا۔ ''یہ دراصل بھارتی حکمرانوں کا منصوبہ اور کشمیریوں کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ہے۔ میرے پاس اس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ میں اپنے ان دوستوں کو کل میٹنگ میں بھارتی حکمرانوں کی اس سازش سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے بعض لوگ لیڈری کے شوق میں نادانستہ طور پر یا کسی لالچ میں آ کر اس سازش کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ میں اُنہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔''

''لیکن کل آپ اس میٹنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔'' اعظم نے کہا۔

''کیوں.....؟'' رحمان بابا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو دو چار روز کے لئے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اور اگر خدانخواستہ طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو.....''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' رحمان بابا نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''لیکن میں آپ کو اس مکان سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' اعظم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کیا تم مجھے حکم دے رہے ہو لڑکے؟'' رحمان بابا نے اُسے گھورا۔

''میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا رحمان بابا!'' اعظم بولا۔ ''آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور پھر پورے شہر میں آپ کی تلاش ہو رہی ہے۔ پولیس اور فوجی شکاری کتوں کی طرح سرینگر کے گلی کوچوں میں آپ کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ آپ کو اگر کچھ ہو گیا تو.....''

''تم بہت جذباتی ہو گئے ہو۔'' رحمان بابا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں اپنے جانے یا نہ جانے کے بارے میں کل فیصلہ کروں گا۔''

اعظم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر طارق نے اعظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے گھر نہ پہنچنے سے تمہاری والدہ اور بہن پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کہو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں؟''

''میں نے ماں کو بتا دیا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ یہ بھی کہہ آیا تھا کہ اگر رات کو بھی واپس نہ آؤں تو پریشان نہ ہوں۔'' اعظم نے جواب دیا۔ پھر وہ رحمان بابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''گیارہ بجنے والے ہیں رحمان بابا! اب آپ سو جایئے۔''

''کوشش کرتا ہوں۔'' رحمان بابا نے جواب دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

☆

اس گھر میں ہاشم اور اُس کے افرادِ خانہ کے علاوہ چار آدمی اور تھے۔ یہ چاروں مجاہدین تھے جو رات بھر مکان کی چھت پر کھڑے پہرہ دیتے رہے۔

دوپہر کے لگ بھگ رحمان بابا کو پھر بخار ہو گیا۔ سرینگر میں رحمان بابا کے تین نائبین بھی پہنچ چکے تھے۔ رحمان بابا نے اُن سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اُس کے دو نائبین اور طارق شام کو حضرت بل جائیں گے اور رحمان بابا کے نمائندوں کی حیثیت سے میٹنگ میں شریک ہونے والے لیڈروں کے سامنے اُن کے مؤقف کی وضاحت کریں گے۔

کشمیری لیڈروں سے میٹنگ کا وقت نمازِ عشاء کے بعد طے کیا گیا تھا۔ طارق اور رحمان بابا کے دونوں نائبین مغرب کی اذان سے کچھ پہلے گھر سے نکل گئے۔ علی اور طارق اکٹھے نکلے تھے

موسیٰ کچھ وقفے کے بعد نکلا تھا۔ اور اُس کا راستہ بھی الگ تھا۔

وہ ہری پربت سے اُتر کر ڈل جھیل پر آ گئے۔ شام کے وقت جھیل اور اس کے چاروں طرف بورڈ پر بڑی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ لیکن آج بلیوارڈ اس لحاظ سے سنسان پڑا تھا کہ وہاں کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا، جس کا شمار عوام میں ہوتا ہو۔ جگہ جگہ فوجی اور پولیس والے ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ ڈل جھیل میں کھڑی ہوئی ہاؤس بوٹس اور بجرے بھی ویران تھے۔ عام حالات میں باہر سے آنے والوں کو ہاؤس بوٹس پر جگہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن اب ہاؤس بوٹس کے مالکان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

طارق اور علی، جھیل کے کنارے چلتے ہوئے اُس طرف آ گئے، جہاں چند شکارے کھڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں پیڈل سے چلتی تھیں اور سیاحوں کو ٹیکسی کے طور پر کرائے پر مل جاتی تھیں۔ وہاں صرف دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کی طرف لپکے۔ اُن کے زردی مائل چہرے بتا رہے تھے کہ وہ فاقہ مستی کا شکار تھے۔ ہاؤس بوٹس، بجروں اور شکاروں کے مالکان کے کاروبار کا انحصار سیاحوں پر تھا۔ لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے سرینگر میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ سیاحوں کی آمد بند ہو گئی تھی اور سرینگر میں ہر قسم کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا۔

''کتھے جُل سو جی؟ ویکھو نا! میرا شکارا کڈا سوہنا ہے۔ نسانوں کوئی تکلیف نہ ہوسی جی۔'' ایک آدمی نے اُن کے قریب آ کر کہا۔ اُنہیں دیکھ کر اُس کے چہرے پر اُمید کی ہلکی سی کرن اُبھر آئی تھی۔

''او، ویکھو جی میری ناگن کس طرح لشکارے پئی ماردی اے۔'' دوسرے آدمی نے اُنہیں اپنے شکار کی طرف متوجہ کیا۔

طارق اور علی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر علی اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے بھئی! ٹھیک ہے۔ ہم تم دونوں کے شکارے لے لیتے ہیں۔ یہ پیسے رکھ لو! ہم دو گھنٹوں میں واپس آ جائیں گے۔'' اُس نے جیب سے چند نوٹ نکال کر اُن دونوں کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

اُن دونوں کے چہرے گلاب کی طرح کھل اُٹھے تھے۔ طارق اور علی الگ الگ شکاروں پر بیٹھ گئے اور پیڈل چلاتے ہوئے اُنہیں واٹر وے کی طرف لے جانے لگے۔ ڈل جھیل سے نکل کر وہ اُس آبی راستے پر آ گئے جس کے دونوں طرف مغل گارڈنز تھے۔ چشمہ شاہی، پری محل، نشاط باغ اور شالیمار بھی ویران نظر آ رہے تھے۔ قطار در قطار چنار کے قد آور درخت بھی اُداس

اور ملول کھڑے تھے۔ شالیمار کے قریب اُنہوں نے شکارے روک لئے۔ اُن کی رسیاں کنارے پر پودوں سے باندھ کر وہ اُتر گئے اور ایک پگڈنڈی پر تیز تیز چلنے لگے۔ وہ جلد ہی اُس کشادہ راستے پر پہنچ گئے جو ناگن جھیل اور پرانے شہر کو حضرت بل سے ملاتا تھا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ اس کشادہ راستے سے ہٹ کر پودوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ ایک چھوٹی سی چٹان پر پہنچ کر وہ رُک گئے۔ اُس چٹان کے دوسری طرف کچھ فاصلے پر درگاہ حضرت بل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

''کچھ دیر یہاں رُک جاؤ..... میں تھک گیا ہوں۔ سانس لے لیں تو چلتے ہیں۔'' علی کہتے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

طارق بھی اُس کے قریب ہی دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ علی نے جیب سے بیڑیوں والی ڈبیا نکالی۔ ٹن کی اس ڈبیہ میں تین چار بیڑیاں تھیں۔ ایک اُس نے اپنے دانتوں میں دبالی اور ڈبیا طارق کی طرف بڑھادی۔ طارق نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ علی نے بیڑی سلگالی اور ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ اسی وقت درگاہ حضرت بل کی طرف سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اذان کی یہ آواز پہاڑوں میں چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

بیڑی کا آخری کش لگا کر علی نے اُسے ایک پتھر پر مسل دیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ طارق نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور وہ ڈھلان پر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ دس منٹ میں وہ حضرت بل کی درگاہ پر پہنچ گئے۔

سنگ مرمر کی اس خوبصورت مسجد میں نمازیوں کی تعداد اس وقت اُنگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ علی اور طارق بھی وضو کر کے نمازیوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

نماز کے بعد وہ مسجد کے صحن کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ اُن کا تیسرا ساتھی موسیٰ بھی آ گیا تھا۔ عام طور پر نماز کے بعد دیر تک لوگ یہاں بیٹھے مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ لیکن اس وقت ان تینوں اور مسجد کے دو خادمین کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ تمام لوگ نماز پڑھتے ہی رُخصت ہو گئے تھے۔ وہ لوگ دو گھنٹے تک مسجد میں بیٹھے رہے۔ لیکن جن کا انتظار تھا اُن میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔

''میرا خیال ہے، اب چلنا چاہئے۔ کوئی نہیں آئے گا۔'' علی نے کہا۔

''تھوڑی دیر مزید انتظار کر لیا جائے۔'' طارق نے جواب دیا۔

وہ مزید آدھے گھنٹے تک مسجد میں بیٹھے رہے، لیکن کوئی نہیں آیا۔ آخر کار وہ تینوں مسجد سے نکل آئے۔ واپسی پر وہ ناگن جھیل کے قریب سے ہوتے ہوئے پرانے شہر کی طرف نکل گئے۔ کلوال

محلہ سے گزرتے ہوئے فائرنگ کی آواز سن کر وہ اُچھل پڑے..... یوں لگا تھا جیسے فائرنگ اُن کے بالکل قریب ہوئی ہو۔ کچھ ہی دیر بعد فائرنگ کے ساتھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ تینوں چاروں طرف دیکھنے لگے اور آخر کار ایک مکان کی ڈیوڑھی میں گھس گئے۔ کچھ ہی دیر بعد تین لڑکے دوڑتے ہوئے اُس گلی میں داخل ہوئے۔ اُن کی عمریں چودہ سے سترہ سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ وہ خالی ہاتھ تھے اور اُن کے پیچھے تین پولیس والے لگے ہوئے تھے۔ ایک پولیس والے کے پاس رائفل تھی اور دو کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ دو لڑکے تو تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں گھس گئے۔ تیسرا لڑکا بھی اسی گلی میں گھسنا چاہتا تھا لیکن اُسے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا، تینوں پولیس والے اُس کے سر پر پہنچ گئے۔ دو پولیس والے ڈنڈوں سے لڑکے کی دُھنائی کرنے لگے۔ جبکہ تیسرا رائفل تانے کھڑا رہا۔

لڑکے کی چیخوں سے فضا تھرا رہی تھی۔ ڈنڈوں اور بھاری بوٹوں کی ہر ٹھوکر اُسے بلبلانے پر مجبور کر دیتی۔ تیسرا پولیس والا بھی اُسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ لڑکے کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ اُس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔

لڑکے کی چیخوں کی آواز سن کر کسی گھر سے کوئی بھی شخص باہر نہیں آیا تھا۔ طارق کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ مکان کی ڈیوڑھی سے نکل کر شیر کی طرح دہاڑتا ہوا پولیس والوں کی طرف لپکا۔ اُس کا رُخ اُس پولیس والے کی طرف تھا، جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ پولیس والے نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے فائر کر دیا۔ گولی، طارق کے سر سے صرف دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ اُس نے پولیس والے کو دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے اُوپر جا گرا۔

علی اور موسیٰ بھی ڈیوڑھی سے نکل آئے۔ اُن تینوں نے پولیس والوں کو چھاپ لیا۔ پولیس والوں کے ڈنڈے اب اُنہی پر برس رہے تھے۔ اب اُن کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں۔ وہ زمین پر لوٹتے ہوئے رام کی دہائی دینے لگے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ ظالم جب خود مظلوموں کے ہتھے چڑھتا ہے تو گڑگڑانے لگتا ہے۔ طارق، موسیٰ اور علی کی ٹھوکریں اُنہیں ذبح ہوتے ہوئے بکروں کی طرح بلبلانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اب بہت سے لوگ بھی مکانوں سے نکل آئے تھے۔ تین چار آدمی تو زخمی لڑکے کو اُٹھا کر لے گئے اور باقی پولیس والوں پر پل پڑے۔ طارق نے رائفل اُٹھالی تھی۔ اور ایک طرف کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ علی اور موسیٰ بھی ہٹ گئے۔ لیکن اُنہوں نے محلے کے لوگوں کو نہیں روکا۔ محلے کے لوگوں نے اپنے پیر اُس وقت روکے جب

تینوں پولیس والوں کی رُوحیں دوسرا جنم لینے کے لئے رُخصت ہوگئیں۔

محلے کے لوگ، پولیس والوں کی لاشیں گھسیٹتے ہوئے گندے نالے کی طرف لے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لاشوں کو گندے نالے میں پھینک کر آ گئے۔ محلے والے اب گلیوں میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ طارق وغیرہ بھی وہیں رُکے رہے۔ پولیس والے عام طور پر تنگ گلیوں میں نہیں جاتے۔ اُن تینوں کی موت ہی آئی تھی جو اُن لڑکوں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے تھے۔ دن کا وقت ہوتا تو مزید پولیس والوں کی آمد کی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن رات کے گیارہ بجے پولیس والے ان تنگ و تاریک اور پُر پیچ گلیوں میں گھسنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ طارق اپنے ساتھیوں کے ساتھ کچھ دیر مزید وہاں کھڑا رہا۔ پھر اُس نے رائفل ایک آدمی کے حوالے کر دی اور وہاں سے رُخصت ہو گئے۔

جب وہ ہری پربت پر اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ رحمان بابا ابھی تک جاگ رہا تھا۔ طارق نے جب اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اُس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔ وہ دوسرے کشمیری لیڈروں کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ان لیڈروں کو متحد کرنے کی کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اور اُس کی یہ کوشش بری طرح ناکام ہوگئی تھی۔ لیکن رحمان بابا مایوس نہیں ہوا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وادی کشمیر کے تمام لیڈر ایک نہ ایک دن اپنی ذاتی رنجشیں بھلا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گے۔ اور اُن کی متحدہ قوت بھارتی سامراج کو کشمیر سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور کر دے گی۔ لہٰذا رحمان بابا نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھے گا۔

صبح ہوتے ہی سرینگر ایک بار پھر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔ پولیس رات بھر اپنے تین ساتھیوں کو تلاش کرتی رہی تھی اور صبح سویرے اُن تینوں کی لاشیں محلہ کلوال کے گندے نالے میں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ وہ گندہ نالہ چونکہ محلہ کلوال میں تھا۔ اس لئے پولیس نے گویا یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُن تینوں پولیس والوں کے قتل کے ذمہ دار بھی محلہ کلوال والے ہی ہیں۔ اور دہشت گردوں کو بھی اسی علاقے کے لوگوں نے پناہ دے رکھی ہے۔ لہٰذا گندے نالے سے لاشوں کے ملنے کے فوراً بعد پولیس کی بھاری جمعیت نے محلہ کلوال کو گھیرے میں لے لیا اور رات والے دہشت گردوں کی گرفتاری کے لئے گھروں کی تلاشی شروع کر دی گئی۔

لوگوں کے احتجاج کے باوجود پولیس والے زبردستی گھروں میں گھس جاتے۔ بعض گھروں میں تلاشی کے بہانے الماریاں توڑ کر نقدی اور زیورات لوٹ لئے گئے۔ احتجاج کرنے والوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا گیا۔ بوڑھوں کو زدوکوب کیا گیا اور جوان لڑکیوں اور عورتوں کو بالوں سے

پکڑ کر اُنہیں گھسیٹ کر اُن کی بے حرمتی کی گئی۔ اور کئی بے گناہوں کو پکڑ کر تھانے میں بھجوا دیا گیا۔

تین پولیس والے ایک گھر کا دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ اُس گھر میں پچاس سالہ بوڑھا ضیغم، اُس کی جوان بیٹی صائمہ اور جوان بیٹا مظہر رہائش پذیر تھے۔ مظہر چند روز پہلے زیرو برج کے قریب دریا میں گر کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا تھا۔ اور کئی روز سے بستر پر پڑا تھا۔ اُس کی بہن صائمہ کی آنے والی گرمیوں میں شادی ہونے والی تھی۔ باپ نے پیسہ پیسہ جوڑ کر بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے کچھ زیور بھی بنوا رکھا تھا۔

پولیس والے جب دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہوئے تو بوڑھے ضیغم نے صائمہ کو ایک کمرے میں کپڑوں والی الماری میں بند کر دیا۔ وہ اُن بھارتی درندوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تلاشی کے بہانے زبردستی گھروں میں گھس کر عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ وہ سلوک کرتے تھے کہ وہ زندگی بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی تھیں۔

''کیا بات ہے جناب..... آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' ضیغم نے باری باری تینوں پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں اُن دہشت گردوں کی تلاش ہے، جنہوں نے پچھلی رات تین پولیس والوں کو قتل کر دیا ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔ اُس کے لہجے میں فرعونیت تھی۔

''یہاں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔'' ضیغم نے جواب دیا۔

''ہم کمروں کی تلاشی لیں گے۔'' ایک پولیس والا اُسے دھکا دیتے ہوئے غرایا۔ ضیغم لڑکھڑا کر گرا۔ اُس کے سنبھلنے سے پہلے دو پولیس والے اُس کمرے میں گھس گئے جہاں چارپائی پر مظہر پڑا ہوا تھا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اُس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔

''تم تو کہتے تھے، یہاں کوئی آدمی نہیں ہے۔ یہ کون ہے.....؟'' ایک پولیس والے نے ضیغم کو گھورا، جو دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

''یہ..... یہ میرا بیٹا ہے، اور بیمار ہے۔'' ضیغم نے جواب دیا۔

پولیس والے نے آگے بڑھ کر مظہر کے اُوپر پڑا ہوا کمبل کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اُس کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر پولیس والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''تو گویا تم بھی رات کو تین پولیس والوں کے قتل میں شامل تھے۔ تمہاری ٹانگ پر شاید گولی لگی تھی۔'' پولیس والے نے کہا۔

''نن..... نہیں۔ میں تو کئی روز سے گھر سے باہر نہیں نکلا۔'' مظہر نے خوف سے ہکلاتے

ہوئے جواب دیا۔ ''ٹانگ کا یہ زخم تو بہت پرانا ہے۔ میں کئی روز پہلے زیرو برج سے دریا میں گر گیا تھا۔ جس سے ٹانگ ٹوٹ.....''

''تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں.....؟'' پولیس والے نے غراتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔

''مم..... میرا کوئی ساتھی نہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔'' مظہر ہکلایا۔

''تمہارے ساتھیوں کا پتہ تو ہم، تم سے پوچھ ہی لیں گے۔'' پولیس والے نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کی نال مظہر کی ٹانگ پر اُس جگہ ماری جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مظہر، تکلیف کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔

''اسے کچھ مت کہو..... یہ..... یہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' بوڑھا ضیغم چیختا ہوا آگے بڑھا۔ دوسرے پولیس والے نے پوری قوت سے رائفل کا بٹ اُس کے منہ پر مار دیا۔ بٹ، ضیغم کے جبڑے پر لگا۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اُس کے دو دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ پولیس والے نے اُس پر رائفل تان لی۔

''اب اگر اِس دہشت گرد کی دلالی کرنے کی کوشش کی تو گولی سے اُڑا دوں گا۔''

''بتاؤ..... تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟'' پہلا پولیس والا مظہر کی طرف دیکھ کر دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مظہر کی زخمی ٹانگ پر رائفل کی نال سے ٹھوکہ بھی دے دیا تھا۔

''مم..... میں کچھ نہیں جانتا۔'' مظہر چیخا۔

اسی لمحے دوسرے کمرے سے نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس کے چند سیکنڈ بعد تیسرا پولیس والا صائمہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اُس کمرے میں لے آیا۔ ''اس بڈھے نے یہ مال تو الماری میں چھپا رکھا تھا۔'' تیسرے پولیس والے نے صائمہ کو دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

''یہ..... یہ میری بہن ہے۔ اسے کچھ مت کہو!'' مظہر چیخا۔

''اب تو ہم بہت آسانی سے تم سے تمہارے ساتھیوں کا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔'' پہلے پولیس والے نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا۔ دونوں پولیس والے صائمہ سے لپٹ گئے۔ صائمہ چیخ چیخ کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے ایک پولیس والے کے ہاتھ پر کاٹ بھی لیا۔ لیکن پولیس والے اُس سے زیادہ طاقتور تھے۔ چند لمحوں میں ہی صائمہ کا لباس تار تار ہو گیا..... اُس کا بالائی جسم بالکل برہنہ تھا۔ ایک پولیس والے نے اُس کے دونوں ہاتھ پشت پر گرفت میں لے رکھے تھے اور صائمہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ دوسرے پولیس والے نے رائفل پر لگی ہوئی سنگین کی نوک، صائمہ کے سینے سے لگا رکھی تھی۔

''اگر تم نے اب بھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں نہ بتایا تو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری بہن کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا، اسے شاید تم.....''

''نہیں.....!'' مظہر چیخا۔ بھائی کے سامنے اُس کی جوان بہن کو برہنہ کر دیا گیا تھا اور بھائی کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ مظہر زخمی ہونے کے باوجود کسی طاقتور سپرنگ کی طرح چارپائی سے اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اُس پولیس والے پر جا گرا جس نے صائمہ پر سنگین تان رکھی تھی۔ وہ پولیس والے کو اپنے ساتھ لیتا ہوا فرش پر گرا۔ رائفل پولیس والے کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

تینوں پولیس والے گالیاں بکتے ہوئے مظہر پر ٹوٹ پڑے۔ اُنہوں نے مظہر پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ مظہر کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں۔ پولیس والے جنون میں آ کر شاید صائمہ اور اُس کے بوڑھے باپ کو بھول گئے تھے۔ ضیغم تو دروازے کے باہر بے ہوش پڑا تھا۔ صائمہ نے لپک کر پولیس والے کی فرش پر گری ہوئی رائفل اُٹھا لی۔ اور اُس کا رُخ ایک پولیس والے کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا..... ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ گولی، پولیس والے کے سینے میں لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے پولیس والے جیسے ہوش میں آ گئے۔ وہ مظہر کو چھوڑ کر صائمہ کی طرف لپکے۔ صائمہ نے ایک بار پھر ٹرائیگر دبایا، لیکن اس مرتبہ گولی کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ تیسرا فائر کرنے سے پہلے پولیس والوں نے اُسے گرفت میں لے لیا..... وہ وحشی درندوں کی طرح صائمہ پر ٹوٹ پڑے۔

اچانک فضا میں نعرۂ تکبیر کی صدا گونجی۔ پولیس والے یہ آواز سن کر چونک گئے۔ اللہ اکبر کی یہ صدا بجلی بن کر دونوں پولیس والوں کے حواسوں پر گری۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر صائمہ کو چھوڑ کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ مکان کے دروازے سے نکل کر اُنہوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ دائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر بیس بائیس آدمی نعرے لگاتے ہوئے اُسی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ہاکیاں وغیرہ تھیں۔ دونوں پولیس والوں کے پاس اگرچہ آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اُنہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔

ہجوم بھی ہاکیاں اور ڈنڈے لہراتا ہوا اُن کے پیچھے دوڑا۔ یہ گلی جہاں سے کشادہ سڑک سے ملتی تھی، وہاں پر ہجوم نے دونوں پولیس والوں کو پکڑ لیا۔ آٹومیٹک رائفلیں پاس ہونے کے باوجود پولیس والے اس قدر دہشت زدہ تھے کہ وہ رائفلوں سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ اُنہیں فائرنگ کا موقع دیئے بغیر دو آدمیوں نے اُن سے رائفلیں چھین لیں اور باقی لوگ لاتوں اور گھونسوں سے

پولیس والوں کی دُھنائی کرنے لگے.....

''فوج آ گئی.....!'' ہجوم میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔

مین روڈ کی طرف سے دو ٹرک بڑی تیزی سے اُس طرف آ رہے تھے۔ آگے فوج کا ٹرک تھا۔ اور اُس کے پیچھے پولیس کا ٹرک۔ لوگ، پولیس والوں کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر گلیوں میں دوڑنے لگے۔ تین چار آدمی اکٹھے ہی ایک گلی میں گھس گئے۔ اُن میں وہ آدمی بھی شامل تھا جس نے ایک پولیس والے سے رائفل چھینی تھی۔ ٹرک، رُک چکا تھا۔ پانچ چھ فوجی ٹرک سے اُتر کر فائرنگ کرتے ہوئے اُن کے پیچھے دوڑے۔ وہ دوڑتے ہوئے ایک چھوٹی سی مسجد میں گھس گئے۔ رائفل والے نوجوان نے فائرنگ کر کے فوجیوں کو روکنے کی کوشش کی، مگر اُس کی رائفل کا میگزین جلد ہی خالی ہو گیا۔ اُن لوگوں نے مسجد کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ فوجی پہلے تو دروازے پر فائرنگ کرتے رہے، پھر دروازہ توڑ کر مسجد میں گھس گئے اور اندھا دُھند چاروں طرف فائرنگ کرنے لگے۔ سب سے پہلے مسجد کا خادم فائرنگ کی زد میں آیا۔ اُس کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو گیا اور خون، فرش پر بہنے لگا..... پھر وہ نوجوان، فوجیوں کے ہاتھ لگ گیا، جس نے پولیس والے کی رائفل چھینی تھی۔ فوجی پہلے اُس کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کرتے رہے، پھر ایک فوجی نے رائفل کے بٹ سے اُس کے سر پر لگاتار ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ نوجوان کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی۔ اُس کا خون اور بھیجہ فرش پر بکھر گیا۔

تین آدمیوں نے مسجد کے ہال والے کمرے میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اخروٹ کی لکڑی کا یہ دروازہ خاصا مضبوط تھا۔ فوجی کوشش کے باوجود اُسے توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آخر کار ایک فوجی نے مسجد میں پڑی ہوئی چٹائیاں اُٹھا کر دروازے کے سامنے ڈھیر کر دیں اور دوسرے فوجیوں نے اُن چٹائیوں کو آگ لگا دی..... فوراً ہی الاؤ بھڑک اُٹھا..... مسجد کے ہال کی دیواریں نیچے تین فٹ تک پتھروں کی تھیں اور اُوپر لکڑی کے تختے تھے۔ چھت بھی لکڑی کی تھی۔ دروازے اور دیواروں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔

آگ لحہ بہ لحہ پھیلتی گئی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ دو فوجیوں نے اُسے پکڑ کر دوبارہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا..... آگ پھیلتی رہی اور مسجد کے کمرے سے چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ فوجی، مسجد کے صحن میں کھڑے وحشیانہ انداز میں قہقہے لگاتے اور فائرنگ کرتے رہے۔

وہ تینوں نوجوان مسجد کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ فوجی فائرنگ کرتے ہوئے اپنے ٹرک کے پاس آ گئے۔ اس دوران یہاں عوام اور فوجیوں میں ایک مختصر سی جھڑپ ہو چکی تھی جس

میں تین فوجی ہلاک ہو چکے تھے اور چار کشمیری مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ فوج کی مزید کمک آ جانے کی وجہ سے لوگ اِدھر اُدھر کی گلیوں میں روپوش ہو گئے تھے۔

رحمان بابا کو شہر کے حالات کی رپورٹیں مل رہی تھیں۔ اُس نے علی اور موسیٰ کے ذریعے سرینگر میں موجود اپنی تنظیم کے تمام مجاہدین کو یہ حکم جاری کر دیا کہ وہ سرینگر اور اس کے آس پاس فوجی چوکیوں اور فوجی قافلوں پر حملے جاری رکھیں۔

رات نو بجے کے لگ بھگ رحمان بابا کو اطلاع ملی کہ باندی پورہ کے نواح میں بھارتی فوج ایک نئی چوکی قائم کر رہی ہے۔ مجاہدین اگرچہ اُس علاقے پر حملے جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن اُنہیں مزید امداد کی ضرورت ہے۔ رحمان بابا نے موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی باندی پورہ روانہ ہو جائے اور راستے میں جتنے بھی مجاہدین دستیاب ہوں، اُنہیں ساتھ لے لیا جائے۔ موسیٰ نے رات بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہ سرینگر سے روانہ ہو کے شام سے پہلے گندربل پہنچ گیا۔ وہ اگر چاہتا تو سفر جاری رکھ کر رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے وولر جھیل تک پہنچ سکتا تھا۔ وہاں سے صبح ہوتے ہی باندی پورہ پہنچ جاتا۔ لیکن گندربل میں چند مجاہدین نے اُسے روک لیا اور یہ توقع ظاہر کی کہ اگر موسیٰ رات یہاں رُک جائے تو رات ہی رات میں بیس تیس مجاہدین کے علاوہ اسلحے کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ نے رات گندربل ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کے آخری پہر تک اٹھائیس مجاہدین گندربل کے ایک مکان میں جمع ہو چکے تھے۔ اُن کے پاس اتنا اسلحہ موجود تھا کہ وہ فوج کی ایک کمپنی کا کم از کم دو گھنٹوں تک مقابلہ کر سکتے تھے۔

وہ لوگ صبح کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی گندربل سے رُخصت ہو گئے۔ وہ لوگ خچروں اور گھوڑوں پر تھے اور اصل راستہ چھوڑ کر دُشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک مختصر سا چکر کاٹتے ہوئے دریائے جہلم پر آ گئے۔ یہ دریا، وولر جھیل سے نکلتا تھا۔ موسیٰ کا خیال تھا کہ وہ دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے وولر جھیل پر پہنچ جائیں گے۔ اور وہاں سے باندی پورہ پہنچنا اُن کے لئے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔

اُنہوں نے دریا کے ساتھ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اُن کے ایک جاسوس نے آ کر اطلاع دی کہ بھارتی فوج کو اُن کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے اور فوجی دستے اُنہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ وہ ان پہاڑوں میں کوئی محفوظ جگہ تلاش کر کے رُک جانا چاہتے تھے۔ وہاں سے ڈیڑھ کوس آگے دریا پر رسوں کا پُل تھا۔ اس پُل سے دریا عبور کر کے سوپور یا بارہ مولا کی طرف نکلا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ پُل سے ابھی دو

فرلانگ دُور تھے کہ ٹھٹک کر رُک گئے.....

پُل پر بھارتی فوجیوں کا قبضہ تھا۔ آگے جانا خطرناک تھا۔ وہ اس وقت تصادم سے بچنا چاہتے تھے۔ اس لئے موسیٰ نے اپنے ساتھیوں کو واپس مُڑنے کا حکم دیا۔ لیکن واپسی کے راستے پر بھی وہ ایک فرلانگ سے زیادہ نہ جا سکے۔ اُس طرف سے بھی فوج کے چار ٹرکوں نے اُن کا راستہ روک لیا تھا۔ وہ لوگ پوری طرح گھیرے میں آ گئے تھے۔ ایک طرف دریا تھا، دوسری طرف اُونچے پہاڑ۔ آگے بھی بھارتی فوجی تھے اور پیچھے بھی۔ اُنہوں نے چٹانوں میں مورچے سنبھال لئے اور فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا.....

دونوں طرف بھارتی فوجیوں کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ تھی۔ فوج کے پاس ہیوی مشین گنوں کے علاوہ راکٹ لانچر اور مارٹر گنیں بھی تھیں۔ اُن کے آس پاس راکٹ اور مارٹر گنوں کے گولے پھٹتے رہے۔ ہیوی مشین گنوں سے گولیوں کی بارش ہوتی رہی۔ لیکن موسیٰ اور اُس کے ساتھی ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے..... یہ مقابلہ ڈھائی تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ اس دوران چھ مجاہدین شہید ہو چکے تھے اور پانچ بھارتی فوجی مارے گئے۔ موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کے پاس ایمونیشن ختم ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ ایک ایک کر کے چناروں کے جنگل کی طرف نکل جائیں۔ اس کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

موسیٰ کے ساتھ صرف تین مجاہدین رہ گئے تھے۔ وہ چاروں طرف سے گھیرے میں تھے۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کسی کی رائفل میں ایک گولی بھی نہیں رہی تھی جس سے اپنا دفاع کیا جاتا۔ اُنہوں نے چنار کے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اُونچے چنار اُنہیں پناہ نہ دے سکے..... فوج کی فائرنگ سے ایک اور مجاہد شہید ہو گیا اور موسیٰ اپنے دو ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا..... فوجی اُنہیں گرفتار کر کے دریا عبور کر کے سوپور کیمپ کی طرف لے گئے۔

☆

متعدد مجاہدین کی شہادت اور موسیٰ کی گرفتاری کی خبر رحمان بابا پر بجلی بن کر گری۔ اُسے یہ بھی اطلاع ملی کہ موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو سوپور کی فوجی چوکی میں لے جایا گیا ہے۔

''یہ بہت ہی افسوس ناک خبر ہے۔'' اُس نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''موسیٰ ہمارے لئے بہت اہم آدمی ہے۔ ہم اُسے بھارتی درندوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ اُس کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں رحمان بابا.....؟'' طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''موسیٰ کو اُن بھیڑیوں کے قبضے سے رہائی دلانی ہوگی۔'' رحمان بابا نے کہا۔

''لیکن رحمان بابا.....!'' علی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''موسیٰ، سوپور کے فوجی کیمپ میں ہے۔ اور آپ اُس فوجی کیمپ کے بارے میں جانتے ہیں کہ.....''

''تم بزدل ہو۔'' رحمان بابا نے اُسے گھورا۔ ''کیا وہ دن بھول گئے جب تم نے اکیلے ہی سونا مارگ کے قریب بھارتی فوج کے ایک بڑے قافلے کو تباہ کر دیا تھا؟''

''میں ڈرتا نہیں ہوں رحمان بابا!'' علی نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب تو یہ تھا کہ وہ ایک بہت بڑا فوجی کیمپ ہے۔ وہاں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی ہوگی۔ اور چند ایسے آدمی درکار ہوں گے جو بلا خوف و خطر اس آگ میں کود سکیں۔''

''کشمیر کا ہر مجاہد سر پر کفن باندھے تیار بیٹھا ہے۔ تم جتنے آدمی چاہو، وہ تمہیں سوپور کے آس پاس سے ہی مل جائیں گے۔ ویسے تمہارا یہ خیال درست ہے کہ پہلے باقاعدہ پلاننگ کر لی جائے۔ میں ان بھارتی درندوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ویسے میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔'' رحمان بابا نے کہا۔

''وہ کیا رحمان بابا.....؟'' طارق نے پوچھا۔

رحمان بابا چند لمحے خاموش رہا، پھر اُنہیں منصوبہ سمجھانے لگا۔ آخر میں بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ پہلے سوپور پہنچ کر صورتِ حال کا بغور جائزہ لے لو۔ اس کے مطابق تم لوگ منصوبے میں مناسب تبدیلیاں بھی کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے رحمان بابا! ہم صبح سویرے ہی روانہ ہو جائیں گے۔'' طارق نے کہا۔

پروگرام طے ہو جانے کے کچھ دیر بعد ہاشم گھر سے باہر چلا گیا۔ اُس کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ بے حد حسین اور بھرپور عورت تھی۔ رہنے والی تو وہ سرینگر کی تھی۔ لیکن اُردو اور ہندی بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ اُس کا نام مشی تھا۔ کچھ عرصے پہلے جب بھارتی فلمساز اپنی فلموں کی شوٹنگ کے لئے سرینگر آیا کرتے تھے تو مشی کو تقریباً ہر فلم میں چھوٹا موٹا رول مل جایا کرتا تھا۔ مشی کا شوہر، ڈل جھیل میں ایک بوٹ ہاؤس کا مالک تھا۔ بھارتی فلمسازوں کی وجہ سے اُس کا بوٹ ہاؤس بھی پورے سیزن کے لئے کرائے پر اُٹھ جایا کرتا تھا۔ لیکن پھر حالات بدلنے لگے۔ وادی کشمیر میں بیداری کی لہر دوڑنے لگی اور مجاہدین اور پولیس میں جھڑپیں روز کا معمول بن گئیں۔ بھارتی فلم ساز اب کشمیر کی بجائے شملہ، ڈلہوزی اور نینی تال کا رُخ کرنے لگے۔

ڈل جھیل کے قریب مجاہدین کی ایک پارٹی اور پولیس میں ایک جھڑپ کے بعد پولیس والوں نے مشی کے خاوند کو پکڑ لیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ رحمت نے مجاہدین کو اپنی بوٹ ہاؤس میں پناہ دی تھی۔ پولیس رات بھر رحمت پر تشدد کرتی رہی اور صبح اُس کی لاش، ڈل جھیل میں تیرتی ہوئی ملی..... مشی نے اُسی روز بھارتیوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ مجاہدین کے لئے مخبری کرنے لگی۔ اُس کی فراہم کردہ اطلاعات پر مجاہدین نے بھارتی فوج اور پولیس کے خلاف کئی کامیاب کارروائیاں کی تھیں۔ رحمان بابا نے جو منصوبہ بنایا تھا، اُس کے لئے مشی جیسی دو عورتوں کی موجودگی بے حد ضروری تھی۔ ایک تو مشی تھی اور دوسری کے لئے نیلم کا انتخاب کیا گیا تھا جو اس وقت گلمرگ میں تھی۔

سرینگر سے روانہ ہونے سے پہلے طارق نے داڑھی منڈوا دی۔ اُنہوں نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے لئے طارق کے چہرے پر داڑھی کا ہونا خود اُس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ طارق کے ساتھ مشی اور علی بھی تھا۔ مشی اور علی الگ تھے اور طارق الگ..... وہ لوگ صبح سویرے بارہ مولہ جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔ وہ لوگ الگ الگ سیٹوں پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق نظر آ رہے تھے۔

بارہ مولہ، سرینگر سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ تقریباً اتنا ہی فاصلہ سرینگر سے سوپور کا بھی تھا۔ مگر دریائے اوری پر پہنچ کر یہ پختہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہاں سے ایک سڑک سوپور اور دوسری بارہ مولہ کی طرف چلی گئی تھی۔ دریائے اوری کے کنارے سڑکوں کے اس سنگم پر ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کے چاروں طرف دُور دُور تک سیب کے باغات پھیلے ہوئے

تھے۔

دریائے اوری کا پُل عبور کرتے ہی بس اُس بستی میں پہنچ کر رُک گئی۔ یہیں سے ایک سڑک بارہ مولہ اور دوسری سوپور کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں سے دونوں شہروں کا فاصلہ بھی تقریباً برابر ہی تھا۔ یہاں کئی مسافر بس سے اُترے تھے اور اُن کی جگہ کچھ نئے لوگ سوار ہوئے تھے۔ یہ بس، بارہ مولہ جانے والی تھی اور اُترنے والے وہ لوگ تھے جنہیں سوپور کی طرف جانا تھا۔ طارق، مشی اور علی بھی یہاں اُتر گئے۔ وہ لوگ ایک چھوٹے سے چھپر ٹائپ ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ دوسرے مسافر بھی ہوٹل میں بیٹھ کر یا اِدھر اُدھر ٹہل کر وقت گزار رہے تھے۔ اُس بستی میں ایک چھوٹی سی فوجی چکی بھی تھی۔ فوجیوں کے خیمے بستی سے ذرا ہٹ کر لگے ہوئے تھے اور دو تین فوجی رائفلیں کندھوں پر لٹکائے بس سٹاپ کے آس پاس ٹہل رہے تھے۔ ایک فوجی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بار بار مشی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مشی بے حد حسین عورت تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کشمیری لباس میں بھی اُس کی جوانی سرکش چٹانوں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ مشی نے اگرچہ اُس ہندو فوجی کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ اُس کی طرف سے انجان سی بنی بیٹھی رہی۔

آدھے گھنٹے بعد بارہ مولہ سے سوپور کی طرف جانے والی بس آ گئی۔ اُس بس سے بھی چند مسافر اُترے تھے۔ جو لوگ انتظار میں تھے، وہ بس میں سوار ہو گئے۔ پہلے کی طرح مشی اور علی ایک جگہ اور طارق اُن سے الگ بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں سے ایک اور آدمی بھی بس میں سوار ہوا تھا۔ اُس شخص کو طارق نے بس سٹاپ پر صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اور پھر جیسے ہی بس چلنے لگی، وہ کسی طرف سے برآمد ہوا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بس پر چڑھ گیا۔ طارق کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ وہ شخص اُسی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ لمبا تڑنگا اور صحت مند آدمی تھا۔ اُس نے مسکرا کر طارق کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

سوپور سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر علی نے بس رُکوالی اور مشی کو لے کر نیچے اُتر گیا۔ طارق اور اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا لمبا تڑنگا آدمی بھی اُتر گئے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ سڑک پر دونوں طرف سیبوں کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ دُور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چنار کے بلند و بالا درخت قطار در قطار مستعد محافظوں کی طرح کھڑے نظر آ رہے تھے۔

سرینگر سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر شمال جنوبی شہر سوپور، جسے کشمیر کے لوگ منی پاکستان بھی کہتے ہیں، وادی کشمیر کا خوب صورت ترین شہر ہے۔ یہاں دنیا کا بہترین سیب پیدا ہوتا ہے اور اسے ایپل ٹاؤن بھی کہا جاتا ہے۔

علی اور مشی بس سے اُتر کر سیب کے باغات میں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ طارق

اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ لمبا تڑنگا سا آدمی بھی مشی اور علی کے پیچھے چل پڑا۔ طارق اپنی جگہ پر کھڑا چند لمحے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس شخص کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی تنگ سی پگڈنڈی پر اُس کے پیچھے چل دیا۔ اُس شخص کے بارے میں طارق کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُبھر رہے تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار کرلیا تھا۔

وہ آگے پیچھے تقریباً ڈیڑھ میل تک باغات میں چلتے رہے۔ پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ آخر کار درختوں کے جھنڈ میں لکڑی سے بنے ہوئے دو تین مکان دکھائی دیئے۔ مشی اور علی ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ اُن کے فوراً ہی بعد وہ لمبا تڑنگا شخص بھی مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ اور پھر اُس کے ٹھیک دو منٹ بعد طارق مکان میں داخل ہوا۔ ایک کمرے میں اُن تینوں کو دیکھ کر طارق کا دماغ گھوم گیا۔ لمبے تڑنگے آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''اس سے ملو طارق! یہ اکبر راٹھور ہے۔'' علی نے تعارف کرایا۔

طارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ''راٹھور نے بڑا پراسرار طریقہ اختیار کیا ہے۔ ایک موقع پر تو میں اس سے بھڑنے لگا تھا۔'' طارق نے راٹھور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس میں تو تمہیں مجھ پر شبہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے بعد میں جس طرح تم لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا، اس سے تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں باہر کا کوئی آدمی نہیں ہوں۔'' راٹھور نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اُن کا میزبان ایک بوڑھا شخص تھا۔ وہ اس علاقے میں تقریباً دو سو ایکڑ زمین کا مالک تھا جس پر سیب کے باغات لگے ہوئے تھے۔ اُسے اُن لوگوں کی آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس لئے کھانے کا بندوبست بھی ہو چکا تھا۔ اُن تینوں کے آنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد نیلم بھی کریم نامی ایک شخص کے گھر پہنچ گئی۔ نیلم، طارق سے اس طرح لپٹ گئی تھی جیسے بچھڑے ہوئے بہن بھائی برسوں بعد ملے ہوں۔ میزبان نے دری پر دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے اس منصوبے کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جس کے لئے وہ سب لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔

سہ پہر چار بجے کے قریب سعید نامی ایک اور آدمی وہاں آ گیا۔ اُس نے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ لوگ اس پہاڑی کے دامن سے ہوتے ہوئے جائیں گے تو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ کوس کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ بھارتی فوج کا کیمپ شہر کے ساتھ قدرے بلندی پر واقع ہے۔ موسیٰ اور اُس کے دو ساتھیوں کو جس خیمے میں رکھا گیا ہے، وہ خیمہ شمال کی طرف ہے۔ اور اُس کی نشانی یہ ہے کہ خیمے کے سامنے لکڑی کے ایک پول پر ایک انسانی

کھوپڑی ٹنگی ہوئی ہے۔ وہ کھوپڑی نجانے کس بے چارے کی ہے؟ لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ بھی کوئی کشمیری مسلمان ہی ہوگا جو کچھ عرصہ پہلے ان بھارتی درندوں کا شکار ہوا ہوگا۔''

''کیمپ میں فوجیوں کی تعداد کیا ہے؟'' طارق نے اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''فوجیوں کی صحیح تعداد کا تو علم نہیں ہو سکا۔ لیکن اُن کے پاس ہر قسم کا جدید ترین اسلحہ موجود ہے۔ ہیوی مشین گنیں، راکٹ، مارٹر گنیں اور توپیں..... کیمپ کے چاروں طرف خاردار تاروں کی اونچی باڑ ہے۔ اُس باڑ کے اندر کی طرف چند فوجی باقاعدگی سے گشت کرتے رہتے ہیں۔ کیمپ میں آمد و رفت کے لئے مرکزی گیٹ شہر کے رُخ پر ہے۔ اس کے علاوہ کیمپ میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ محافظوں کو حکم ہے کہ خاردار تاروں کی باڑ کے قریب کسی کو دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیں۔''

''کیمپ میں بجلی کی فراہمی کا کیا انتظام ہے؟'' طارق نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیمپ کا اپنا جنریٹر ہے یا شہر کے بجلی گھر سے سپلائی ہوتی ہے؟''

''کیمپ میں اپنا جنریٹر موجود تو ہے۔ لیکن اُسے صرف ہنگامی صورتِ حال میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عام حالات میں کیمپ کو بھی بجلی گھر سے ہی سپلائی ملتی ہے۔'' سعید نے بتایا۔

''اور دوسری چیزوں کا کیا بنا؟'' طارق نے اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''وہ تمام چیزیں اس تھیلے میں موجود ہیں۔'' سعید نے ایک تھیلا اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ''دوسری چیزوں کے حصول میں تو کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ لیکن شراب بڑی مشکل سے ملی ہے۔ اس کے لئے مجھے آج صبح بارہ مولہ جانا پڑا تھا۔''

طارق کپڑے کا وہ تھیلا کھول کر دیکھنے لگا۔ اُس میں کچھ اور چیزوں کے علاوہ شراب کی دو بوتلیں بھی تھیں۔ وہ بوتلیں نکال کر دیکھنے لگا۔ بوتلوں پر بمبئی کی ایک ڈسٹلری کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ طارق نے دونوں بوتلیں دوبارہ تھیلے میں ڈال دیں۔

''ہمیں یہاں سے کس وقت روانہ ہونا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''ٹھیک چھ بجے.....!'' سعید نے جواب دیا۔ ''اُس وقت تک کیمپ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھولداری لگا دی جائے گی۔ ٹھیک آٹھ بجے فوج کی ایک گشتی پارٹی اُس طرف سے گزرتی ہے۔ جیپ میں چار فوجی سوار ہوتے ہیں۔ جیپ کا راستہ چھولداری سے صرف بیس گز کے فاصلے پر ہے۔ میرا خیال ہے، نیلم اور مشی کی آوازیں وہاں سے گزرتے ہوئے فوجیوں کے کانوں تک پہنچ جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے..... ہم چھ بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔'' سعید نے کہا۔

اور پھر ٹھیک چھ بجے وہ لوگ اُس مکان سے روانہ ہو گئے۔ نیلم اور مشی نے خوب گہرا میک اَپ کر رکھا تھا اور دونوں نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ دونوں کے ماتھوں پر بندیا چمک رہی تھی۔ لباس اور حلئے سے وہ دونوں ہندو لگ رہی تھیں۔ طارق، علی، راٹھور اور سعید بھی بدلے ہوئے حلیوں میں تھے۔

ساڑھے سات بجے وہ سڑک سے ذرا ہٹ کر درختوں کے نیچے لگی ہوئی ایک چھولداری میں پہنچ گئے۔ چھولداری کافی کشادہ تھی۔ اُس میں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک ہارمونیم اور طبلوں کی ایک جوڑی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے قریب ہی ایک جوڑی گھنگھرو بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

سعید چھولداری سے نکل کر سڑک کے قریب جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چاروں طرف ویرانی تھی۔ دُور کیمپ اور شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ٹھیک آٹھ بجے اُسے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں نظر آئیں۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ گشتی محافظوں کی جیپ تھی۔ وہ دوڑتا ہوا چھولداری میں پہنچ گیا۔

''فوجیوں کی جیپ آ رہی ہے..... شروع ہو جاؤ!'' وہ آتے ہی بولا۔

مشی گھنگھرو باندھے بیٹھی تھی۔ وہ فوراً ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ علی نے ہارمونیم اور راٹھور نے طبلوں کی جوڑی سنبھال لی۔ سعید زمین میں گڑی ہوئی اُس لکڑی کے قریب بیٹھ گیا جس پر جلتی ہوئی لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ طارق اور نیلم ایک طرف بیٹھ گئے۔ خاموش فضا اچانک ہی ہارمونیم کے سروں، طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی جھنکار سے گونج اُٹھی۔ چند سیکنڈ بعد اُس میں نیلم کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ وہ بڑی سریلی آواز میں ایک انڈین فلمی گیت گا رہی تھی اور مشی ڈانس کر رہی تھی۔

وہ سب سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے، جہاں جیپ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ آخرکار جیپ سڑک پر رُک گئی اور چند سیکنڈ بعد اُس کا رُخ چھولداری کی طرف ہو گیا..... جیپ سڑک سے اُتر کر چھولداری کی طرف آ رہی تھی۔ اور آخرکار چھولداری کے سامنے آ کر رُک گئی۔ وہ سب ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھے۔ فوجیوں کو جیپ سے اُترتے دیکھ کر ہارمونیم اور طبلہ خاموش ہو گیا۔ نیلم کا گانا بھی ادھورا رہ گیا۔ مشی کے گھنگھرو بھی خاموش ہو گئے۔

''نم..... نم..... نمسکار مہاراج!'' راٹھور اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''پدھاریئے مہاراج!''

''کون ہو تم لوگ..... اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' فوجی پارٹی کے انچارج، جس نے لیفٹیننٹ کی وردی پہن رکھی تھی، راٹھور کی بات کاٹتے ہوئے رعب دار لہجے میں بولا۔

''کلاکار.....'' طارق نے بھی اُٹھ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''ہم کلاکار ہیں مہاراج! فلم انڈسٹری ہمارے ہی دم سے قائم ہے۔''

''فلم انڈسٹری چھوڑ کر یہاں کیا کر رہے ہو؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''دو تین دن میں یہاں نیلا پربت نامی فلم کی شوٹنگ ہونے والی ہے سرکار! ہمارا پورا یونٹ کل یہاں پہنچ جائے گا۔ ہم آج شام یہاں پہنچ گئے تھے۔ تاکہ اس لوکیشن پر مس بجلی کے رقص کی ریہرسل کر سکیں۔ غضب کا رقص کرتی ہے مس بجلی۔ بمبئی فلم انڈسٹری کی جان ہے۔ پرسوں جب یہ اپنا رقص فلمبند کرائے گی تو یہ وادی جھوم اُٹھے گی۔'' طارق نے جواب دیا۔

''تم لوگوں کو شاید یہ علم نہیں کہ اس وادی میں اب صرف موت کا رقص ہوتا ہے۔ یہاں گھنگھروؤں کی جھنکار نہیں، گولیوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔'' لیفٹیننٹ بولا۔

''موت کا رقص..... گولیوں کی آوازیں.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟'' طارق نے ہم جانے کی اداکاری کی۔

''تم لوگوں کو یہاں تک آنے کس نے دیا؟'' آفیسر بولا۔

''پپ..... پتہ نہیں مہاراج! ہم نے تو کسی سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ ہمارے ڈائریکٹر نے کہا کہ ہم ایک دن پہلے یہاں پہنچ جائیں، سو پہنچ گئے۔ کل شام تک ڈائریکٹر، ہیروئن اور یونٹ کے دوسرے لوگ بھی پہنچ جائیں گے۔''

''اس فلم کی ہیروئن کون ہے.....؟'' دوسرے فوجی نے پوچھا۔

''ہیما مالنی۔ اور ہیرو رشی کپور۔'' طارق نے جواب دیا۔

''سنو.....!'' لیفٹیننٹ نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کل جیسے ہی تم لوگوں کا یونٹ یہاں پہنچے، اُس کے ساتھ فوراً واپس چلے جاؤ۔ یہ وادی اب فلموں کی شوٹنگ کے لئے محفوظ نہیں ہے۔ یہاں اب گولیوں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔''

''جی سرکار.....!'' طارق نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''آج رات تو ہم یہیں رہیں گے۔ اور آپ بھی آ ہی گئے ہیں تو تھوڑا سا شغل میلہ ہو جائے۔ ہماری عزت افزائی ہو گی۔''

لیفٹیننٹ نے اپنے ماتحت فوجیوں کی طرف دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ لوگ چھولداری میں آ کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نیلم، لیفٹیننٹ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔

''شروع ہو جاؤ ماسٹر بنارسی!'' طارق نے راٹھور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور مس بجلی!

تمہاری زندگی میں یہ موقع پہلی مرتبہ آیا ہے۔ اپنے دیش کے سورماؤں کو بتا دو! کہ بجلی کیسے گرتی ہے۔''

مشی مسکراتے ہوئے اُٹھ گئی۔ اُس کی ساڑھی کا پلو ڈھلکتے ہی بھارت دیش کے سورماؤں پر بجلی گرنا شروع ہوگئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اُس کے نیم عریاں جسم کے زاویئے واقعی فوجیوں کے دل و دماغ پر بجلی گرا رہے تھے۔ طارق نے بوتل کھول کر شراب، گلاسوں میں اُنڈیلی اور ایک گلاس نیلم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلم نے مسکراتے ہوئے گلاس لیفٹیننٹ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ لیفٹیننٹ انکار نہ کر سکا۔ طارق نے دوسرے فوجیوں کے ہاتھوں میں بھی گلاس تھما دیئے۔

مشی کا رقص جاری رہا۔ نشہ آور شراب، فوجیوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے لگی۔ اُن کے سر بار بار اس طرح جھک رہے تھے، جیسے نیند سے مغلوب ہو رہے ہوں۔ آخر کار وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر لڑھک گئے۔ لیفٹیننٹ کا سر، نیلم کے سینے پر ٹِک گیا۔ نیلم نے بڑی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اُسے دوسری طرف دھکیل دیا۔

اس شراب میں بے ہوشی کی دوا ملائی گئی تھی۔ ان چاروں فوجیوں کے لڑھکتے ہی طارق اور اُس کے ساتھی حرکت میں آ گئے۔ وہ چاروں فوجیوں کو اُٹھا کر وہاں سے دُور لے گئے اور اُن کی وردیاں اُتار کر خود پہننے لگے اور اپنے لباس اُنہیں پہنا دیئے۔ لیفٹیننٹ کی وردی طارق نے پہنی تھی۔ اُن کے واپس آنے تک نیلم اور مشی بھی اپنی چیزیں سنبھال چکی تھیں۔ اُن کے حلیے میں ذرا سی تبدیلی آ گئی تھی۔ اُن دونوں کی ساڑھیاں غائب تھیں اور صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تھیں۔ دونوں کے بلاؤز پھٹے ہوئے تھے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ نیلم کے دائیں بازو اور مشی کے چہرے پر ایک دو خراشیں نظر آ رہی تھیں جن سے خون رِس رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اُن لوگوں کے جانے کے بعد وہ خونخوار بلیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑی ہوں۔

''تم لوگوں نے تو واقعی ایک دوسرے کو نوچ ڈالا۔ باقاعدہ خون رِس رہا ہے۔'' طارق نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔'' نیلم نے جواب دیا۔

''تو پھر چلیں.....؟'' طارق نے کہا۔ اور پھر سعید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے آدمی کب تک پہنچیں گے.....؟''

''وہ لوگ ہمارے یہاں سے نکلتے ہی پہنچ جائیں گے۔ اس چھولداری اور بھارتی فوجیوں کو وہ خود ہی ٹھکانے لگا دیں گے۔'' سعید نے جواب دیا اور لکڑی پر ٹنگی ہوئی لالٹین بجھا دی۔

وہ سب جیپ میں آ گئے۔ سٹیئرنگ کے سامنے سعید بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر

طارق اور پچھلی سیٹوں پر علی، راٹھور، نیلم اور مشی بیٹھ گئے۔

چاروں فوجیوں کی جیبوں پر اُن کے ناموں کے بیج لگے ہوئے تھے۔ طارق کی جیب پر شرما کے نام کا بیج لگا ہوا تھا۔ علی نے کندن، سعید نے راہول اور راٹھور نے کشن کی وردی پہنی تھی۔

جیپ کچھ دُور تک اُسی کچی سڑک پر دوڑتی رہی۔ پھر سعید نے اُس کا رُخ فوجی کیمپ کی طرف موڑ دیا۔ کیمپ کے گیٹ کی بتیاں دُور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر جیپ رُک گئی۔ ایک مسلح محافظ جیپ کی طرف آیا۔ اُس نے پہلے طارق کی طرف دیکھ کر سلیوٹ کیا، پھر نیلم اور مشی کی طرف دیکھنے لگا جو سہمی ہوئی اور خوف زدہ سی بیٹھی تھیں۔ طارق نے خونخوار نگاہوں سے محافظ کی طرف دیکھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو.....؟'' طارق کے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔

''کک..... کچھ نہیں سر!'' محافظ نے ایک دم سے پھر سلیوٹ جھاڑ دیا۔

گیٹ پر موجود بیریئر ہٹا دیا گیا اور سعید جیپ کو آگے بڑھا لے گیا۔ وہ لوگ جس طرح آسانی سے کیمپ میں داخل ہو گئے تھے، اس سے طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ گیٹ کے محافظ کیمپ کے فوجیوں کو نہیں، گاڑیوں کو پہچانتے ہیں۔ اور یوں بھی کیمپ کے ہر شخص کا نام اور چہرہ یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔

سعید نے جیپ کو وہیکل پارکنگ میں روک لیا۔ طارق وغیرہ نیچے اُتر آئے۔ اُنہوں نے مشی اور نیلم کو بھی اُتار لیا۔ پارکنگ سے کچھ فاصلے پر کیمپ کمانڈنٹ کا خیمہ تھا۔ یہ خیمہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں دفتر تھا اور دوسرا کمانڈر کی رہائش کے لئے مخصوص تھا۔

''سعید.....!'' طارق نے سعید کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''کمانڈر اپنے اس کیمپ کے تمام افسران کو پہچانتا ہوگا۔ اگر میں اُس کے خیمے میں گیا تو راز کھل سکتا ہے۔ مشی اور نیلم کو تم اُس کے خیمے میں لے جاؤ۔ ان دونوں کے بارے میں تم اُسے وہی کہانی سناؤ گے، جو پہلے سے طے ہو چکی ہے۔''

''یس سر.....!'' سعید نے جیپ سے اُترتے ہوئے جواب دیا۔

اُس وقت وہیکل پارکنگ کے قریب دو تین فوجی کھڑے اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظریں نیلم اور مشی پر مرکوز تھیں۔ نیلم نے کپڑے کا وہ تھیلا بھی اُٹھا رکھا تھا جو اُن کے لئے عمر و عیار کی زنبیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ سعید اُن دونوں کو لے کر کیمپ کمانڈر کے خیمے کی طرف چل پڑا۔

طارق اور اُس کے ساتھی جیپ کے قریب کھڑے رہے۔ جیپ کی سیٹوں پر سب مشین گنیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں وہ کسی بھی لمحے آسانی سے اُٹھا سکتے تھے۔ طارق کا دل بڑی شدت سے

دھڑک رہا تھا۔ وہ خونخوار بھیڑیوں کے بھٹ میں آ گئے تھے اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اُن کا راز کھل گیا تو اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔

تقریباً دس منٹ بعد کیمپ کمانڈر کے خیمے سے مردانہ اور نسوانی قہقہوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ طارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُن قہقہوں کا مطلب تھا کہ کیمپ کمانڈر اُن کے بچھائے ہوئے جال میں آ گیا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت سعید، خیمے سے برآمد ہوا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا طارق کے قریب پہنچ گیا۔

''کیمپ کمانڈر کو ہماری کہانی پر یقین آ گیا ہے۔'' اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے اُسے بتایا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں بھارتی فلمی اداکارائیں ہیں۔ یہ دونوں اپنے یونٹ کے ساتھ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ ایک کشمیری نوکر اُنہیں سیر کرانے کے بہانے پہاڑوں میں لے گیا جہاں اُس کے کچھ اور ساتھی بھی چھپے ہوئے تھے۔ وہ لوگ اُن لڑکیوں کو دریا کے کنارے کنارے بارہ مولہ کی طرف لے جا رہے تھے کہ ہمیں گشت پر دیکھ کر ان لڑکیوں نے شور مچا دیا۔ ہم نے اُن کشمیری بدمعاشوں کو قتل کر کے ان لڑکیوں کو بچا لیا۔ کشمیری بدمعاشوں کی لاشیں ہم نے دریائے اوری میں پھینک دی تھیں۔''

''گڈ.....!'' طارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''کمانڈر کو کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟'' اُس نے پوچھا۔

''بالکل نہیں.....!'' مشی اور نیلم نے اُنہیں اپنی کہانی کا یقین دلا دیا ہے۔'' سعید نے کہا۔ ''وہاں دو کیپٹن اور ایک میجر بھی موجود ہے۔ کمانڈر کا اردلی کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں اُن کے لئے میس سے کھانا لینے جا رہا ہوں۔''

سعید اُس خیمے کی طرف چلا گیا جسے آفیسرز میس کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ اُس سے ذرا آگے عام فوجیوں کا میس تھا جسے لنگر خانہ کہا جاتا تھا۔ علی، لنگر خانے سے اپنے، طارق اور راٹھور کے لئے کھانا لے آیا اور وہ لوگ جیپ ہی میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ سعید بھی آفیسرز میس کے دو آدمیوں کے ساتھ کھانا لے کر کیمپ کمانڈر کے خیمے میں جا چکا تھا۔ ایک ٹرے میں شراب کی دو بوتلیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

کیمپ میں فوجی گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ لیکن اُن کی جیپ پارکنگ کے ایک الگ تھلگ حصے میں کھڑی تھی اس لئے کسی نے بھی اُس طرف توجہ نہیں دی۔ کھانا کھانے کے بعد طارق نے اپنی جیب پر لگا ہوا نام کا بیج اُتار کر جیپ میں ڈال لیا۔ اُس نے ٹوپی بھی پیشانی پر آگے کی طرف جھکا لی تھی تاکہ لیفٹیننٹ شرما کا کوئی ماتحت سامنے آ جائے تو اُسے پہچان نہ سکے۔ وہ

جیپ کے قریب کھڑا چاروں طرف دیکھنے لگا۔

یہ کیمپ بہت بڑا تھا۔ اُس کا ایک حصہ آرمری پر مشتمل تھا۔ وہاں خیموں کے سامنے ہیوی مشین گنوں، مارٹر گنوں کے علاوہ چھوٹی اور بڑی توپیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ خیموں کے اندر ایمونیشن اور چھوٹے اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ طارق کی نظریں اُس خیمے پر رُک گئیں جس کے سامنے لکڑی کے ایک پول پر ایک انسانی کھوپڑی ٹنگی ہوئی تھی۔

طارق نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اُنہوں نے جیپ میں پڑی ہوئی سب مشین گنیں اُٹھا کر کندھوں پر لٹکا لیں اور طارق کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ وہ پورے کیمپ کا چکر لگاتے ہوئے ایک بار پھر جیپ کے قریب آ گئے۔ طارق نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کیمپ میں حفاظتی انتظامات خاصے سخت تھے۔ ایک لمحے کو تو اُسے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اگر اُن کی سکیم کامیاب نہ ہو سکی تو یہ بھارتی فوجی خونخوار بھیڑیوں کی طرح اُن کے جسموں کے چیتھڑے اُڑا کر رکھ دیں گے.....

اُس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اچانک فضا میں گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دینے لگی..... طارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ کمانڈر کے خیمے میں اصل کھیل شروع ہو چکا تھا۔ اس کے چند منٹ بعد سعید خیمے سے نکل کر اُن کے قریب آ گیا۔

''کمانڈر اور اُس کے تینوں ماتحت نشے میں آ چکے ہیں۔ تم بھی خیمے میں چلے جاؤ۔ اُن میں سے کوئی اس قابل نہیں رہا کہ تمہیں شناخت کر سکے۔'' سعید سرگوشیانہ انداز میں کہتا ہوا آفیسرز میس کی طرف چلا گیا۔ طارق نے علی اور راٹھور کو اشارہ کیا اور کیمپ کمانڈر کے خیمے کی طرف چلنے لگا۔

علی اور راٹھور خیمے کے باہر رُک گئے اور طارق پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت اُس کے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ خیمے کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف کمانڈر کا بیڈ تھا، دوسری طرف چار پانچ کرسیاں اور اُن کے سامنے ایک چھوٹی میز پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی کسی کرسی پر نہیں تھا۔ کمانڈر اور اُس کے تینوں ماتحت قالین پر تھے۔ کمانڈر، نیلم کو اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ ایک کیپٹن رقص کرتی ہوئی مشی کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ دوسرا کیپٹن اور میجر نشے میں دُھت ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ قالین پر شراب کی دو بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ نیلم اور مشی نے پانی ملائے بغیر دونوں بوتلیں اُنہیں پلا دی تھیں۔ خالص وہسکی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔

''آؤ..... آؤ لیفٹیننٹ! بیٹھو۔'' کمانڈر نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شراب..... شراب کہاں ہے؟''

''ابھی آرہی ہے سر.....!'' طارق نے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد سعید شراب کی دو اور بوتلیں لے آیا۔ طارق نے ایک بوتل کھول دی اور گلاسوں میں شراب اُنڈیلنے لگا۔ نیلم نے ایک گلاس اُٹھا کر کمانڈر کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دوسری طرف مشی بھی دونوں کیپٹنوں اور میجر کو شراب پلا رہی تھی۔ ایک بوتل چند منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ طارق، نیلم اور مشی کو اشارہ کرتا ہوا خیمے سے باہر نکل آیا۔

''کسی کو اندر مت جانے دینا۔ ہم ابھی آتے ہیں۔'' طارق نے سعید کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ اور علی اور راٹھور کو اشارہ کرتا ہوا اُس خیمے کی طرف چل دیا جس کے سامنے پول پر انسانی کھوپڑی ٹنگی ہوئی تھی۔

خیمے کے سامنے ایک مسلح فوجی موجود تھا۔ اُس نے طارق کو دیکھ کر سلیوٹ کیا۔ طارق نے سر کے اشارے سے سلیوٹ کا جواب دیا اور بدستور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''قیدیوں کو کمانڈنٹ نے طلب کیا ہے۔''

''یس سر.....!'' محافظ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''کندن.....!'' طارق، علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اندر جا کر دیکھو! قیدی اپنے قدموں پر چل سکتے ہیں یا اُنہیں اُٹھا کر لے جانا پڑے گا؟''

''یس سر.....!'' علی نے جواب دیا۔ اور اُس کے ساتھ راٹھور بھی خیمے میں داخل ہو گیا۔

طارق کچھ دیر تک محافظ سے باتیں کرتا رہا، پھر وہ بھی خیمے میں آ گیا۔ خیمے کے اندر کا منظر دیکھ کر اُس کی رُوح تک کانپ اُٹھی..... خیمے میں تین قیدی تھے۔ اُن میں ایک موسیٰ تھا اور دو اُس کے ساتھی، جنہیں اُن کے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا تھا۔ خیمے کے اندر کی دیواروں پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ موسیٰ اور اُس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پیر بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ مشکیں کسی ہوئی ہونے کے باوجود اُنہیں جانوروں کی طرح کھونٹوں سے باندھا ہوا تھا۔ اُن تینوں کی حالت دیکھ کر طارق کانپ اُٹھا تھا۔ موسیٰ کے ہاتھوں اور پیروں کی تمام اُنگلیوں کے ناخن غائب تھے اور خون جما ہوا تھا۔ دائیں رُخسار پر تقریباً ایک انچ کے قریب کھال کاٹ ڈالی گئی تھی۔ دونوں پنڈلیوں اور بازوؤں پر سے بھی تقریباً تین تین انچ کے ٹکڑے غائب تھے۔ موسیٰ کے دونوں ساتھیوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ اُن میں سے ایک کو تو جزوِ مردانگی سے بھی محروم کر دیا گیا تھا.....

اُن تینوں پر تشدد کی انتہاء کر دی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہوش میں تھے۔ موسیٰ نے پہلے تو نفرت بھری نظروں سے طارق کی طرف دیکھا۔ اور جب طارق نے ٹوپی اُتار دی تو اُسے پہچان

کر موسیٰ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا، مگر طارق نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''ان تینوں کو کھولو!'' طارق نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور خود بھی قیدیوں کو کھولنے میں اُن کی مدد کرنے لگا۔

موسیٰ اور اُس کے ایک ساتھی کو علی اور راٹھور نے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ تیسرے کو اُٹھوانے کے لئے طارق نے محافظ کو اندر بلوا لیا۔ علی اور راٹھور تو اپنے قیدیوں کو لے کر کمانڈر کے خیمے میں داخل ہو گئے۔ لیکن محافظ تیسرے قیدی کو لے کر جیسے ہی قریب پہنچا، سعید نے اُسے روک لیا اور قیدیوں کو خود اپنے کندھے پر لاد کر اندر لے گیا۔

موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو بیڈ پر ڈال دیا گیا۔ کمانڈر اور اُس کے ساتھی اب بھی نیلم اور مشی سے لپٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب دونوں کے دل نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے کمانڈر اور اُس کے ساتھیوں سے نمٹ رہی تھیں۔

تین بج گئے..... کمانڈر کے خیمے سے گھنگھروؤں اور نسوانی قہقہوں کی آوازیں فضا میں بکھرتی رہیں۔ اب تک کسی طرف سے بھی حیرت یا شبہے کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ یہ شاید کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فوجی کیمپوں میں روزانہ اس قسم کے وحشیانہ کھیل کھیلے جاتے تھے۔ درندہ صفت بھارتی فوجی، مظلوم و بے بس کشمیری خواتین کو اُٹھا کر لے آتے اور کیمپوں میں اُن کی عصمت دری کی جاتی۔ اس طرح کشمیر کی ہزاروں خواتین ان وحشی بھیڑیوں کے ہاتھوں اپنی عزت سے محروم ہو چکی تھیں۔ کئی عورتیں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے دوران ہی مر گئی تھیں اور کئی عورتوں نے خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لیا تھا۔

ساڑھے تین بجے کے قریب طارق اور راٹھور، کمانڈر کے خیمے سے نکلے۔ سب سے پہلے وہ کیمپ کے اُس حصے میں گئے، جہاں اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ وہاں سامنے کے رُخ پر دو محافظ مستعد کھڑے تھے۔ وہ دونوں اُن سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر طارق ایک خیمے میں گھس گیا جہاں ایمونیشن اور دستی بموں کی پیٹیاں تھیں۔ طارق نے بڑی پھرتی سے جیب سے ماچس کی ڈبیہ کے برابر سیاہ رنگ کا ایک ڈیوائس نکال کر ایک پیٹی کے نیچے چپکا دیا۔ یہ ٹائم بم تھا جس پر چار بجے کا وقت سیٹ تھا۔ اس طرح دو تین خیموں میں یہ ننھے ننھے مگر طاقتور ٹائم بم فٹ کر دیئے گئے۔ آخر میں دو بم، دو ٹرکوں کے نیچے بھی چپکا دیئے گئے..... جب وہ کمانڈر کے خیمے میں واپس پہنچے تو چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ طارق نے نیلم کی طرف دیکھا تو اُس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ زہریلی شراب بھی کیمپ کمانڈر اور اُس کے تینوں ساتھیوں کو پلا دی گئی

تھی۔

''ہمارے پاس صرف دس منٹ ہیں..... اب جلدی سے یہاں سے نکلو.....!'' طارق نے کہا۔ اُنہوں نے موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو باری باری اُٹھا کر جیپ میں ڈالا، پھر نیلم اور مشی بھی جیپ میں بیٹھ گئیں۔ اُن کے لباس اب پہلے سے زیادہ پھٹ چکے تھے۔ کمانڈر اور اُس کے ساتھیوں نے کوشش تو پوری کی تھی۔ مگر شاید یہ اُن کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے شیطانی مقصد میں ناکام رہے تھے۔ اور جن لڑکیوں کو وہ نعمت غیر مترقبہ سمجھے تھے، وہ اُن کے لئے موت کا فرشتہ ثابت ہوئی تھیں۔

سعید نے سٹیئرنگ سنبھال لیا۔ طارق اور اُس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے تو جیپ حرکت میں آ گئی۔ طارق، علی اور راٹھور کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ تین چار سب مشین گنیں، جیپ کے فرش پر پڑی تھیں جنہیں نیلم اور مشی کسی بھی لمحے اُٹھا سکتی تھیں۔ جیپ سٹارٹ ہو کر کیمپ کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر سعید نے جیپ روک لی۔

''بیریئر ہٹاؤ..... ہم ان کشمیریوں کی لاشیں پھینکنے جا رہے ہیں۔'' سعید نے گیٹ کے سامنے کھڑے محافظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور یہ ناریاں سر.....؟'' محافظ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''کمانڈنٹ کے حکم پر انہیں بھی کسی کھڈ میں دھکا دے دیا جائے گا۔'' سعید نے جواب دیا۔ محافظ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا اور اُس نے بیریئر اُٹھا دیا۔ جیپ حرکت میں آ کر آگے بڑھ گئی..... ٹھیک اُسی لمحے ایک فوجی اُس طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''اُنہیں روکو..... پکڑ لو.....! اُنہوں نے کمانڈنٹ کو قتل کر دیا ہے۔''

گیٹ پر دو محافظ تھے۔ دونوں نے رائفلیں تان لیں۔ لیکن اس سے پہلے ہی طارق کی سب مشین گن دہاڑ اُٹھی..... دونوں محافظ چیختے ہوئے ڈھیر ہو گئے۔ کارڈ رُوم سے چند اور محافظ اس طرف دوڑے۔ طارق اور اُس کے ساتھیوں نے فائر کھول دیا۔ محافظ بھی اُن پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔

''جیپ کو نکالو یہاں سے..... صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔'' طارق چیخا۔

جیپ ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی۔ گیٹ سے نکلتے ہی سعید نے اُس کی رفتار بڑھا دی۔ عقب سے اُن پر فائرنگ ہوتی رہی۔ دو منٹ میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر جیپ انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی کیمپ سے تقریباً نصف میل دُور پہنچ چکی تھی۔ کیمپ کی طرف سے اب بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ اور پھر اچانک فضا خوف ناک دھماکوں سے گونج اُٹھی..... دھماکے مسلسل

ہوتے رہے اور تاریک آسمان روشن ہوتا چلا گیا۔

طارق نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سوپور کا فوجی کیمپ ہوا میں اُڑ رہا تھا.....

☆

دوسرے روز سوپور پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ گزشتہ رات فوجی کیمپ میں ہونے والی کارروائی میں سترہ بھارتی فوجی جہنم واصل ہو گئے تھے۔ کیمپ کمانڈر، دو کیپٹن اور میجر اُن کے علاوہ تھے۔ یہ چاروں آفیسر نیلم اور مشی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے تھے۔ بیسیوں بھارتی فوجی زخمی ہوئے تھے اور گولہ بارود کا تقریباً آدھا ذخیرہ تباہ ہو گیا تھا.....

بھارتی فوجیوں کا خیال تھا کہ چوکی تباہ کرنے والے دہشت گرد کشمیریوں کا تعلق سوپور سے تھا۔ اور وہ لوگ سوپور ہی میں کہیں روپوش تھے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی سوپور کے محلے آرام پور کو گھیرے میں لے کر کارروائی شروع کر دی گئی۔ آرام پور پر بھارتی مشین گنوں کے علاوہ ہلکی توپوں سے بھی گولہ باری کی جا رہی تھی۔ آرام پور دیکھتے ہی دیکھتے کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا..... سینکڑوں مکانات جل رہے تھے۔ یہ ظلم و بربریت کی انتہا تھی۔ بے گناہ اور معصوم لوگ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے اور بھارتی فوجی اُنہیں تاک تاک کر گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے..... ایک جوان عورت، شیر خوار بچے کو سینے سے لپٹائے جلتے ہوئے مکان سے نکلی۔ وہ پناہ کی تلاش میں ایک طرف دوڑی، لیکن دو بھارتی فوجیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ ایک فوجی نے شیر خوار بچے کو اُس سے چھین لیا۔ بچہ، ماں کی گود سے جدا ہو کر رونے لگا۔ فوجی نے بچے کو دونوں پیروں سے پکڑ کر اُلٹا کر دیا۔ اور پھر اس طرح زوردار جھٹکا دیا کہ بچے کی دونوں ٹانگیں چر گئیں..... بچے کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی فوجی نے بچے کو آگ میں پھینک دیا..... یہ منظر دیکھ کر بچے کی ماں کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ وہ جلتے ہوئے مکان کی طرف لپکی۔ لیکن فوجیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا لباس تار تار ہو گیا اور عورت برہنہ ہو گئی..... اُس نے ایک فوجی کے منہ پر تھوک دیا۔ فوجی نے رائفل کی سنگین اُس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ عورت چیخ کر نیچے گری۔ فوجی نے رائفل کھینچ کر دوبارہ حملہ کیا۔ اس مرتبہ سنگین، عورت کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ تیسری مرتبہ فوجی نے رائفل سیدھی کر کے ٹرائیگر دبا دیا..... گولی نے عورت کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دیئے.....

سوپور سے چند میل دُور ایک اور فوجی چوکی سے کمک پہنچ گئی۔ بھارتی درندے سوپور کے معصوم اور بے گناہ شہریوں پر آگ برساتے رہے۔ اس بستی میں ابلیس کا یہ رقص کئی گھنٹوں تک جاری

رہا۔ اور جب بھارتی فوجیوں کی یہ کارروائی ختم ہوئی تو وادی کشمیر کے خوبصورت ترین شہر سوپور کا محلّہ آرام پور مکمل طور پر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا..... اس وحشیانہ کارروائی میں ڈیڑھ سو سے زائد بے گناہ کشمیری مسلمان شہید ہوئے، سینکڑوں زخمی اور اپاہج ہو گئے۔ سینکڑوں مکانات اور دُکانیں جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ کئی خواتین لاپتہ تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ اُنہیں بھارتی درندے اُٹھا کر لے گئے تھے.....

☆

دوسری طرف سعید انتہائی خطرناک رفتار سے جیپ دوڑا رہا تھا۔ اُن کا رُخ وولر جھیل کی طرف تھا۔ دن کی روشنی پھیلنے تک وہ سوپور سے کئی میل دُور نکل گئے۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں، پتھریلا راستہ تھا جو پہاڑیوں میں بل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک جگہ سعید نے جیپ روک لی۔ یہاں سے ایک تنگ سا راستہ پہاڑیوں کے اندر چلا گیا تھا۔ سعید نے جیپ اُس طرف موڑ دی۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس نے ایک بار پھر جیپ روک لی۔ وہ اسی طرح رُک رُک کر، چھپتے چھپاتے سفر کر رہے تھے۔ آگے راستہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی جس پر جیپ کو لے جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ جیپ سے اُتر کر ایک چھوٹی سی چٹان پر چڑھ گیا اور اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ آخر کار اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ دائیں طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک ہاتو، چنار کے ایک درخت پر کلہاڑے چلا رہے تھا۔ چنار کا وہ درخت بہت اُونچا تھا۔ چند کلہاڑے اور چلانے کے بعد چنار کا وہ تناور درخت کسی بدمست دیو کی طرح جھومتا ہوا، پُرشور آواز کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ جب درخت کے گرنے کا شور ختم ہوا تو سعید نے سیدھے ہاتھ کی دو اُنگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز چٹانوں میں بازگشت سی پیدا کرنے لگی۔ ہاتو، چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آخر کار اُس نے سعید کو دیکھ لیا اور وہ چٹانوں پر دوڑتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''میں تو صبح اذان کے وقت سے یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔'' ہاتو نے کہا۔

''ہاں..... کچھ دیر ہو گئی۔'' سعید نے جواب دیا۔

''دوسرے لوگ کہاں ہیں.....؟'' ہاتو نے پوچھا۔

''وہ اسی چٹان کے دوسری طرف ہیں۔ لیکن ہمارے تین ساتھی چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں کتنی دُور تک جانا ہو گا.....؟'' سعید نے پوچھا۔

''وہ..... جہاں میں نے درخت کاٹا ہے، اُس چٹان کے نشیب میں۔'' ہاتو نے جواب دیا۔

''چلو آؤ.....!'' سعید نے کہا اور ہاتو کے ساتھ چٹان سے اُتر کر جیپ کے قریب آ گیا۔ ہاتو

نے موسیٰ کو کندھے پر لاد لیا۔ جبکہ علی اور راٹھور نے دوسرے ساتھیوں کو اُٹھا لیا۔ تمام رائفلیں طارق اور نیلم وغیرہ نے اُٹھالی تھیں۔ نیلم نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ جیپ کو آگ لگا دی جائے۔

''نہیں..... یہ خطرناک ہو گا۔'' سعید نے کہا۔ ''جیپ کے جلنے سے دُھواں اُٹھے گا۔ اور دُھواں دیکھ کر لوگ اس طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اسے ایسے ہی رہنے دو۔''

وہ ہاتو کے پیچھے ایک تنگ سی دراڑ میں چلتے ہوئے چٹان کے دوسری طرف نشیب میں پہنچ گئے۔ یہاں چناروں کے سائے میں چند خچر چر رہے تھے۔ موسیٰ وغیرہ کو گھاس پر لٹا کر وہ لوگ بھی اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ اُن سب کے سانس بے ربط ہو رہے تھے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ وہ آرام کرتے رہے، پھر موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو الگ الگ خچروں پر اس طرح سوار کرا دیا گیا کہ سفر کے دوران انہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ دوسرے لوگ بھی خچروں پر سوار ہو گئے۔ ایک خچر بچ گیا تھا۔ جس کی رسّی ہاتو نے اپنے خچر کے ساتھ باندھ لی اور اُن کا سفر شروع ہو گیا۔

وہ لوگ وولر جھیل کے ساتھ ساتھ چٹانوں میں دُشوار گزار راستوں پر چلتے رہے۔ دوپہر ہو رہی تھی۔ سورج سر پر چمک رہا تھا۔ دُھوپ میں اگرچہ خاصی حدت تھی۔ لیکن ہوا کے خوشگوار جھونکوں کی وجہ سے گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب لوگ کشمیری تھے۔ محنتی اور جفاکش..... اُنہوں نے اسی وادی میں جنم لیا اور انہی پہاڑوں کے نشیب و فراز میں پرورش پائی تھی۔ یہ ہر موسم کی سختیاں جھیلنا جانتے تھے۔ کسی کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے۔ البتہ اُن کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں جن کا شمار صنف نازک میں ہوتا تھا۔ اُن دونوں کے چہروں پر تھکن کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن سب سے آگے والے خچر پر سوار ہاتو کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ فی الحال کہیں رُکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ دو بجے کے قریب اُنہوں نے ایک جگہ سے دریائے جہلم عبور کیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر اُنہوں نے تھوڑی دیر آرام کیا اور دریا کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر سفر کرتے ہوئے آخر کار ایک جگہ رُک گئے اور خچروں سے اُتر کر نہایت دُشوار گزار راستے پر چٹانوں میں چلنے لگے۔ اس راستے کا اختتام ایک غار کے دہانے پر ہوا۔

غار کا دہانہ بہت تنگ تھا۔ لیکن اندر سے یہ کافی کشادہ تھا۔ چند گز سیدھا جانے کے بعد غار دائیں طرف مُڑ گیا۔ وہاں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ اُس موڑ پر جیسے ہی گھومے، ایک دلچسپ منظر اُن کے سامنے تھا۔ اُس طرف سے غار مزید کشادہ تھا۔ یہاں کی زمین بھی بالکل ہموار تھی۔ جس پر چٹائیاں اور اُن پر نمدے بچھے ہوئے تھے۔ دو مختلف جگہوں پر پیٹرومیکس جل رہے تھے۔ ایک کونے میں چولہا جل رہا تھا اور کھانے پینے کا تقریباً تمام ہی سامان نظر آ رہا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لائن میں چار آرام دہ بستر بھی بچھے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ

اس غار میں کم از کم چار آدمی مستقل طور پر رہائش اختیار کئے ہوئے تھے۔ اس وقت غار میں تین آدمی موجود تھے۔ موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ باقی سب لوگ نمدوں پر لیٹ گئے۔ بھیڑ اور گھوڑوں کے بال سے بنے ہوئے قالین نما یہ نمدے بے حد آرام دہ تھے۔ غار میں موجود تین آدمیوں میں سے ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ فوراً ہی موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دسترخوان کی طرف متوجہ ہو گئے جس پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ کل رات کے کھانے کے بعد اُن لوگوں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ رات بھر جاگتے رہنے، بھاگ دوڑ اور دن بھر کے سفر نے اُنہیں بری طرح تھکا ڈالا تھا اور بھوک سے جیسے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ کھانے میں چاول اور چپاتیوں کے علاوہ بکرے کا بھنا ہوا گوشت تھا۔ اُنہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ پیٹ بھرتے ہی اُن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نیلم اور مشی کو غار کے ایک کونے میں جگہ دی گئی اور دونوں نے کمبل اوڑھ لئے اور لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئیں...... طارق اور سعید وغیرہ بھی کچھ دیر بعد سو چکے تھے۔

اُن کی آنکھ صبح پانچ بجے کھلی۔ سب سے پہلے علی بیدار ہوا تھا۔ نیلم اور مشی کے علاوہ اُس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی جگا دیا اور پھر نمازِ فجر کی تیاری ہونے لگی۔ جب وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو ہاتو قہوہ تیار کر چکا تھا۔ اُس نے سب کے ہاتھ میں ایک ایک پیالی تھما دی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ گزشتہ روز کے واقعات پر تبصرہ کرنے لگے۔ اُس غار میں اُن کا میزبان حاجی عثمان تھا۔ اُس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے لبریشن فرنٹ سے وابستہ تھا اور تحریک کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکا تھا۔ سات بجے کے لگ بھگ نیلم اور مشی بھی بیدار ہو گئیں۔ اُن کے جسموں پر وہی پھٹا ہوا لباس تھا۔ اُس پھٹے ہوئے لباس سے اگرچہ اُن کے جسموں کے بیشتر حصے جھلک رہے تھے، لیکن اُن کے آس پاس موجود مردوں میں سے کسی نے اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ سب کے سب فرشتے تھے۔ لیکن وہ سب ایک نیک مقصد کے تحت مل جل کر کام کر رہے تھے۔ اُن میں سے کسی کے دل میں ہوس نہیں تھی، کسی کی نظروں میں میل نہیں تھا۔ ویسے بھی نیلم اور مشی نے کمبل لپیٹ رکھے تھے۔ حاجی عثمان نے بتایا کہ یہ غار سرینگر سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن سرینگر کی صورتِ حال چونکہ زیادہ بہتر نہیں ہے اس لئے اُنہیں دو چار روز اسی غار میں رہنا پڑے گا۔

طارق اور اُس کے ساتھیوں نے بھی ابھی تک بھارتی فوجیوں کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ اور اُن وردیوں میں غار سے باہر نکلنا مناسب نہیں تھا۔ بھارتی فوجی قافلوں کی تاک میں مجاہدین'

ہاڑوں میں گھومتے رہتے تھے۔ وہ غلطی سے کسی مجاہد کی گولی کا نشانہ بن سکتے تھے۔

صبح آٹھ بجے ناشتے کے بعد ایک آدمی کو سرینگر روانہ کر دیا گیا تا کہ رحمان بابا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے علاوہ سرینگر کے حالات کا بھی علم ہو سکے۔ وہ آدمی سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ واپس آیا۔ وہ نیلم اور مشی کے علاوہ طارق اور اُس کے ساتھیوں کے لئے بھی کپڑوں کا ایک ایک جوڑا لے آیا تھا۔ ''رحمان بابا کو تم لوگوں کی کامیابی کا پتہ چل چکا ہے۔'' اُس شخص نے بتایا۔ ''لیکن ردِعمل کے طور پر بھارتی فوجیوں نے سوپور میں جو انتقامی کارروائی کی ہے، اُس کا رحمان بابا کو ہی نہیں، پوری کشمیری قوم کو بے حد دُکھ ہوا ہے۔''

''انتقامی کارروائی......؟'' طارق نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ سوپور کے فوجی کیمپ کی تباہی کے بعد بھارتی فوج انتقامی کارروائی ضرور کرے گی۔ لیکن اُنہیں ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ انتقامی کارروائی کس قسم کی ہو گی......؟

''بھارتی فوجیوں نے سوپور کے محلے آرام پور پر بمباری کر کے اُسے کھنڈر بنا دیا ہے۔ سینکڑوں بے گناہوں کو شہید کر دیا گیا، سینکڑوں زخمی ہوئے۔ سینکڑوں مکان جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ اس علاقے کی بیس بائیس عورتیں ابھی تک لاپتہ ہیں۔'' اُس شخص نے بتایا۔

طارق سناٹے میں آ گیا۔ بھارتی درندہ صفت فوجیوں سے انتقامی کارروائی کے حوالے سے کسی بھی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نہتے اور معصوم کشمیری شہریوں پر مارٹروں اور توپوں سے گولہ باری کی جائے گی۔

''اس کا ردِعمل پوری وادی میں ہوا ہے۔'' اُس شخص نے بتایا۔ ''سرینگر میں کل صبح ہی سوپور کے فوجی کیمپ کی اطلاع مل گئی تھی۔ بھارتی فوج کل صبح سے شہر پر قیامت ڈھائے ہوئے ہیں۔ ساری وادی میں ظلم و بربریت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ محض شک کی بناء پر لوگوں کے گھر جلائے جا رہے ہیں۔ کوئی سوال پوچھنے والوں کو گولی سے اُڑا دیا جاتا ہے۔ بھارتی فوج کو جن پانچ انگریزی قوانین کا سہارا ملا تھا، وہ اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اُن قوانین کی آڑ میں وہ جس کو چاہیں گولی سے اُڑا دیں، جس عمارت کو چاہیں جلا کر راکھ کر ڈالیں۔ اُن سے کوئی باز پُرس نہیں ہو گی۔ اور وہ ان قوانین کی آڑ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔''

طارق نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُس کے دانت بھنچ گئے اور جبڑوں کے مسل اُبھر آئے۔ اُس کے چہرے کے تاثرات اُس کے اندرونی جذبات کی عکاسی کر رہے تھے۔ اُس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اُن کی کیفیت بھی اُس سے مختلف نہیں تھی۔

☆

سرینگر سے چھ میل دُور مجاہدین کی وہ پارٹی، چٹانوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ اُس پارٹی میں پندرہ مجاہدین شامل تھے اور اُن کا لیڈر حاجی عثمان تھا۔ باقی چودہ مجاہدین میں طارق، علی، راٹھور اور سعید بھی شامل تھے۔ اُنہیں آج صبح دس بجے کے قریب یہ اطلاع ملی تھی کہ شام پانچ بجے بھارتی فوج کا ایک قافلہ سرینگر سے بارہ مولہ کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔

جس غار میں یہ لوگ پناہ لئے ہوئے تھے، وہ اُس سڑک سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ غار بلند چٹانوں میں ایسی جگہ پر واقع تھا، جس طرف سے کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی، نہ ہی کوئی ایسی پگڈنڈی تھی جس پر چل کر اُس غار تک پہنچا جا سکتا۔ بہ الفاظ دیگر یہ مجاہدین کے لئے ایک محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔

بھارتی فوجی قافلے کے بارے میں اطلاع ملتے ہی طارق نے حاجی عثمان اور اپنے دیگر ساتھیوں سے صلاح مشورے شروع کر دیئے۔ اور آخر یہ طے پایا کہ وہ اس فوجی قافلے پر حملہ کریں گے۔

غار میں حاجی عثمان کے پاس ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا۔ چند مارٹر گنیں، راکٹ اور دستی بموں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی تھا۔ یہ تمام اسلحہ مختلف اوقات میں بھارتی فوجیوں ہی سے چھینا گیا تھا اور وقتاً فوقتاً اُنہی کے خلاف استعمال ہوتا رہتا تھا۔

یہ لوگ چار بجے غار سے نکل گئے۔ نیلم اور مشی کو غار ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ حاجی عثمان کا ایک آدمی بھی غار میں رہ گیا تھا۔ دُشوار گزار پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے یہ لوگ پونے پانچ بجے کے قریب سرینگر سے بارہ مولہ کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ یہاں اُنہوں نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں سڑک ایک تنگ سے درّے میں سے گزرتی تھی۔ دونوں طرف عمودی چٹانیں تھیں۔ مجاہدین دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک پارٹی نے حاجی عثمان کی سربراہی میں سڑک کے ایک طرف چٹانوں پر پھیل کر مورچے سنبھال لئے۔ اور دوسری پارٹی طارق کی کمان میں سڑک کے دوسری طرف چٹانوں پر مورچہ زن ہو گئی۔ یہ طے پایا تھا کہ سب سے پہلے حاجی عثمان فائر کرے گا۔ اور اس فائر کو سگنل سمجھ کر تمام مجاہدین فائر کھول دیں گے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا..... ایک ایک لمحہ اُن پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اطلاع کے مطابق فوجی قافلے کو سرینگر چھاؤنی سے ٹھیک پانچ بجے روانہ ہونا تھا۔ چھ میل کا فاصلہ طے کرنے میں اُس فوجی قافلے کو پندرہ بیس منٹ لگ سکتے تھے۔ سرینگر روانگی میں تاخیر بھی ہو سکتی تھی۔

ساڑھے پانچ بج گئے..... طارق اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اُسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں اُس قافلے کی روانگی ملتوی تو نہیں کر دی گئی؟ لیکن اُس کا یہ اندیشہ بے بنیاد نکلا۔ پانچ بج کر چالیس منٹ پر پہاڑوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گونج سنائی دینے لگی۔ اس کے صرف ایک منٹ بعد ایک فوجی جیپ سڑک کا موڑ گھوم کر سامنے آ گئی۔ جیپ پر مشین گن نصب تھی۔ ایک مستعد فوجی، مشین گن پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ چار دوسرے فوجی، جیپ کی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں اور وہ بھی خاصے مستعد نظر آ رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک کیپٹن بیٹھا ہوا تھا۔ جیپ پر آگے دائیں طرف بھارتی ترنگا اور بائیں طرف اُس یونٹ کا جھنڈا لہرا رہا تھا جس سے اُس قافلے کا تعلق تھا۔

طارق اور دیگر مجاہدین، پتھروں کے پیچھے گھات لگائے بیٹھے جیپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن سب کے ہاتھ سب مشین گنوں پر سختی سے جمے ہوئے تھے۔ وہ جیپ تقریباً پچاس گز آگے جا کر ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تقریباً اُسی وقت پچھلے موڑ پر چھ بھارتی فوجی ٹرک مُڑتے نظر آئے..... سب سے پہلے اور سب سے آخری ٹرک پر مشین گنیں نصب تھیں اور اُن ٹرکوں پر کم از کم بیس بیس بھارتی فوجی مشین گنیں سنبھالے تیار و مستعد بیٹھے ہوئے تھے..... درمیان کے چار ٹرکوں پر بھاری ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُن چاروں ٹرکوں پر گولہ بارود لدا ہوا تھا۔ ٹرکوں کا یہ قافلہ جیسے ہی درّے کے وسط میں پہنچا، سڑک کے دوسری طرف چٹان پر ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے حاجی عثمان نے اپنی سب مشین گن کا ٹرائیگر دبا دیا..... اُس کی پہلی گولی سب سے اگلے ٹرک پر بیٹھے ہوئے ایک فوجی کے کندھے پر لگی۔

حاجی عثمان کا فائر ایک سگنل تھا۔ سڑک پر دونوں طرف چٹانوں میں چھپے ہوئے مجاہدین نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے فائر کھول دیا..... فوجی قافلے کے سب سے اگلے اور پچھلے ٹرک پر بیٹھے ہوئے بھارتی فوجیوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی.....

خاموش پہاڑ، مشین گنوں کی آوازوں سے گونجنے لگے۔ طارق نے ایک دستی بم نکال کر دانتوں سے اُس کی پن کھینچی اور اللہ کا نام لے کر بم قافلے کے دو نمبر ٹرک پر اُچھال دیا۔ بم، ٹرک کے قریب سڑک پر گرا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ لیکن ٹرک کو وہ نقصان نہیں پہنچ سکا، جس کی طارق کو توقع تھی۔ ٹھیک اُسی لمحے سامنے کی چٹان سے اُس ٹرک پر راکٹ فائر کیا گیا۔ راکٹ

ٹھیک نشانے پر لگا..... ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے اور فضا مسلسل دھماکوں سے گونجنے لگی..... گولہ بارود سے لدے ہوئے دوسرے ٹرکوں پر بھی دستی بم اور راکٹ برسائے جا رہے تھے۔ قافلے کے آخری ٹرک پر دو فوجی ہلاک ہو چکے تھے۔ اُس ٹرک کا ڈرائیور کچھ عقل مند ثابت ہوا۔ وہ بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹرک کو واپس موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ٹرک بڑی تیزی سے سرینگر کی طرف واپس دوڑا..... طارق کے دو ساتھی اُس ٹرک پر فائرنگ کر رہے تھے۔ لیکن ڈرائیور بڑا ہوشیار ثابت ہوا۔ وہ ٹرک کو نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

گولہ بارود سے لدے ہوئے ٹرکوں پر مسلسل دستی بم پھینکے جا رہے تھے۔ فضا، دھماکوں سے گونج رہی تھی۔ چٹانیں لرز رہی تھیں۔ سب سے آگے والے ٹرک سے جوابی فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ اُس ٹرک میں کوئی بھی فوجی زندہ نہیں بچا تھا۔

آگے جانے والی جیپ بھی واپس آ گئی تھی۔ لیکن جیپ پر سوار فوجیوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو جیپ مُڑ کر تیزی سے دوڑتی ہوئی چٹان کے پیچھے غائب ہو گئی.....

اُسی وقت فضا میں سبز روشنی چمکی۔ یہ گرین ٹریس فائر حاجی عثمان نے کیا تھا۔ یہ مجاہدین کے لئے سگنل تھا کہ وہ کارروائی ختم کر کے اپنے ٹھکانے کی طرف فرار ہو جائیں۔

سبز روشنی دیکھتے ہی مجاہدین کی طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ اُس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ طارق اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندھا دُھند چٹانوں میں دوڑ رہا تھا۔ چند منٹ بعد ہی وہ اُس جگہ سے بہت دُور نکل گئے۔ اور جب وہ لوگ غار میں پہنچے تو آٹھ بج چکے تھے۔ اُس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد حاجی عثمان کی پارٹی کے مجاہد بھی ایک ایک کر کے آنے لگے۔ دس بجے تک اُن کے تمام ساتھی غار میں پہنچ چکے تھے۔

اس کارروائی میں مجاہدین میں سے کسی کو معمولی سا زخم تک نہیں آیا تھا۔ جبکہ بھارتی فوج کے اس قافلے میں تقریباً پچیس فوجی ہلاک ہو چکے تھے۔ یہ مجاہدین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی کا جشن دسترخوان پر بکرے کے بھنے ہوئے گوشت اور گرم گرم قہوے سے منایا گیا۔

''رات کے وقت تو بھارتی فوجی پہاڑوں میں آنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔'' حاجی عثمان نے کہا۔ ''اس لئے دو دو آدمی جاگ کر دو دو گھنٹے تک ڈیوٹی دیں گے۔''

''ٹھیک ہے.....!'' طارق نے کہا۔ ''لیکن کیا بھارتی فوجی دن کے وقت ہمیں اِن پہاڑوں میں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے.....؟''

''دُشوار گزار پہاڑوں میں آنے کی جرات وہ پھر بھی نہیں کرتے۔'' حاجی عثمان نے کہا۔ ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ ہے جسے ہم کئی برسوں سے استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم دن کے وقت بھی پہرے داری کا نظام قائم رکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے.....!'' طارق نے کہا۔ ''تو سب سے پہلے میں اور علی ڈیوٹی دیتے ہیں۔ اس کے بعد سعید اور ہاتو کی باری آئے گی۔ اور بعد کے لئے تم ڈیوٹیاں مقرر کر دو۔''

طارق اُٹھ کر اپنی سب مشین گن چیک کرنے لگا۔ علی نے بھی سب مشین گن اُٹھائی اور وہ دونوں غار کے دہانے کی طرف چل پڑے۔

صبح کے سات بج رہے تھے۔ اُس وقت حاجی عثمان اور اُن کا ایک ساتھی غار کے دہانے پر بیٹھے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ غار کے سامنے بڑے بڑے پتھر ہونے کی وجہ سے زیادہ دُور تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ بار بار اُٹھ کر پتھروں پر چڑھتے، اِدھر اُدھر دیکھتے اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے۔ سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اُن دونوں نے سردی سے بچنے کے لئے دھسے لپیٹ رکھے تھے۔ حاجی عثمان آخری چکر لگا کر آیا تو اپنی رائفل ایک پتھر سے ٹکاتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

''رحمت! ابھی ہماری ڈیوٹی میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ سردی لگ رہی ہے۔ تم اندر جا کر قہوہ تو بنا لاؤ! لیکن آرام سے، دوسروں کی نیند خراب نہ ہو۔''

''بہتر ہے.....!'' رحمت نے اپنی گن ایک پتھر سے ٹکا کر کھڑی کر دی اور غار میں چلا گیا۔

حاجی عثمان دھسے کی بُکل مارے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

تقریباً دو منٹ بعد دائیں طرف ایک پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا..... اُس نے فوراً ہی اپنی رائفل اُٹھا لی۔ وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ایک منٹ اور گزر گیا..... پتھر کے لڑھکنے کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی..... اس مرتبہ یہ آواز زیادہ قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ حاجی عثمان، پتھروں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک پتھر کی آڑ سے نکل کر دوسرے پتھر کی طرف جا رہا تھا کہ خاموش فضا، فائر کی آواز سے گونج اُٹھی..... گولی دائیں طرف سے چلائی گئی تھی جو حاجی عثمان کے سر کے اُوپر سے گزرتی ہوئی ایک پتھر پر لگی۔ حاجی عثمان نے ایک دم دوسرے پتھر پر چھلانگ لگا دی اور بڑی احتیاط سے جھانک کر اُس طرف دیکھنے لگا، جہاں سے گولی چلائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... اُس سے تقریباً پچاس گز دُور ایک پتھر پر ایک بھارتی فوجی کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفل تھی اور وہ متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

عثمان نے دوسری طرف دیکھا تو اُس طرف بھی دو فوجی نظر آئے۔ اور ایک فوجی تیسری طرف بھی دکھائی دیا.....

حاجی عثمان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ گھیرے میں آ چکے ہیں اور وہ صرف چار فوجی ہی نہیں تھے، یقیناً اور بھی بہت سے فوجی ہوں گے جو پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں گے۔

حاجی عثمان نے اُن دو فوجیوں کی طرف دیکھا جو تقریباً تیس گز دُور ایک پتھر پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ حاجی عثمان نے سب مشین گن سنبھالی اور ٹرائیگر دبا دیا..... فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی ایک فوجی کی بھیانک چیخ فضا میں اُبھری اور وہ قلابازی کھاتا ہوا نیچے گرا۔ دوسرے فوجی نے پتھر کی دوسری طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی ہو..... گولیاں، پتھروں پر لگ رہی تھیں اور ویرانہ فائرنگ کی آواز سے گونج رہا تھا..... حاجی عثمان بھی فائرنگ کر رہا تھا۔ اُس کی رائفل خالی ہو گئی تو اُس نے رحمت کی رائفل اُٹھالی اور فائرنگ جاری رکھی۔ وہ فائرنگ کرتا ہوا غار کے دہانے پر ایک پتھر کے پیچھے پہنچ گیا۔

اُسی لمحے طارق، رحمت اور علی وغیرہ غار میں دوڑتے ہوئے دہانے پر پہنچ گئے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔

''رحمت.....!'' حاجی عثمان چیخا۔ ''تم ان لڑکیوں کو لے کر غار کے پچھلے راستے سے نکل کر دو نمبر پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ اور باقی یہیں رُک کر مقابلہ کریں۔ دو آدمی ایمونیشن لے آئیں۔ ہری اَپ.....!''

رحمت اور اُس کے ساتھ ایک اور آدمی غار کے اندر بھاگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دوسرے مجاہدین بھی پہنچ گئے۔ وہ ایمونیشن کی دو تین پیٹیاں بھی لے آئے تھے۔ حاجی عثمان کا خیال تھا کہ اُن کے مقابلے پر تیس چالیس فوجی تھے جو غار کی طرف اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔ حاجی عثمان اور اُس کے ساتھی غار کے دہانے کے سامنے پتھروں کی آڑ میں پوزیشن سنبھالے فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔

اچانک یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرنیڈ، دہانے کے قریب گر کر پھٹے اور دو کان پھاڑ دینے والے دھماکے ہوئے..... اس کے ساتھ ہی دو چیخیں بلند ہوئیں۔ طارق نے گھوم کر دیکھا، اُن کا ایک ساتھی شہید ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ دوسرا مجاہد زخمی ہوا تھا۔ اُس کے بازو پر بم کا ٹکڑا لگا تھا۔

''غار کے اندر چلو.....!'' حاجی عثمان نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

وہ لوگ فائرنگ کرتے ہوئے اُلٹے قدموں دوڑ کر غار میں گھس گئے۔ اس دوران دو اور ہینڈ گرنیڈ غار کے دہانے کے سامنے گرے۔ لیکن اس مرتبہ اُن میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ حاجی عثمان اور دو آدمی غار کے دہانے کے اندر کی طرف کھڑے فائرنگ کرتے رہے۔ ایک ایک زناٹے کی آواز گونجی، اور پھر کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... بھارتی فوجیوں کی طرف سے راکٹ فائر کیا گیا تھا جو غار کے دہانے کے اُوپر والی چٹان پر لگا اور بڑے بڑے پتھر ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے..... صرف ایک منٹ کے وقفے سے ایک اور راکٹ داغا گیا..... یہ راکٹ بھی اُوپر والی چٹان پر لگا۔ کچھ اور بڑے بڑے پتھر ٹوٹ کر نیچے گرے اور غار کا دہانہ بند ہونے لگا.....

''بھاگو..... جلدی.....!'' حاجی عثمان چیخا۔

وہ لوگ حاجی عثمان کے ساتھ اندر کی طرف دوڑنے لگے۔ غار خالی تھا۔ رحمت، نیلم اور مشی کو لے کر جا چکا تھا۔ اندر سامان بکھرا ہوا تھا اور صرف ایک پیٹرومیکس جل رہا تھا۔ وہ لوگ غار کے اُس حصے میں پہنچ گئے جہاں گولہ بارود رکھا ہوا تھا۔ اُنہوں نے اپنی اپنی قوتِ استعداد کے مطابق گولہ بارود اُٹھایا اور حاجی عثمان کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے غار کے آخری سرے پر ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گئے۔ یہ تنگ سا سرنگ نما راستہ بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً دو سو فٹ اُوپر جا کر یہ راستہ مزید تنگ ہو گیا۔ ایک ایسی جگہ بھی آئی، جہاں سے اُنہیں سینے کے بل رینگ کر گزرنا پڑا۔ دوسری طرف پہنچ کر وہ رُک گئے۔ یہاں سے سرنگ پھر کشادہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہاں چند بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ حاجی عثمان نے طارق وغیرہ کی مدد سے دو تین بڑے پتھر دھکیل کر غار کے تنگ دہانے کے سامنے رکھ دیئے اور وہ راستہ بند ہو گیا۔

وہ لوگ بتدریج بلندی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ آخر کار کھلی جگہ پر نکل آئے..... یہاں ایک پتھر کے پیچھے نیلم، مشی اور رحمت سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہو.....؟'' حاجی عثمان نے رحمت کو گھورا۔

''ان دونوں کا کہنا ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' رحمت نے کہتے ہوئے نیلم اور مشی کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔'' حاجی عثمان نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن صورتِ حال ایسی نہیں کہ تمہیں روکا جا سکے۔ تم دونوں اس کے ساتھ نکل جاؤ۔''

''حاجی صاحب.....!'' مشی نے دونوں ہاتھ سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو ہمارے ہاتھوں میں چوڑیاں نظر آ رہی ہیں؟''

''نہیں۔ لیکن.....'' حاجی عثمان کہتے کہتے رُک گیا۔ وہ غالباً مشی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہم لوگ اس وقت غار کے اُوپر ہیں۔ وہ بھارتی درندے اس طرف ہوں گے۔ تم لوگ پھیل کر آگے بڑھتے رہو۔ وہ سب لوگ ہماری زد میں ہوں گے۔ کسی کو زندہ بچ کر نہیں جانا چاہئے۔''

وہ لوگ پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے چٹان کے کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔ نیلم اور مشی بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ پہاڑ ابھی بھی دھماکوں سے گونج رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ بھارتی فوجی ابھی تک غار کے دہانے پر گولہ باری کر رہے تھے۔ چٹانیں لرزتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ چٹان کے کنارے پر پہنچ کر وہ رُک گئے۔ حاجی عثمان نے کچھ اور آگے جا کر ایک پتھر کے کی آڑ سے جھانکا اور اس کے ساتھ ہی اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... جس وقت غار پر حملہ ہوا تھا تو حاجی عثمان کا خیال تھا کہ بھارتی فوجیوں کی تعداد، تیس چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن اُس کا اندازہ غلط تھا۔ چٹان کے نیچے اُس کے سامنے چاروں طرف بھارتی فوجی پھیلے ہوئے تھے جو غار کے دہانے پر گولہ باری کر رہے تھے۔ اُن کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم کسی طرح نہیں تھی۔ حاجی عثمان نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے حاجی عثمان کے قریب آ گئے۔

طارق اور علی کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ لیکن راکٹ صرف چار تھے۔ البتہ اُن لوگوں کے پاس ہینڈ گرنیڈ خاصی تعداد میں موجود تھے۔ حاجی عثمان کے اشارے پر اُن سب نے فائر کھول دیا۔

بہت سے بھارتی فوجی اُن کی زد میں تھے۔ بھارتی فوجیوں پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پہاڑی کے اُوپر سے بھی اُن پر حملہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک مسلسل غار کے دہانے پر فائرنگ کرتے رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ مجاہدین کو غار کے اندر ہی ختم کر دیں گے۔ لیکن اس نئی صورتِ حال نے اُنہیں بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔

پہلے ہی حملے میں کئی فوجی جہنم رسید ہو گئے اور باقی اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے پتھروں کے پیچھے پناہ لینے لگے۔ مجاہدین نے اب دستی بم پھینکنا شروع کر دیئے تھے۔ فوجی بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ دس پندرہ فوجی ایک پتھر کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ طارق نے اُس

طرف راکٹ فائر کر دیا..... راکٹ اُس پتھر سے ٹکرا کر پھٹا اور کئی بھارتی فوجیوں کے پرخچے اُڑ گئے۔

مسلسل دستی بموں اور راکٹوں کے حملے سے بھارتی فوجیوں کے ذہنوں پر یہ تاثر مرتب ہوا کہ مجاہدین کی کوئی بڑی پلٹن اُن کے مقابلے پر آ گئی ہے۔ اب بھارتی فوجی مقابلے کی بجائے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے فوجی بھی مجاہدین کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد طارق، حاجی عثمان اور اُس کے ساتھی چٹان سے اُتر آئے۔ چٹان کا دہانہ اُوپر سے گرنے والے پتھروں سے بند ہو چکا تھا اور چاروں طرف بھارتی فوجیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کئی فوجی زخمی تھے جو بری طرح چیخ و پکار کر رہے تھے۔ ایسے زخمی فوجیوں کو بھی گولیوں کا نشانہ بنا کر اُنہیں تکلیف سے نجات دلا دی گئی۔

حاجی عثمان کے دو آدمی چٹان کے اُوپر والے راستے سے غار میں جا کر میڈیکل کٹ بکس اور چند ضروری چیزیں نکال لائے۔ زخمی مجاہد کی مرہم پٹی کر دی گئی اور مجاہدین کی یہ پارٹی حاجی عثمان کی رہنمائی میں پہاڑ کے دوسری طرف اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئی..... اس کارروائی میں مجاہدین کا صرف ایک ساتھی ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔ اس کے علاوہ کسی کو معمولی سی گزند بھی نہیں پہنچی تھی۔ نیلم اور مشی نے بھی بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔

چٹان سے اُتر کر وہ نشیب میں دُور تک پھیلی ہوئی وادی میں چل رہے تھے

''کتنی دُور جانا ہو گا حاجی صاحب.....؟'' نیلم نے پوچھا۔

''چنار کا وہ جنگل ہماری منزل ہے۔'' حاجی عثمان نے وادی کے دوسری طرف اُونچے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا، جس کی چوٹی پر چنار کے بلند درختوں کا جنگل نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد کسی نے کچھ نہیں پوچھا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلتے رہے۔

☆

طارق اور علی، ہری پربت پر ہاشم کے گھر پہنچ چکے تھے۔ نیلم، طارق کے ساتھ تھی۔ البتہ مشی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اُس کا مکان ڈل جھیل کے کنارے بلیوارڈ روڈ کے قریب ہی تھا۔ حاجی عثمان اپنے مجاہدین کے ساتھ پہاڑوں میں اپنے نئے ٹھکانے پر جا چکا تھا۔

رحمان بابا اب بالکل ٹھیک تھا۔ اعظم اگرچہ اپنے گھر واپس جا چکا تھا لیکن اُس نے قاسم کو ہدایت کر دی تھی کہ رحمان بابا کو باقاعدگی سے دوا دی جاتی رہے۔ اور اُسے دو چار روز تک زیادہ نہ چلنے پھرنے دیا جائے۔ دوا کے مسلسل استعمال اور آرام سے رحمان بابا پوری طرح سنبھل گیا

تھا۔ طارق اور نیلم وغیرہ کے آ جانے سے اُس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

''مرحبا میرے دوستو......!'' رحمان بابا نے باری باری اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں، تم لوگوں کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ سوپور کے فوجی کیمپ کی تباہی، کل بارہ مولا جانے والے فوجی قافلے کی تباہی اور آج صبح پہاڑوں میں باسٹھ بھارتی فوجیوں کی ہلاکت نے بھارتی حکمرانوں کا سکون برباد کر دیا ہے۔ اُن کے اعصاب چٹخنے لگے ہیں۔''

''لیکن رحمان بابا......!'' طارق نے کہا۔ ''حاجی عثمان تو کہہ رہا تھا کہ وہ غار محفوظ ترین پناہ گاہ ہے، اور کئی سال سے اُن کے استعمال میں ہے۔ لیکن مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ بھارتی فوجی، حاجی عثمان کے اُس خفیہ ٹھکانے تک کیسے پہنچ گئے؟''

''ممکن ہے، فوجی قافلے سے زندہ بچ جانے والے کسی فوجی نے تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم لوگوں کا پیچھا کیا ہو اور اس طرح وہ غار اُن کی نظروں میں آ گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی اُنہوں نے دیکھ لیا۔ اب وہ مجاہدین کے کسی خفیہ ٹھکانے پر حملہ کرنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچیں گے۔'' رحمان بابا نے جواب دیا۔

''وادی میں ہماری ان کارروائیوں کا کوئی ردِعمل......؟'' طارق نے پوچھا۔

''ردِعمل تمہارے سامنے ہیں۔'' رحمان بابا نے کہا۔ ''بے گناہوں کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا ہے۔ لیکن......'' رحمان بابا چند لمحے خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ بھارتیوں کے اعصاب چٹخنا شروع ہو گئے ہیں۔ پہاڑوں میں باسٹھ فوجیوں کی ہلاکت کی خبر جب سرینگر پہنچی تو ایک فوجی چوکی پر متعین ایک فوجی نے اپنے ہی ساتھیوں پر فائرنگ شروع کر دی جس سے تین فوجی ہلاک اور سات زخمی ہو گئے۔ بعد میں پوچھ گچھ کے دوران فائرنگ کرنے والے اُس فوجی نے بتایا کہ اپنے ساتھیوں کو اس طرح بے بسی کی موت مرتے دیکھ کر اُس کی قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے۔ یہ تو ابھی ابتداء ہے، اب وہ وقت بھی دُور نہیں جب یہ بھارتی فوجی خونخوار درندوں کی طرح اپنے ہی ساتھیوں کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو'' طارق بولا۔

''انشاءاللہ! ایسا ہی ہوگا'' رحمان بابا نے کہا۔

''ملہوترہ کے بارے میں کیا سوچا ہے بابا......؟'' طارق نے پوچھا۔

''تمہارا مطلب سیٹھ سندر ملہوترہ سے ہے؟'' رحمان بابا نے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں......آپ کو یاد ہے دِلّی سے میں جو کاغذات لایا تھا، اُن میں منصوبے کے مطابق سیٹھ

ہوترہ ہی وہ شخص ہے جو وادی میں بھارتی ایجنٹوں کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ اُس کے ں مکمل لسٹ ہے۔ ان ایجنٹوں میں کچھ کشمیری بھی شامل ہیں۔ لیکن اُنہیں بخشا نہیں جائے گا۔ اروں کو سزا ضرور دی جائے گی۔''

''میں سیٹھ ملہوترہ کو بھولا نہیں ہوں۔'' رحمان بابا نے جواب دیا۔ ''بیمار ہونے کے باوجود ں آرام سے نہیں بیٹھا رہا۔ ہاشم کے ذریعے میں نے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ں۔ وہ دہلی گیا ہوا ہے۔ کل کی فلائٹ سے آ جائے گا۔ اس کے بعد ہی ہم پروگرام بنائیں گے۔ ہو سکتا ہے، کل رات ہی ہم اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالیں۔ کل تک تم لوگ آرام کرو۔''

☆

دوسرے روز دہلی سے آنے والے طیارے میں مسافروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ صرف ترہ مسافر اُس جہاز سے اُترے تھے۔ اُن میں کوئی عورت نہیں تھی۔ چھ سویلین مسافر تھے اور باقی فوجی آفیسر۔ دوسری طرف روانگی کا ویٹنگ لاؤنج دہلی جانے والے مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام سیٹیں اوکے تھیں۔ لیکن اس کے باوجود چانس والوں کی بھی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ لیکن اُن میں سے کسی کو بھی سیٹ نہ مل سکی۔

ٹرمینل سے باہر آنے والے مسافروں میں سیٹھ ملہوترہ بھی تھا۔ اُس کی عمر پچاس اور پچپن کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ سفید دھوتی، سفید کرتا اور کالا کوٹ، سر پر کالے رنگ کی دو پلی قسم کی ٹوپی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا چمڑے کا ایک بیگ تھا۔ ٹرمینل سے باہر آ کر اُس نے بیگ سینے سے لگا لیا اور آنکھوں پر عینک درست کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں ایک شخص تقریباً دوڑتا ہوا سیٹھ سندر ملہوترہ کے قریب پہنچ گیا۔ لباس سے وہ شوفر ہی لگتا تھا۔ سیٹھ ملہوترہ اُس کے ساتھ چلتا ہوا پارکنگ میں کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی ایک کار میں بیٹھ گیا۔ شوفر نے سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کر دیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے حرکت میں آ کر پارکنگ سے باہر آ گئی۔ گاڑی جیسے ہی شہر کی طرف جانے والی سڑک پر مُڑی، چند گز دُور درختوں کے نیچے کھڑی ہوئی ایک موبائل وین بھی حرکت میں آ گئی۔ اُس موبائل وین میں چھ پولیس والے تھے۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، دوسرا وین پر نصب ہلکی مشین گن پر ہاتھ رکھے مستعد کھڑا تھا۔ چار پولیس والے وین کی بینچ نما سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ یہ پولیس موبائل وین چند گز کا فاصلہ دے کر سیٹھ ملہوترہ کی کار کے پیچھے چل پڑی۔

ایئرپورٹ کے سامنے پارکنگ میں ایک کھٹارہ سی کار میں بیٹھے ہوئے دو آدمی بڑی گہری

نظروں سے سیٹھ ملہوترہ کی کار اور اُس کے پیچھے پولیس کی موبائل وین کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اُنہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس کی اُس موبائل وین کو خاص طور پر ایئر پورٹ بھیجا گیا تھا۔

کھٹارہ کار کے سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے انجن سٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر کشمیری تھے اور اُن کا تعلق رحمان بابا کی لبریشن فرنٹ سے تھا۔ وہ لوگ سیٹھ سندر ملہوترہ کی نگرانی کے لئے ہی ایئر پورٹ آئے تھے۔ اُن کی کار کے پارکنگ سے نکلنے سے پہلے ایک اور کار آگے نکل چکی تھی اور اُن کے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ سیٹھ سندر ملہوترہ اور اُن کی کار کے درمیان ایک اور کار کا حائل ہونا اُن کے خیال میں اُن کے حق میں بہتر ہی تھا۔ اس طرح اُن پر تعاقب کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایئر پورٹ سے شہر تک تقریباً بیس میل کا فاصلہ بڑی تیزی سے طے ہوا۔ اس طویل راستے پر اگرچہ جگہ جگہ فوجی پارٹیاں پٹرولنگ کر رہی تھیں لیکن ایئر پورٹ کی طرف آنے جانے والے لوگ یہ فاصلہ بڑی تیز رفتاری سے طے کرتے تھے۔ مجاہدین کا خوف ہر ذہن پر طاری تھا۔

سیٹھ ملہوترہ کی کار سرینگر کلب کے عقب سے ہوتی ہوئی بند روڈ پر پہنچ گئی۔ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر آباد شہر کا یہ علاقہ سرکاری افسروں، وزیروں اور شہر کے دولت مندوں کی رہائش کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں بڑے بڑے بنگلے تھے۔ سیٹھ ملہوترہ کی کار بھی بند روڈ کے قریب ایک کشادہ گلی میں مُڑ کر ایک بہت بڑے بنگلے کے سامنے رُک گئی۔ پولیس کی موبائل وین بھی اُس سے چند گز کے فاصلے پر رُک چکی تھی۔ ملہوترہ کے ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ اندر سے ایک باوردی پولیس والے نے گیٹ کھول دیا۔ سیٹھ کی کار اندر داخل ہو گئی اور پولیس کی موبائل وین سڑک پر سیدھی نکل گئی۔ اُس موبائل پارٹی کے ذمے شاید اتنا ہی کام تھا کہ وہ سیٹھ کو بحفاظت ایئر پورٹ سے گھر پہنچا دیں۔

اُن دونوں عمر رسیدہ کشمیری مجاہدین کی کھٹارہ سی کار بھی سیٹھ ملہوترہ کے بنگلے کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔

اُسی شام دونوں کشمیری مجاہدین میں سے ایک ہاشم کے مکان میں رحمان بابا کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا.....

''سیٹھ سندر ملہوترہ اپنے بیوی بچوں کو دہلی چھوڑ آیا ہے۔ کوٹھی میں اُس کے پاس ایک ملازم ہے۔ یا پھر وہ کانسٹیبل جو کوٹھی کے گیٹ کے قریب گارڈ کیبن میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ عقبی کوٹھی میں ایک سرکاری آفیسر رہائش پذیر ہے۔ لیکن وہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑنے کے لئے آج

صبح کی فلائٹ سے دہلی گیا ہے۔ اُس کی واپس میں تین دن لگیں گے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ ہت سے سرکاری بنگلے آج کل تقریباً خالی پڑے ہیں۔ بڑے بڑے سویلین اور فوجی آفیسر اپنے وی بچوں کو ہندوستان بھیج رہے ہیں۔ وہ پولیس اور فوج کے پہرے کے باوجود اپنے گھروں کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ مجاہدین کے حملوں کے خوف نے اُن کی راتوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔''

''اب وہ وقت دُور نہیں رہا جب یہ لوگ خود بھی ہندوستان کا رُخ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' رحمان بابا نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''بہر حال! یہاں کون کون موجود ہے.....؟''

''طارق، علی، ہاشم اور نیلم۔ سعید بھی تھوڑی دیر میں آنے والا ہے۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔ وہ حاجی عثمان تھا جس نے اپنا حلیہ کسی حد تک تبدیل کر رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے..... اتنے ہی آدمی کافی ہوں گے۔ اب میں جو کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو!'' رحمان بابا نے کہا۔ اور پھر اُنہیں اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ''عثمان اور ہاشم کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ وہ دریا میں کشتی پر تم لوگوں کے منتظر رہیں گے۔ طارق، نیلم کے ساتھ جائے گا۔ اور سعید تمہارے ساتھ جائے گا۔ میں خانقاہ پر تم لوگوں کا انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے..... ہم سمجھ گئے۔'' حاجی عثمان نے سر ہلا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہاشم نے دسترخوان پر کھانا لگا دیا۔ کھانا لگانے سے پہلے سعید بھی پہنچ گیا تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی علی اور سعید مکان سے نکل گئے۔ اُس وقت شام کے آٹھ بجے تھے۔ گیارہ بجے طارق اور نیلم بھی رُخصت ہو گئے۔ اور پھر حاجی عثمان اور ہاشم بھی رحمان بابا کو خدا حافظ کہہ کر مکان سے چلے گئے۔

طارق، نیلم کو لے کر دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر پہنچ گیا۔ دریا کے پُل پر فوج کا پہرہ تھا۔ اُنہیں وہاں سے گزرنے کے لئے خاصی دُشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن بہر حال! وہ کسی نہ کسی طرح پُل سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ دُور تک وہ بند روڈ پر چلتے رہے۔ اور پھر گلیوں کے درمیان کشادہ گلیوں میں گھومتے ہوئے اُس سڑک پر آ گئے جہاں سیٹھ ملہوترہ کا بنگلہ تھا۔

اُس سڑک پر بھی بنگلوں کے سامنے درخت لگے ہوئے تھے۔ طارق نے اکثر بنگلوں کے گیٹوں پر اندر کی طرف مسلح محافظ کھڑے دیکھے تھے۔ اُس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ سیٹھ ملہوترہ کے بنگلے پر پہنچ گئے..... طارق اخروٹ کے ایک تناور درخت

کے پیچھے چھپ گیا اور نیلم نے گیٹ پر ہولے سے دستک دی۔ انتظار کئے بغیر وہ دوبارہ دستک دینے لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بڑی عجلت میں ہو۔ چند سیکنڈ بعد ہی گیٹ کے اُوپر سے محافظ نے باہر جھانکا۔

''کون ہو تم..... کیا بات ہے؟'' پولیس والے نے پوچھا۔

''میں ایک مظلوم کشمیری عورت ہوں۔'' نیلم نے کہتے ہوئے چادر اُتار دی۔ گیٹ پر جلنے والے بلب کی روشنی میں اُس کا نیم عریاں سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ''کچھ غنڈے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے اُن سے بچ کر اس طرف آئی ہوں۔ میری مدد کرو! وہ غنڈے اس طرف پہنچنے ہی والے ہوں گے۔''

پولیس والا گیٹ کے اُوپر سے گردن اُٹھائے نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سنسان گلی، آدھی رات کا وقت اور جوان و حسین عورت..... پولیس والے کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ اُس نے بنچوں کے بل کھڑے ہو کر گردن اور باہر نکالی اور سڑک پر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

''خدا کے لئے میری مدد کرو!'' غنڈے اس طرف آنے ہی والے ہوں گے۔'' نیلم گھگھیائی۔ پولیس والے نے بڑی آہستگی سے گیٹ کھول دیا۔ رائفل اُس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور نیلم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''آؤ..... اندر آ جاؤ! تم ٹھیک جگہ پر آئی ہو۔ یہاں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' نیلم اُس کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ پولیس والے کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ رات آرام سے گزر جائے گی۔

ابھی وہ پولیس والا گیٹ سے ایک قدم دُور ہی تھا کہ طارق بڑی آہستگی سے درخت کی آڑ سے نکلا اور بلی کی چال چلتا ہوا پولیس والے کی پشت پر پہنچ گیا۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر اُس کے پیر سے ٹکرایا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز سن کر پولیس والا تیزی سے پیچھے مُڑا لیکن اُسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ طارق نے بڑی پھرتی سے اُچھل کر اُسے دبوچ لیا۔ اُس کا ایک ہاتھ پولیس والے کے منہ پر جم گیا تھا۔ تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔

وہ پولیس والے کو گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ نیلم نے جلدی سے گیٹ بند کر دیا۔ طارق، پولیس والے کو لے کر گیٹ سے ملحق گارڈ کیبن میں آ گیا۔ پولیس والے کی رائفل نیچے گر گئی تھی جسے نیلم نے اُٹھا لیا۔

کیبن خاصا کشادہ تھا۔ اندر دو کرسیاں پڑی تھیں۔ اور ایک کونے میں فرش پر چائے کا ایک

خالی کپ بھی رکھا ہوا تھا۔ کیبن میں داخل ہو کر نیلم نے رائفل، پولیس والے پر تان لی۔

''تمہارے سامنے کھڑی ہوئی یہ حسین عورت بڑی ظالم اور سنگدل ہے۔'' طارق نے پولیس والے کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم نے کوئی معمولی سی آواز بھی نکالی تو یہ حسینہ تمہاری کھوپڑی اُڑا دے گی۔''

نیلم نے آٹو میٹک رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ کلک کی ہلکی سی آواز پولیس والے کے دماغ پر وزنی ہتھوڑے کی ضرب سے کم نہیں تھی۔ اُس نے بے بس نگاہوں سے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کو اثبات میں حرکت دینے کی کوشش کی۔

''گڈ..... عقلمند ہو۔'' طارق نے یہ کہتے ہوئے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ ''اور اب جلدی سے اپنی یونیفارم اُتار دو!''

''کک..... کیا؟'' پولیس والا ہکلا کر رہ گیا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو!'' طارق کے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔

پولیس والے نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے وردی اُتارنا شروع کر دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی اُس کے جسم پر صرف ایک جانگیا اور بنیان نظر آ رہی تھی۔ طارق نے اُس کی یونیفارم اپنے لباس کے اُوپر ہی پہن لی۔ پھر پولیس والے کو باندھ کر کیبن میں ایک طرف ڈال دیا گیا۔

رائفل اب طارق نے لے لی تھی۔ اُس نے نیلم کو اشارہ کیا اور وہ دونوں کیبن سے نکل کر مکان کے برآمدے کی طرف چلنے لگے۔ برآمدے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ طارق نے دو تین مرتبہ دروازے کو ہولے سے کھٹکھٹایا۔ کچھ ہی دیر بعد اندر سے دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا وہی ڈرائیور تھا جو صبح سیٹھ سندر ملہوترہ کو ایئرپورٹ سے لے کر آیا تھا۔

''کیا بات ہے منوہر..... اور یہ کون ہے؟'' ڈرائیور نے طارق کی طرف دیکھا۔ پھر نیلم کی طرف دیکھنے لگا۔ طارق نے ٹوپی، پیشانی پر جھکا رکھی تھی جس کی وجہ سے ڈرائیور اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

''یہ لونڈیا کہیں سے بھٹکتی ہوئی آ گئی ہے۔ سیٹھ سے کہو.....''

''سیٹھ کی ایسی کی تیسی۔'' ڈرائیور بولا۔ ''ہم نامرد ہیں کیا؟ سیٹھ سو گیا ہے۔ اسے میرے کمرے میں لے چلو! لیکن یہ کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گی؟''

''ارے بالکل نہیں..... میں نے اسے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

ڈرائیور بھی نیلم کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک اُبھر آئی تھی۔ ''اسے

اندر لے چلو یا باہر ہی کھڑے رہو گے؟'' طارق بولا۔

''اوہ..... آؤ!'' ڈرائیور راستے سے ایک طرف ہٹ گیا۔

طارق نے نیلم کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا۔ نیلم خوف زدہ ہونے کی بڑی شاندار اداکاری کر رہی تھی۔ اُس کے فوراً ہی بعد طارق نے بھی اندر داخل ہو کر نیلم کو مزید آگے دھکیل دیا۔ ٹھیک اُسی لمحے باہر ہلکے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''یہ کون ہے.....؟'' ڈرائیور بولا۔

''اپنے ہی آدمی ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' طارق نے یہ کہتے ہوئے ڈرائیور پر رائفل تان لی۔ ''کوئی آواز تمہارے منہ سے نکلی تو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیئے جاؤ گے۔''

''تت..... تم کون ہو؟'' ڈرائیور ہکلایا۔ اُس کا چہرہ دُھواں ہو گیا تھا۔

''تمہارا باپ.....!'' طارق نے غراتے ہوئے کہا۔ ''خاموش کھڑے رہو!''

باہر قدموں کی آواز کے ساتھ خشک پتوں کے چرچرانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتے پیروں کے نیچے آ کر چرچرا رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ایک آدمی دالان میں داخل ہوا۔ وہ علی تھا..... اُس کے پیچھے ہی سعید بھی اندر داخل ہوا تھا۔

''گڈ.....!'' علی، طارق اور نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''سعید! یہاں سے کوئی رسّی تلاش کر کے اسے باندھ دو!'' طارق بولا۔

رسّی جلد ہی مل گئی۔ ڈرائیور کو باندھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ اُس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

''نیلم! تم یہیں رُکو۔ اور سعید! تم باہر جا کر گیراج سے سیٹھ کی گاڑی نکال کر برآمدے میں لے آؤ!'' طارق نے کہا اور علی کو اشارہ کرتا ہوا ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اُس وسیع و عریض کوٹھی میں کئی کمرے تھے۔ آخر کار سیٹھ سندر ملہوترہ ایک کمرے میں مل گیا۔ یہ بہت ہی شاندار بیڈ رُوم تھا۔ سیٹھ سندر ملہورہ کا چہرہ بڑا پُراسرار لگ رہا تھا۔ طارق نے تیز روشنی کا بلب جلا دیا اور سیٹھ کی طرف رائفل تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے علی کو اشارہ کیا۔ علی نے آگے بڑھ کر سیٹھ کے اُوپر سے لحاف کھینچ لیا۔ سیٹھ ملہوترہ ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں سکا۔ لیکن جب موت کے دو فرشتوں کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو اُس کی نیند غائب ہو گئی اور چہرے پر ایک دم مردنی سی چھا گئی۔

''کک..... کون ہو تم لوگ؟ اور..... اندر کیسے داخل ہوئے؟'' سیٹھ ہکلایا۔ خوف سے اُس

کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔

''موت کے فرشتوں کو اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' طارق غرایا۔

''تت..... تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ دولت لے لو..... میری ساری دولت لے لو! اور یہاں سے چلے جاؤ۔ تت..... تجوری وہ سامنے ہے۔ چابی..... چابی میں دیتا ہوں۔'' سیٹھ نے کانپتا ہوا ہاتھ تکیے کے نیچے ڈال دیا۔

طارق کی تیز نظروں نے تکیے کے نیچے پستول کا دستہ جھانکتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر رائفل کا بٹ پوری قوت سے سیٹھ کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ سیٹھ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''آرام سے بیٹھے رہو..... چابی میں خود لے لیتا ہوں۔'' طارق نے آگے بڑھ کر تکیے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ چابیوں کا گچھا بھی تکیے کے نیچے ہی تھا۔ ''یہ چابیاں اُٹھاؤ اور تجوری کھولو! اس مرتبہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو کھوپڑی توڑ دوں گا۔''

سیٹھ ملہوترہ پلنگ سے اُتر کر دیوار کے قریب ایستادہ قدِ آدم تجوری کے پاس چلا گیا۔ اُس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے بڑی مشکل سے تجوری کھولی تھی۔ طارق نے اُسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور تجوری میں جھانکنے لگا۔ تجوری میں کرنسی نوٹوں کی گڈیاں بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ دو خانوں میں زیورات کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ایک خانے میں کچھ بہی کھاتے اور فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ طارق نے بستر کی چادر اُتار کر تجوری کے سامنے فرش پر بچھا دی اور تجوری کی ایک ایک چیز نکال کر چادر میں ڈال دی۔ فائلیں اور بہی کھاتے بھی تجوری سے چادر پر منتقل ہو چکے تھے۔ تجوری سے برآمد ہونے والی رقم لاکھوں روپے تھی۔ اور زیورات بھی لاکھوں کی مالیت کے تھے۔ یہ وہ دولت تھی جو غریب کشمیریوں کا خون چوس کر جمع کی گئی تھی۔ طارق نے چادر کی گٹھڑی باندھ لی اور علی کو اشارہ کیا۔

''چلئے سیٹھ صاحب!'' علی نے سیٹھ کو دروازے کی طرف دھکا دیا۔

''کک..... کہاں؟'' سیٹھ ہکلایا۔ ''میری ساری دولت تو تم نے لے لی۔ مم..... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''تمہارا کریا کرم کرنے کے لئے۔'' علی بولا۔

''رحم کرو مجھ پر..... بھگوان کے لئے رحم کرو!'' سیٹھ گھگھیایا۔

''تم نے آج تک کسی پر رحم کیا ہے جو آج رحم کی بھیک مانگ رہے ہو؟ چلو..... آگے بڑھو!'' طارق نے اُسے ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

سیٹھ، ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ طارق نے اُسے ایک اور ٹھوکر ماری۔ وہ سیٹھ کو اسی طرح ٹھوکریں مارتے ہوئے ڈرائنگ رُوم میں لے آئے جہاں سیٹھ کا ڈرائیور بندھا پڑا تھا، اور نیلم اطمینان سے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

علی اور نیلم، سیٹھ سندر ملہوترہ کو لے کر باہر چلے گئے۔ طارق نے پولیس یونیفارم کے نیچے اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی اور ڈرائنگ رُوم میں دو تین جگہوں پر آگ لگا دی۔ صوفوں کے کشنز اور پردوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ طارق باہر کی طرف دوڑا۔ برآمدے میں گاڑی کھڑی تھی۔ سعید سٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ دوسری سیٹ پر علی تھا۔ پچھلی سیٹ پر سیٹھ کے ساتھ نیلم بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سیٹھ والا پستول تھا۔ طارق، سیٹھ کے دوسری طرف بیٹھ گیا اور گاڑی حرکت میں آ گئی۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر علی نے نیچے اُتر کر گیٹ کھول دیا۔ گاڑی کے باہر نکلتے ہی اُس نے گیٹ بند کر دیا اور دوڑتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ طارق نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، سیٹھ کے بنگلے سے شعلے اُٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

کار، تیز رفتاری سے مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اور پھر کار جیسے ہی ایک گلی سے نکل کر بند روڈ پر پہنچی، سامنے سے پولیس کی ایک موبائل وین آتی ہوئی دکھائی دی۔

''سامنے سے پولیس کی گاڑی آ رہی ہے۔'' سعید نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

''میری بات غور سے سنو سیٹھ! تم اس وقت کسی منسٹر سے ملنے جا رہے ہو۔ کسی بھی منسٹر کا نام لے لینا۔ ہم تمہارے محافظ ہیں۔ اور اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تم زندہ نہیں بچو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''سمجھ گیا مہاراج!'' سیٹھ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''چاندنی رات میں ذرا تفریح کو دل چاہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے پکنک منانے جا رہے ہیں۔ اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس لونڈیا کو دیکھ رہے ہو؟ یہ تمہارا دل خوش کر دے گی۔ بس! اب اپنی چونچ بند رکھو۔'' پولیس کی وین راستہ روک کر سڑک کے وسط میں رُک گئی ہے۔'' سعید نے کہتے ہوئے گاڑی کی رفتار مزید کم کر دی۔

پولیس کی وین سڑک کے وسط میں اس طرح رُک گئی تھی کہ تمام راستہ بلاک ہو کر رہ گیا تھا۔ چار پولیس والے وین سے کود کر سڑک پر آ گئے تھے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ اور ایک کانسٹیبل اُنہیں رُکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

گاڑی، وین سے چند گز کے فاصلے پر رُک گئی۔ مسلح پولیس والوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔ وین میں بیٹھا ہوا پولیس پارٹی کا انچارج اُتر کر ڈرائیونگ سائیڈ پر گاڑی کے قریب آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟ نیچے اُترو! تم لوگوں کی تلاشی لی جائے گی۔'' پولیس انسپکٹر نے سعید کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ سیٹھ سندر ملہوترہ کی گاڑی ہے انسپکٹر!'' سعید نے بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سیٹھ صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ ان سے بات کر لو!''

انسپکٹر نے پچھلی سیٹ پر جھانکا، اور پھر سیٹھ کی صورت دیکھتے ہی بولا۔ ''ارے سیٹھ صاحب! آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟''

''ارے بھئی! منسٹر صاحب نے بلایا ہے۔ کوئی اہم مسئلہ ہو گا۔ یہ میرے باڈی گارڈ ہیں۔ ان کی تلاشی کیوں مانگتے ہو.....؟'' سیٹھ نے کہا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں سیٹھ جی! لیکن یہ.....'' انسپکٹر نے نیلم کی طرف دیکھا، پھر ایک دم سیدھا ہو گیا۔ ''اوہ..... اُس طرف شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ شاید کہیں آگ لگی ہے۔ آپ جائیے سیٹھ جی! وکرم.....! وین میں بیٹھو..... ہری اَپ.....!''

تمام پولیس والے وین میں بیٹھ گئے۔ اور پھر انسپکٹر کے بیٹھتے ہی وین حرکت میں آ گئی۔ وین کے سڑک سے ہٹتے ہی سعید نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس نے گاڑی سڑک سے اُتار کر درختوں میں روک لی۔ اور وہ سب لوگ گاڑی سے اُتر کر سڑک پار کر کے دریا کے کنارے آ گئے۔ سیٹھ ملہوترہ کو اُن لوگوں نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ دریا خاصی گہرائی میں تھا۔ نیچے جانے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور سیڑھیوں کے اختتام پر پانی میں تین چار کشتیاں کھڑی تھیں۔ تمام کشتیاں رسیوں سے کنارے پر لگی ہوئی پائپ کی ریلنگ سے بندھی ہوئی تھیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر اس قسم کے چھوٹے چھوٹے لاتعداد گھاٹ تھے۔ شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک آمد و رفت کے لئے اگرچہ دریا پر سات پُل بنے ہوئے تھے۔ لیکن اکثر لوگ ان جگہوں سے بھی کشتیوں کے ذریعے دریا پار کرتے تھے۔ وہ لوگ پانی کے قریب آخری سیڑھی پر آ کر رُک گئے۔ یہاں گہری تاریکی تھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ علی دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ تاریکی میں قریب کھڑی ہوئی کشتیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی نے دو تین مرتبہ منہ سے بلی کی آواز نکالی۔ اُس کے خاموش ہوتے ہی دائیں طرف سے بھی بلی کی آواز سنائی دی۔

''آؤ..... وہ لوگ اُدھر ہیں۔'' علی کہتے ہوئے دائیں طرف چلنے لگا۔

عمودی ڈھلان پر پانی کی سطح سے تقریباً ایک فٹ اُوپر کنکریٹ کا دو تین فٹ چوڑا پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ قطار میں اُس پلیٹ فارم پر چلنے لگے۔ سیٹھ ملہوترہ کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سعید نے اُس کی پشت سے رائفل کی نال لگا رکھی تھی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے چل رہا تھا۔

تقریباً بیس گز آگے حاجی عثمان اور ہاشم کھڑے تھے۔ اُن کے قریب ہی پانی میں ایک کشتی بھی موجود تھی۔ وہ لوگ کشتی میں بیٹھ گئے۔ حاجی عثمان اور ہاشم نے چپو سنبھال لئے۔ کشتی آہستہ آہستہ کنارے سے دُور ہٹنے لگی۔ ہاشم اور حاجی عثمان اگرچہ بڑی احتیاط سے چپو چلا رہے تھے۔ لیکن سناٹے میں شڑاپ شڑاپ کی آواز دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔

تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کشتی دوسرے کنارے پر آ گئی۔ جس جگہ کشتی رُکی، وہاں بھی ایسا ہی ایک چھوٹا سا گھاٹ تھا۔ اور اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر آ گئے۔ سڑک عبور کرتے ہی وہ لوگ کشادہ گلی میں گھس گئے۔ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد وہ ایک ٹیلے پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد کے سامنے پہنچ گئے۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی درگاہ تھی جس کے گنبد پر سبز رنگ کے جھنڈے لگے ہوئے تھے، اور ایک بلب بھی جل رہا تھا۔ وہ لوگ درگاہ میں داخل ہو کر ایک تنگ سے حجرے میں گھس گئے۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ہاشم نے دری کا ایک کونا اُٹھا دیا اور پھر علی کی مدد سے فرش پر تین مربع فٹ کی سیمنٹ کی ایک سل اُٹھا دی۔ نیچے تہہ خانے میں جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے سیڑھیوں پر اُترتے گئے۔ آخر میں ایک آدمی رہ گیا تھا۔ وہ اُس درگاہ کا مجاور تھا۔ اُس نے سیمنٹ کی سل کو اُس کی جگہ پر رکھ کر برابر کر دیا اور حجرے سے نکل آیا۔

سیڑھیوں کا اختتام ایک چھوٹے سے کمرے پر ہوا۔ اُس سے آگے ایک اور بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا جس میں تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور ایک دیوار سے ٹیک لگائے رحمان بابا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ اُسی کمرے میں ایک طرف لکڑی کی پیٹیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اُن پیٹیوں میں دستی بم، آٹو میٹک رائفلیں، میگزین اور مختلف قسم کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

علی نے نیلم کے ہاتھ سے گٹھڑی لے کر رحمان بابا کے قریب رکھ دی اور سیٹھ سندر ملہوترہ کو دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا ہوا رحمان بابا کے سامنے گر گیا۔ سندر ملہوترہ نے ابھی تک رحمان بابا کو نہیں دیکھا تھا۔ اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے رحمان بابا کی طرف دیکھا۔ رحمان بابا کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اُس کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھیلتی چلی گئیں.....

''ر..... رحما..... ن..... بابا.....؟'' سیٹھ سندر ملہوترہ کے منہ سے نکلا، اور وہ جھومتا ہوا ایک بار پھر ڈھیر ہو گیا۔

☆

ہوش میں آنے کے بعد سیٹھ ملہوترہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رحمان بابا کے چہرے پر اُسے اپنی موت کا پیغام لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور اسی لئے وہ رحمان بابا سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحمان بابا کے سامنے وہ گٹھڑی کھلی پڑی تھی جس میں لاکھوں کی نقدی اور زیورات کے علاوہ سیٹھ سندر ملہوترہ کے بہی کھاتے اور کچھ فائلیں بھی تھیں۔ بہی کھاتوں میں سیٹھ ملہوترہ کے کاروبار کا حساب اور اُن لوگوں کے نام و پتے تھے جو سیٹھ کے مقروض تھے۔ وہ سب نام کشمیری مسلمانوں کے تھے، جو سود در سود اُس کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ فائلوں میں کاروباری نوعیت کے خطوط تھے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص چیز نہیں ملی تھی۔

''طارق.....!'' رحمان بابا نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس بنئے سے معلوم کرو! کہ حکومت ہند نے اسے جو منصوبہ دیا ہے، اُس میں کون کون لوگ شامل ہیں؟''

''سنا ہے تم نے.....؟'' طارق نے سیٹھ ملہوترہ کو گھورا۔ ''میں پانچ تک گنوں گا۔ اگر تم نے زبان نہ کھولی تو.....''

''مم..... میں کچھ نہیں جانتا مہاراج!'' سیٹھ ملہوترہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ''میں کسی منصوبے کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں تو اپنی پتنی اور بچوں کو چھوڑنے کے لئے دِلّی گیا ہوا تھا۔''

''دیکھو سیٹھ.....!'' طارق بولا۔ ''ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ دہلی میں تمہارے کن کن لوگوں سے رابطے ہیں؟ یہ بھی ہمارے علم میں ہے۔ تمہیں کشمیری مسلمانوں کے خلاف وہ منصوبہ کس نے بھیجا تھا، یہ بھی ہم جانتے ہیں۔ ہم صرف وہ نام جاننا چاہتے ہیں جو اس منصوبے میں شامل ہیں۔ ہمارے بارے میں تم تھوڑا بہت اندازہ تو لگا ہی چکے ہو۔ تمہیں تمہارے بنگلے سے اُٹھانے کے بعد ہم نے اُس بنگلے کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اُس سے ابھی تک شعلے اُٹھ رہے ہوں گے۔ اگر تم نے میری باتوں کا جواب نہ دیا تو تمہیں بھی زندہ جلا دیا جائے گا۔''

''مم..... میں سچ کہتا ہوں..... میں کچھ نہیں جانتا۔'' سیٹھ ملہوترہ ہکلایا۔

طارق نے اُس کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ سیٹھ کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ اُس کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلانے لگا۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا.....'' طارق بولا۔ ''علی.....! پلاس لے کر آؤ! پہلے اس کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اُکھاڑوں گا، پھر اس کی کھال کھینچوں گا۔''

علی نے لکڑی کی پیٹیوں کے قریب پڑا ہوا پلاس اُٹھا کر طارق کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ٹھہرو..... بتاتا ہوں۔'' سیٹھ ملہوترہ چیخا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ اور پھر رُک رُک کر اُن لوگوں کے نام بتانے لگا جو اس منصوبے میں شامل تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ وہ لوگ سادہ لوح کشمیریوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے اور اُن کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی مہم چلائیں گے۔ معصوم کشمیریوں کے دلوں میں یہ بات بٹھانی تھی کہ پاکستان اور کشمیری مجاہدین اُن کے ہمدرد نہیں ہیں۔ اُن پر یہ مصیبتیں مجاہدین اور پاکستان کی وجہ سے ہی نازل ہو رہی ہیں۔ اگر وہ ان کی حمایت ترک کر دیں تو انہیں ان مصائب سے نجات مل سکتی ہے۔ سیٹھ ملہوترہ نے جن لوگوں کے نام بتائے تھے، اُن میں چند نام نہاد سیاستدان بھی شامل تھے۔

''اور دوسرا منصوبہ کیا ہے.....؟'' طارق نے پوچھا۔

''دوسرا منصوبہ.....؟'' سیٹھ ملہوترہ نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''میں کسی اور منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''میں دہشت گردی اور تخریب کاری والے منصوبے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' طارق نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے زبان نہ کھولی تو پلاس اب بھی میرے ہاتھ میں موجود ہے۔''

''نن.....نہیں.....نہیں..... وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' سیٹھ ملہوترہ تھر تھر کانپنے لگا۔

''زندہ تو تمہیں ہم بھی نہیں چھوڑیں گے۔'' طارق، پلاس کو حرکت دیتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔ علی اور ہاشم نے لپک کر سیٹھ کو دبوچ لیا۔ طارق نے سیٹھ کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن پلاس میں کس لیا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ سیٹھ ملہوترہ کی چیخیں تہ خانے میں گونج رہی تھیں۔ مگر طارق نے ہاتھ نہیں روکا۔ اُس کے چہرے پر درندگی تھی۔ اُس وقت موسیٰ کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی جسے وہ سوپور کے کیمپ سے چھڑا کر لایا تھا۔ اُس کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن بھی اسی طرح اُکھاڑے گئے تھے۔ اُس نے چند اور جھٹکے دیئے۔ سیٹھ ملہوترہ کا ناخن جڑ سے اُکھڑ گیا اور انگوٹھے سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ سیٹھ ملہوترہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ چند منٹ بعد اُسے ہوش میں لایا گیا۔

''ہمارے نوجوانوں کو تمہارے بہادر سینک اس سے بھی زیادہ خوف ناک اذیتیں دیتے ہیں۔'' طارق، سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔ ''ابھی تمہارا صرف ایک ناخن اُکھڑا ہے۔ اگر تم نے زبان نہ کھولی تو ہاتھوں پیروں کی ساری اُنگلیوں کے ناخن اسی طرح اُدھیڑے جائیں گے۔''

''ب..... بتاتا ہوں۔'' سیٹھ ملہوترہ ہکلایا۔ اور پھر چند لمحوں کے بعد اُس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

''ہاشم.....!'' سیٹھ کے خاموش ہونے پر رحمان نے کہا۔ ''صبح ہونے سے پہلے پہلے اس کے جسم کے ساتھ وزنی پتھر باندھ کر اسے دریا میں پھینک دو۔''

''نہیں.....!'' سیٹھ چیخا۔ ''مجھ پر رحم کیجئے مہاراج.....!''

ہاشم نے آگے بڑھ کر اُسے دبوچ لیا۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے..... اور پھر رات کے آخری پہر اُس کے ساتھ ایک بھاری پتھر باندھ کر اُسے دریا میں پھینک دیا گیا.....

☆

سیٹھ سندر ملہوترہ سے حاصل ہونے والی معلومات غلط نہیں تھیں۔ بعض دیگر ذرائع سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ عنقریب دو سو ایسے بھارتی ایجنٹ، وادی کشمیر میں داخل ہونے والے تھے جنہیں اسرائیلی انٹیلی جنس موساد اور بھارتی انٹیلی جنس را، نے دہشت گردی اور تخریب کاری کی خصوصی تربیت دی تھی۔ اُن بھارتی ایجنٹوں میں مردوں کے علاوہ خوب صورت دوشیزائیں بھی تھیں۔ منصوبے کے مطابق یہ تربیت یافتہ ایجنٹ پہلے سرینگر پہنچتے اور وہاں سے سیاحوں کے بھیس میں نہ صرف بھارت کے زیر تسلط بلکہ آزاد کشمیر میں بھی پھیل جاتے اور کشمیری عوام کو مجاہدین اور پاکستان کے خلاف بھڑکا کر اُنہیں اُن کی حمایت سے محروم کرنے کی کوشش کرتے۔ اطلاعات کے مطابق یہ تربیت یافتہ ایجنٹ ایک دو روز بعد پچاس پچاس کی ٹولیوں میں سرینگر پہنچنے والے تھے۔

ان اطلاعات کی تصدیق ہوتے ہی رحمان بابا نے وادی میں بکھرے ہوئے تمام مجاہدین کو الرٹ کر دیا۔ اور کچھ ایسے مجاہدین کو سرینگر طلب کر لیا جن کا شمار مجاہدین کے کفن پوش دستوں میں ہوتا تھا۔ سرینگر میں موجود تمام مجاہدین کو شہر کے مختلف علاقوں میں پھیلا دیا گیا۔ ایئر پورٹ، ڈل جھیل اور اُن ہوٹلوں اور عمارتوں کی بھی نگرانی شروع کر دی گئی، جہاں سیاحوں کے بھیس میں آنے والے بھارتی ایجنٹوں کے ٹھہرائے جانے کا امکان تھا۔

مشی اگرچہ بہت عرصہ پہلے ڈل جھیل میں اپنی ہاؤس بوٹ چھوڑ چکی تھی۔ لیکن رحمان بابا کی ہدایت پر وہ ایک بار پھر اپنی ہاؤس بوٹ پر آ گئی۔ نیلم بھی اُس کے ساتھ تھی۔ باہر سے آنے والے سیاح عام طور پر ہاؤس بوٹوں ہی میں قیام کرتے تھے اس لئے نیلم اور مشی اپنی ہاؤس بوٹ میں رہ کر اُن کی نگرانی کر سکتی تھیں۔ پانچ دیگر مجاہدین کو ڈل جھیل میں مختلف ہاؤس بوٹوں پر مختلف حیثیتوں سے تعینات کر دیا گیا۔

اُس روز مشی اور نیلم اپنی ہاؤس بوٹ کی صفائی کر رہی تھیں۔ یہ ہاؤس بوٹ کسی مکان ہی کی طرح تھی اور اُس میں پانچ کمرے تھے۔ ایک کشادہ کامن رُوم اور چار چھوٹے کمرے جنہیں بیڈ رُومز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پچھلی طرف کچن اور باتھ رُوم بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ اور تھا، جسے سرونٹ رُوم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مشی کا شوہر جب زندہ تھا تو وہ خود اُس کمرے میں رہتا تھا۔ یہ ہاؤس بوٹ ایک بڑی فیملی کے لئے بے حد مناسب تھی۔ الگ الگ لوگوں کو بھی کمرے کرائے پر دے دیئے جاتے تھے۔

نیلم اور مشی رات بھر ہاؤس بوٹ کی صفائی ستھرائی میں لگی رہیں۔ اُن کے ساتھ عمر نامی ایک نوجوان بھی تھا۔ عمر کا تعلق بھی لبریشن فرنٹ سے ہی تھا۔ وہ مشی کی ہاؤس بوٹ سے چوتھے نمبر کی ہاؤس بوٹ پر تھا اور اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے آ گیا تھا۔

صبح صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر مشی نے رنگین ٹیلی ویژن اور وی سی آر بھی لا کر بوٹ کے کامن رُوم میں رکھ دیا۔ ڈل جھیل میں صرف چند ہاؤس بوٹس ایسی تھیں جن میں ٹی وی اور وی سی آر موجود تھے۔ غریب کشمیری ایسی تعیش پسندی کے متحمل تو نہیں تھے، لیکن اُنہیں سیاحوں کو اپنی ہاؤس بوٹ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا سامان کرنا پڑتا تھا۔ مشی نے ضرورت اور آرائش کی چند اور چیزیں بھی لا کر ہاؤس بوٹ میں رکھ دی تھیں۔

شام پانچ بجے مشی، نیلم اور عمر ہاؤس بوٹ کے چھوٹے سے عرشے پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے کہ دو پولیس والے اُنہیں اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے..... اُن دونوں کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں نوٹ بک اور پنسل تھی۔ اُن کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی خطرناک ارادے سے نہیں آئے تھے۔ اگر تلاشی وغیرہ لینے کے لئے آتے تو رائفلیں کندھوں کی بجائے ہاتھوں میں ہوتیں۔ مشی وغیرہ قہوے کے گھونٹ لیتے ہوئے خاموشی سے اُن کی طرف دیکھتے رہے۔ دونوں پولیس والے ہاؤس بوٹ اور جھیل کے کنارے کے درمیان پُل کی طرح لگے ہوئے تختوں پر چل کر بوٹ پر آ گئے۔

''ارے مشی..... تم؟'' ایک پولیس والے نے مشی کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے حیرت

سے کہا۔ ''سنا تھا کہ تم اپنے پتی کی موت کے بعد سرینگر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔''

''جانا کہاں تھا حوالدار جی.....؟'' مشی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''لوگوں کے گھروں میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پال رہی تھی۔ گاؤں سے یہ میری بہن آ گئی تو اس نے مشورہ دیا کہ ہاؤس بوٹ کو چالو کیا جائے۔ سیزن شروع ہو رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی مہمان تو آتا ہی رہے گا۔''

''تمہاری یہ بہن خوب صورت ہونے کے ساتھ عقلمند بھی ہے۔'' پولیس والے نے مسکراتے ہوئے نیلم کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگوں نے ہاؤس بوٹس چالو کرنے کا فیصلہ بالکل ٹھیک وقت پر کیا ہے۔ کل صبح سیاحوں کی ایک بہت بڑی پارٹی سرینگر آ رہی ہے۔ وہ لوگ چند روز سرینگر میں رہیں گے، پھر وادی کی سیر کے لئے چلے جائیں گے۔ اُن کی رہائش کا بندوبست کرنے کے لئے ہمیں حکم دیا گیا ہے۔''

''کیا وہ سرکاری مہمان ہیں حوالدار جی.....؟'' مشی نے پوچھا۔

''نہیں..... دہلی میں کوئی بہت بڑا آفیسر ہے۔ اُس کی بیٹی بھی ساتھ آ رہی ہے۔ اس لئے یہ خدمت ہمارے سپرد کی گئی ہے۔'' حوالدار نے کہا۔ اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''چلو..... ذرا تمہاری یہ ہاؤس بوٹ تو دیکھیں۔ اس میں کتنے افراد سما سکتے ہیں؟''

''دل بڑا ہونا چاہئے حوالدار جی! پندرہ بیس تو آ ہی جائیں گے۔'' مشی کہتے ہوئے دونوں پولیس والوں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ نیلم اور عمر اپنی جگہوں پر بیٹھے قہوہ پیتے رہے۔ چند منٹ بعد مشی اور پولیس والے واپس آ گئے۔

''نہیں مشی!'' وہی پولیس والا بولا۔ ''پندرہ بیس نہیں، تمہاری ہاؤس بوٹ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ افراد کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ چار کمرے ہیں نا؟ ایک کمرے میں دو افراد کافی ہیں۔ بڑے گھروں کے لوگ ہیں۔ ایک کمرے میں دو افراد ٹھیک رہیں گے۔'' پولیس والے نے نوٹ بک میں مشی کی ہاؤس بوٹ کا نام اور رجسٹریشن نمبر وغیرہ لکھ لیا۔ ''یہ لو! چھ ہزار روپے۔ اس رقم میں تمہاری ہاؤس بوٹ کا تین دن کا کرایہ اور مہمانوں کے کھانے کے اخراجات شامل ہیں۔ اُنہیں کھانا ڈھنگ کا ملنا چاہئے۔ لو! یہاں دستخط کر دو۔''

مشی کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ تین دن کے لئے اتنی بڑی رقم آج تک نہیں ملی تھی۔ اُس نے نوٹ لے کر گنے، پھر نوٹ بک پر دستخط کرنے لگی۔ لیکن اُس نے ہاتھ روک لیا۔ ''حوالدار جی! یہاں تو سولہ ہزار روپے لکھے ہوئے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''ہمیں بھی تو کچھ ملنا چاہئے نا۔'' پولیس والا مسکرایا۔ ''چھ ہزار تو تمہارے پتی نے پوری

زندگی میں نہیں کمائے ہوں گے۔ مہمانوں کے کھانے پر بھی تمہیں زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں، وہ لوگ صبح چائے پی کر نکل جایا کریں گے۔ اور رات کو کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر ہی واپس آیا کریں گے۔''

''شہر کے حالات تم دیکھ رہے ہو، کوئی چیز تو ملتی نہیں۔ لوگ ہر چیز کے منہ مانگے دام مانگتے ہیں۔ اچھا! یوں کرو، مجھے تین ہزار اور دے دو۔'' مشی نے کہا۔

بڑی لے دے کے بعد پولیس والے نے اُسے ڈیڑھ ہزار روپے مزید دے دیئے۔ جب وہ چلنے لگے تو عمر اُن کے راستے میں آ گیا۔ ''حوالدار جی! میری ہاؤس بوٹ دیکھ لو! ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ جھیل کی رانی ہے۔ آپ کے مہمان خوش ہو جائیں گے۔'' اُس نے منت سماجت والے لہجے میں کہا۔

''چلو! تمہاری ہاؤس بوٹ بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' پولیس والے، عمر کے ساتھ چلے گئے۔

اُسی رات رحمان بابا کو اطلاع مل گئی کہ کل صبح جہاز سے پچاس تخریب کار، سیاحوں کے رُوپ میں سرینگر پہنچ رہے ہیں۔ اور اُن کی رہائش کے لئے ڈل جھیل کی ہاؤس بوٹس بُک کروالی گئی تھیں۔ اُن تمام بوٹس پر مجاہدین مختلف حیثیتوں سے موجود تھے۔

مشی نے اُسی شام مہمانوں کے لئے راشن وغیرہ کا انتظام بھی کرلیا۔ دوسرے دن گیارہ بجے ایک بس، ڈل جھیل کے کنارے پر آ کر رُکی۔ اُس بس میں وہی سیاح تھے، جن کے لئے ایک روز پہلے ہی ہاؤس بوٹس کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اُن سیاحوں کو مختلف ہاؤس بوٹس میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشی کے حصے میں جو آٹھ سیاح آئے تھے، اُن میں سات لڑکیاں اور ایک مرد تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اُن لوگوں کا تعلق ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے تھا۔ لڑکیوں میں سے کسی کی عمر بھی چوبیس سے زیادہ نہیں تھی اور وہ واقعی بے حد حسین تھیں۔ اُن کے ساتھی مرد کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اُن میں سے ایک لڑکی کا شوہر تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ نشاط باغ اور شالیمار وغیرہ کی سیر کو چلے گئے۔ اُن سب کو وارننگ دے دی گئی تھی کہ وہ لوگ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے واپس آ جائیں۔ وہ لوگ مختلف ٹولیوں میں گئے تھے۔ اور واپس بھی ٹولیوں کی صورت ہی میں آئے تھے۔ اُن میں مجموعی طور پر اٹھارہ سیاح کم تھے۔ اُن کے ساتھیوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں رہ گئے تھے؟ لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اُن کی تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گم ہونے والے سیاحوں میں چار مشی کی ہاؤس بوٹ کے مہمان بھی شامل تھے۔ اُن میں دونوں میاں بیوی بھی تھے اور دو لڑکیاں بھی۔

رات دس بجے پولیس والے ہاؤس بوٹس پر انکوائری کرتے پھر رہے تھے۔ مشی اور نیلم سے

بھی اُن کے بارے میں پوچھا گیا۔ لیکن ظاہر ہے، وہ اُن کے بارے میں کیا بتا سکتی تھیں؟ پولیس نے گمشدہ سیاحوں کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اُنہیں تلاش کر لینا آسان کام نہیں تھا۔

دوسرے دن اُن اٹھارہ سیاحوں کی لاشیں سرینگر شہر سے دو میل دُور دریائے جہلم میں ملیں..... اُن سب کو گولی مار کر ہلاک کرنے کے بعد دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ اُن کی لاشیں دریافت ہوتے ہی ہاؤس بوٹس میں مقیم سیاحوں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس اور فوج حرکت میں آ گئی۔ پولیس اور فوج کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ مجاہدین کا کام تھا۔ نامعلوم مجاہدین کی تلاش میں پولیس نے بعض گھروں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ جس کے نتیجے میں شہر میں کئی مقامات پر مجاہدین اور فوج و پولیس میں جھڑپیں بھی ہوئیں۔

ڈل جھیل میں ہاؤس بوٹس پر مقیم سیاحوں کو اُسی روز شہر کے مختلف مقامات پر منتقل کر دیا گیا۔

وہ رات سرینگر پولیس اور فوج کے لئے قیامت بن گئی۔ شہر کا وہ علاقہ، جہاں سرکاری بنگلے تھے، وزیروں کی کوٹھیاں اور سرکاری دفاتر تھے، رات بھر خوف ناک دھماکوں سے گونجتا رہا۔ یہ دھماکے اُن کوٹھیوں پر ہوئے تھے، جہاں اُن سیاحوں کو رکھا گیا تھا۔ پولیس اور فوجی رات بھر اِدھر سے اُدھر دوڑتے رہے۔ مجاہدین اور پولیس میں آنکھ مچولی رات بھر جاری رہی۔

اُن سیاحوں میں سے صرف چھ افراد زندہ بچ سکے تھے۔ جنہیں حفاظت کے خیال سے فوج کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا.....

یہ ہنگامے کئی روز جاری رہے۔ کئی گھر جلے، کئی ماؤں کی گود اُجڑی، کئی سہاگنوں کے سہاگ لٹے اور کئی معصوم عورتیں بھارتی درندوں کے ہاتھوں اپنی عزت و آبرو سے محروم ہو گئیں۔ لیکن بھارتی سازش کا پہلا مرحلہ ناکام ہو گیا۔ اُس کے تربیت یافتہ چوالیس افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے تھے۔ جو تربیت یافتہ دہشت گرد اور تخریب کار، وادی میں آگ اور خون کا کھیل کھیلنے آئے تھے، وہ خود مجاہدین کے ہاتھوں مٹ گئے تھے.....

☆

مجاہدین نے اُن لوگوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، جن کے نام اُنہیں سندر ملہوترہ سے معلوم ہوئے تھے۔ یہ وہ غدار تھے جنہوں نے چند ٹکوں کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کر لیا تھا۔ اپنی آزادی بیچ ڈالی تھی۔ لیکن اُنہیں اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

لیکن مجاہدین جانتے تھے کہ ان چند لوگوں کو ختم کر دینے سے ہندو سامراج کی سازشیں ختم نہیں ہو جائیں گی۔ ہندو، چین سے بیٹھنے والا نہیں۔ جس طرح فلسطین میں اسرائیلی ہشت پا، پیر پھیلا رہا تھا، اُسی طرح ہندو، کشمیر میں پھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب کشمیری حریت پرست،

ہندوؤں کے ناپاک ارادوں کے سامنے آہنی دیوار بن گئے تھے۔

وادی میں مجاہدین اور فوج میں جھڑپیں جاری تھیں۔ تقریباً ایک ہفتے بعد رحمان بابا کو اطلاع ملی کہ را کے تربیت یافتہ دہشت گردوں کی ایک اور پارٹی سرینگر پہنچنے والی ہے۔ یہ اطلاع جموں سے ملی تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ بھارتی تخریب کار اور دہشت گرد دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں جموں میں جمع ہو رہے ہیں۔ جہاں سے وہ اسی طرح مختلف ٹولیوں میں مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچیں گے اور سرینگر کلب میں جمع ہوں گے۔ جہاں سے بریفنگ کے بعد انہیں مختلف راستوں سے آزاد کشمیر کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ جہاں وہ دہشت گردی اور تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں گے۔

مجاہدین ایک بار پھر سرینگر میں جمع ہونے لگے۔ سرینگر کلب ہندو دولت مندوں، وزیروں، پولیس اور فوج کے افسروں کی عیاشی کا بہت بڑا اڈہ تھا۔ یہاں ہر رات معصوم کشمیری عورتوں کو اُٹھا کر لایا جاتا۔ اُن کی چیخیں کلب کے کمروں کی دیواروں میں گھٹ کر رہ جاتیں۔

مجاہدین بھیس بدل بدل کر سرینگر کلب کی نگرانی کر رہے تھے۔ کوئی ملازم کے رُوپ میں تھا، کوئی ڈرائیور کے رُوپ میں اور کوئی بھکاری کے رُوپ میں کلب کی عمارت کے قریب ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ رحمان بابا کو سرینگر کلب کے بارے میں ساری اطلاعات مل رہی تھیں۔

تیسرے دن شام سے پہلے ساٹھ بھارتی دہشت گرد سرینگر کلب میں جمع ہو چکے تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے اور خوب صورت لڑکیاں بھی۔ تیسرے دن شام ہی کو رحمان بابا کو یہ اطلاع بھی ملی کہ بعض ایسے لوگ بھی سرینگر کلب میں داخل ہوئے ہیں جن کا تعلق وادی کشمیر کی سیاست سے ہے۔ وادی کشمیر کے یہ چھوٹے چھوٹے نام نہاد سیاسی لیڈر کبھی سرینگر کلب جیسی جگہ پر آنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن آج وہ بڑے پراسرار طریقے سے کلب میں داخل ہوتے دیکھے گئے تھے۔

کلب کی حفاظت کے لئے پولیس گارڈز موجود تھے۔ چار مسلح پولیس کانسٹیبل آگے والے گیٹ پر تھے اور چار پچھلے گیٹ پر۔ وہ کلب کے اندر آنے جانے والوں کے علاوہ سڑک پر سے گزرنے والوں پر بھی کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھکاری جو شام تک کلب کے قریب نظر آیا تھا، اب کہیں غائب ہو چکا تھا۔

اُس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کلب میں ایک ہنگامہ جاری تھا۔ مرکزی ہال میں دو ہندو رقاصائیں نیم عریاں لباس میں اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھیں۔

کلب کے اندر رقص و سرور کے ہنگامے جاری تھے۔ اور باہر ایک اور ڈرامہ ہو رہا تھا.....

پولیس کی ایک موبائل وین، کلب کے مرکزی گیٹ پر آ کر رُکی۔ اُس میں چھ پولیس والے سوار تھے۔ جو وین رُکتے ہی نیچے کود گئے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ موبائل وین کا انچارج گیٹ پر متعین سپاہیوں کے پاس پہنچ گیا۔ ''تم لوگ ہیڈ کوارٹر جاؤ! یہاں اب صبح تک یہ لوگ ڈیوٹی دیں گے۔'' انچارج نے کہا۔

''لیکن سر.....'' پہلے سے ڈیوٹی پر متعین ایک کانسٹیبل نے کچھ کہنا چاہا، لیکن موبائل وین کے انچارج نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم لوگوں سے جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو!'' انچارج غرایا۔

''بنارسی.....!'' گیٹ پر کھڑے ہوئے ایک کانسٹیبل نے اپنے ساتھی کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''وائیں طرف آخر میں جو کانسٹیبل کھڑا ہے، وہ رحمان بابا کا ساتھی ہے۔''

''کیا بکتے ہو.....؟'' بنارسی بولا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں..... جس رات یہ لوگ رحمان بابا کو سٹریچر پر ڈال کر پُل عبور کر رہے تھے، اُس روز میں بھی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اس شخص کا چہرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کا تعلق پولیس کے محکمے سے نہیں ہے۔ یہ لوگ کشمیری دہشت گرد ہیں۔ اور ان کے ارادے خطرناک نظر آ رہے ہیں۔'' پہلے کانسٹیبل نے کہا۔

بنارسی دو قدم آگے بڑھ گیا اور موبائل وین کے انچارج سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیا آپ اپنی شناخت کرائیں گے سر.....؟''

''کیا بکتے ہو..... تمہاری یہ جرات؟'' انچارج غرایا۔ ''گرفتار کر لو انہیں!'' اُس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

بنارسی اور اُس کے ساتھی ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ ''یہ کشمیری دہشت گرد ہیں..... فائر!'' بنارسی چیخا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ساتھیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ موبائل وین پر آنے والے مجاہدین تھے۔ اور اُس پارٹی کا انچارج طارق تھا..... گیٹ پر متعین پولیس والوں کی فائرنگ سے سعید کا جسم چھلنی ہو گیا۔ لیکن اُسی وقت طارق اور اُس کے ساتھیوں نے بھی فائر کھول دیا۔ گیٹ پر متعین پولیس والوں میں سے تین مارے گئے۔ لیکن چوتھا چیختا ہوا کلب کی عمارت میں گھس گیا۔

کلب کے پچھلے گیٹ پر بھی فائرنگ شروع ہو چکی تھی..... چند ہی منٹ میں سرینگر کلب میدانِ کارزار بن گیا..... اب کلب کے اندر سے بھی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ کلب میں اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ مجاہدین پر ہلکی مشین گنوں سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مجاہدین کی ایک اور پارٹی وہاں پہنچ گئی۔ اُس پارٹی کے ساتھ رحمان بابا بھی موجود تھا۔ وہ جوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کر ہدایات جاری کرتے ہوئے دشمن پر فائرنگ بھی کر رہا تھا۔ اسی دوران کسی نے کلب کی عمارت کو آگ لگا دی..... آگ دو سمتوں سے لگائی گئی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے شعلے بڑے تیزی سے پھیلنے لگے..... لوگ چیختے ہوئے کلب کی عمارت سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن جو بھی باہر آتا، مجاہدین اُسے گولیوں سے بھون دیتے۔

کلب کی عمارت پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ اندر سے فائرنگ کے علاوہ چیخم دھاڑ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک پہلو کے ایک دروازے سے تین چار آدمی باہر نکلے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے آپ کو کشمیری عوام کے لیڈر گردانتے تھے۔ لیکن یہ نام نہاد لیڈر، ہندوؤں کے ہاتھوں اپنے ضمیر کا سودا کر چکے تھے۔ اور کشمیری عوام کے خلاف سازش میں حصہ لینے کے لئے یہاں جمع ہوئے تھے۔

طارق اور رحمان بابا اُسی طرف تھے۔ رحمان بابا ایک درخت کی آڑ میں کھڑا تھا۔ اُن غداروں کو دیکھ کر اُس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ للکارتا ہوا درخت کی آڑ سے نکل کر اُن کی طرف دوڑا..... اُس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سب مشین گن، گولیاں اُگل رہی تھی۔ لیکن اچانک مشین گن کا میگزین خالی ہو گیا۔ رحمان بابا کا جوش کم نہیں ہوا۔ وہ للکارتا ہوا آگے بڑھتا رہا.....

کلب کی عمارت سے نکلنے والے نام نہاد ضمیر فروش اُن کشمیری لیڈروں کے ہاتھوں میں بھی سب مشین گنیں تھیں۔ اُنہوں نے رحمان بابا پر فائر کھول دیا..... رحمان بابا کا جسم چھلنی ہو گیا اور وہ چند قدم آگے جا کر ڈھیر ہو گیا..... وہ مجاہد جو تقریباً نصف صدی تک اپنے وطن کی آزادی کے لئے دشمن سے نبرد آزما رہا تھا، جو دشمن کے لئے ہوّا بن گیا تھا، جس کا نام سن کر ہندوؤں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، آج اپنوں ہی کے ہاتھوں خاک و خون میں لوٹ گیا تھا۔ اُس کی سفید داڑھی خون میں تر ہو رہی تھی۔

طارق، رحمان بابا کو گرتے دیکھ کر چیختا ہوا اُس کی طرف دوڑا۔ وہ رحمان بابا سے ابھی دو قدم دُور تھا کہ ضمیر فروش کشمیری لیڈروں کی گولیوں نے اُس کا جسم بھی چھلنی کر دیا..... اور وہ بھی چیختا ہوا رحمان بابا کے اُوپر ڈھیر ہو گیا.....

دو کشمیری مجاہدین اُس طرف پہنچ گئے..... اُنہوں نے اس شدت سے فائرنگ کی کہ وطن فروش کشمیری لیڈر دوبارہ عمارت میں گھس گئے۔ کلب کی عمارت اب پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ باہر سے کشمیری مجاہدین بھی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔

فوج اور پولیس کے ہیڈ کوارٹرز کو سرینگر کلب پر مجاہدین کے حملے کی اطلاع مل گئی تھی۔ یہ اطلاع ملتے ہی پولیس اور فوج کی گاڑیاں کلب کی طرف دوڑ پڑیں۔ کلب کو دُور دُور سے گھیرے میں لے لیا گیا۔ لیکن کسی مجاہد نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بڑی دلیری سے پولیس اور فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کرتے رہے..... اور آخر کار وہ سب وطن کی آن پر قربان ہو گئے.....

کشمیر میں تحریک آزادی کا ایک باب ختم ہو گیا۔ اس باب کا حرفِ آخر اُن مجاہدین نے اپنے خون سے لکھا تھا، جو اپنے وطن کو دشمن کے قدموں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ دشمن تو اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا، لیکن اپنوں نے اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار کر دشمن کے لئے راہ ہموار کر دی تھی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں کو ہزیمت اُٹھانا پڑی، اُس میں اپنوں ہی کا ہاتھ تھا۔ تاریخ کے صفحات ان حقائق سے بھرے پڑے ہیں۔

رحمان بابا کی شہادت سے کشمیر کی تحریک آزادی کا ایک باب ختم ہو گیا، لیکن تحریک ختم نہیں ہوئی۔ کشمیر کا ہر مسلمان باشندہ رحمان بابا ہے، ہر نوجوان طارق ہے۔ اور جس قوم میں رحمان بابا، طارق، علی، سعید، ہاشم، حاجی عثمان، نیلم، مشی اور اعظم و موسیٰ جیسے سرفروش موجود ہوں، اُس قوم کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی.....

..... ختم شد.....